عربی کہانیاں



انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

عربی کہانیاں

عربی کہانیاں

ترجمے

عطا صدیقی　　فہمیدہ ریاض

محمد عمر میمن　　احتشام شامی

زینت حسام　　اجمل کمال

انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال



عربی کہانیاں

انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

ISBN 969-8379-53-3

پہلی اشاعت: ۲۰۰۲ء

زیرِ اہتمام

آج کی کتابیں

کمپوزنگ: حمزہ گبول، انتظار علی

صفحہ سازی: عامر انصاری

طباعت: علمی گرافکس، کراچی

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400

فون: 5650623 - 5213916 (92-21)

ای میل: cp@citypress.cc

انٹرنیٹ: www.citypress.cc

ترتیب

یوسف ادریس

انگریزی سے ترجمہ: زینت حسام

الغریب

کسی کو اس بات کا گمان تک نہ ہوا ہوتا کہ سنہری بالوں، سرخ رخساروں، اور شوخ، دلکش خدوخال کے حامل شرباقی کے ماضی میں ایک ایسا غیر متوقع باب پنہاں ہوگا جس میں ایک ڈاکو، سنگین مجرم، رات کے شہنشاہ کے ساتھ اس کی ملاقاتوں کی تاریخ رقم ہوگی۔ وہ میرا ثانوی اسکول کے زمانے کا دوست تھا؛ اس نے مجھے سائیکل چلانا اور کہانیاں لکھنا سکھایا تھا، اور میری پیپر بیک ناولوں کی لت کی سرپرستی کی تھی؛ اور اس کے اپنی کہانی سنانے سے پہلے میں خود اس بات پر مشکل سے یقین کر پاتا کہ اس کی زندگی کا ایک ایسا پہلو بھی تھا جس کے بارے میں میں قطعی کچھ نہ جانتا تھا۔

ہماری ملاقاتیں ہمیشہ اتفاق سے ہوتیں گو کہ ہم دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ ہر دفعہ سامنا ہونے پر جب ہم ایک دوسرے کے پتے لیتے اور ملاقات طے کرتے تو ہمیں فطری طور پر احساس ہوتا کہ ہم طے شدہ ملاقات نہ کر پائیں گے، اور یہ کہ ہم اگلی بار پھر اتفاق ہی سے ملیں گے۔ میں ایک دفعہ اس کے والد سے ملا تھا اور مجھے علم تھا کہ اس کا خاندان کس گاؤں سے تعلق رکھتا ہے؛ اور میں چند غیر ضروری تفصیلات جانتا تھا مثلاً عورتوں سے اس کی چاہ، اور اس کی شدید جھلاہٹ کہ، گو ہم بڑے ہو چکے تھے اور اسکول سے نکل چکے تھے، ہم اب تک اس کو اس کے خاندانی نام سے پکارتے تھے جیسا کہ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے۔ اس کا اصل نام عبدالرحمٰن صالح الشرباقی تھا۔ لیکن اسکول میں ہم سب عامیانہ ناموں سے تھک

''الغریب'' اس کہانی کے ایک مرکزی کردار کا نام بھی ہے اور عربی زبان میں ''اجنبی'' کا مفہوم بھی رکھتا ہے۔ اس کہانی کا انگریزی ترجمہ The Stranger کے عنوان سے یوسف ادریس کی چار طویل کہانیوں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل مجموعے *Rings of Burnished Brass* میں شامل ہے۔

چکے تھے اور اسے شرباتی کے نام سے پکارتے تھے اور وہ نام ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ چپک گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس کی بیوی نے اسے عبدالرحمٰن کے نام سے پکارا تو میں چونک گیا۔

پھر بھی مجھے قطعاً یہ گمان نہ تھا کہ ایک ایسا شخص جو مثالی عادتوں کا حامل تھا، جس کی زود حسی ایک ہی اکھڑے ہوئے لفظ سے مجروح ہو جایا کرتی تھی — اس وقت بھی جب وہ ایک بال بچوں والا آدمی ہو گیا تھا — اس کا الغریب جیسے لوگوں اور اشتہاری مجرموں کی خوں ریز دنیا سے تعلق رہا ہو گا۔ اس کا علم مجھے اتفاق سے ہوا، اتفاق ہی کہوں گا میں اسے، اور شاید اتفاق کو اس بات سے تقویت ملی کہ وہ آدھی رات کا وقت تھا اور ہم قتل اور قاتلوں کی باتیں کر رہے تھے۔ شرباتی نہ کوئی فصیح مقرر تھا اور نہ داستان گو۔ گو کہ وہی تھا جس نے مجھے کہانی لکھنا سکھایا لیکن اس کے اندر کے فنکار کی حس تحریر کے بجائے اس کی گفتگو میں اجاگر ہوتی۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی جس نے اس خاص موقعے پر اسے اپنی ذات کا وہ حصہ عیاں کرنے پر اکسایا۔ شاید، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس کا تعلق اُس خاص لمحے اور بذات خود اس کہانی سے تھا۔ لیکن غالباً اس کا تعلق اس واضح سرور سے بھی تھا جس کے ساتھ وہ اپنی ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا اور خزانوں سے پُر لوٹتا — وہ خزانے جن کی موجودگی کا احساس خود اسے پہلی بار ہو رہا تھا۔ یہ لذت، جسے میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا، اس کو بولنے پر اکساتی رہی۔ وہ پوری رات بولتا رہا — اور میں سنتا رہا، اور وقتاً فوقتاً جھرجھری لیتا رہا۔ لیکن میری توجہ آخر تک مرکوز رہی۔

۱

کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ میری زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے ہیں جب میں سوائے اس کے کچھ نہ سوچتا تھا کہ مجھے قتل کرنا ہے — کسی کو بھی، کسی وجہ سے نہیں، ماسوائے قتل کرنے کی خواہش کے؟ اپنی طب کی کتابوں میں، یا نفسیات کی جدید موشگافیوں میں میری اس خواہش کی سائنسی توجیہات تلاش کرنے کی کوشش نہ کرو؛ میں نہ بیمار تھا اور نہ ایب نارمل۔ میں ایک عام سا اسکول کا طالبعلم تھا، چودہ سال سے زیادہ کا نہ ہوں گا۔ اور میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ میری یہ خواہش بالکل فطری ہے، اور صرف مجھ تک محدود نہیں ہے۔ یقیناً کبھی کبھار ہم میں سے اکثر لوگ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہم مرد ہیں، غیر معمولی دعوے کرتے ہیں، اور خاص طور پر وہ لڑکے جو بلوغت کی دہلیز پر ہوں، ان غیر معمولی طریقوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ وہ کام ڈھونڈنے کی غرض سے گھر سے نکلتے ہیں، راتیں باہر گذارتے ہیں، اپنے باپ کی بندوقوں سے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں؛ اگر ان کے باپ ان کاموں سے منع کریں تو خود کو یا جو بھی ان کے راستے میں حائل ہو اسے ختم کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اور اس کا مفہوم واضح ہے: وہ مردوں کے

کھردرے اور خام طریقوں سے خود پر اپنی مردانگی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھ میں اور میرے ساتھیوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ میں اپنی خواہش میں کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا تھا اور مردوں کی دنیا میں کسی مرد کو قتل کر کے داخل ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اس خواہش کو بہت گہرائی میں دبا رکھا تھا، یہاں تک کہ میں خود سے بھی اس کا اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا؛ گوکہ میں اس خواہش کے وجود سے آگاہ تھا لیکن خود کو سمجھانے کوشش کرتا کہ یہ خواہش میرے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ یہ اس لیے کہ مجھے خوف تھا کہ میں ایک شخص کو قتل کرنے پر اکتفا نہ کروں گا، بلکہ اگر اس راہ پر چل پڑا تو ہمیشہ اسی پر چلتے رہنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔لیکن میں اپنے آپ کو برابر تسلی دیتا رہتا اور کہتا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

اس کے ثبوت کے لیے میں بچپن میں بلیوں کے ساتھ اپنے تجربات کو یاد کرتا۔ جب میں چھوٹا تھا تو بلیوں سے بہت ڈرتا تھا، ان کی لمبی لمبی مونچھوں، غراتے ہوئے چہروں اور بدصورت پنجوں سے، اور اس دن کی آرزو کرتا جب میں اتنا بڑا ہو جاؤں کہ بلیوں کو خوفزدہ کر سکوں، اس تمام دہشت کا بدلہ لے سکوں جو ان کی وجہ سے مجھ پر طاری رہی۔ میرے ذہن میں بڑے ہونے کا خیال بلیوں کو خوفزدہ کرنے اور ان کے خوف سے آزاد ہونے کی صلاحیت سے منسلک ہو چکا تھا۔ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے میں مستقل بلیوں کے پیچھے لگا رہتا، ان کو کونوں کھدروں میں دوڑایا کرتا، اور ان کو اذیت دے کر لذت محسوس کرتا۔ اگرچہ میں نے کتنی ہی بلیوں کا پیچھا کیا، کتنے ہی دروازے اور کھڑکیاں ان کو قید کرنے کے لیے بند کیں، لیکن میں کبھی کسی بلی کو گھیرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، سوائے ایک دفعہ کے جب میں نے اپنے پڑوسیوں کی بلی کو اپنے گھر کے ایک کمرے میں بند کر لیا۔ ہمیں اپنے پڑوسی ناپسند تھے، اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں بلی کو دہشت زدہ کر کے مزہ لینے پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اس کو ختم کر کے دم لوں گا۔

میں نے بے دردی سے بلی کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ میں اس کو ایک کوٹھری تک لانے میں کامیاب ہو گیا جہاں باہر کو کھلنے والے سارے راستے اچھی طرح بند تھے۔ پھر میں ایک پرانی کھڑکی سے اکھاڑی ہوئی لوہے کی سلاخ سے مسلح اس کے پیچھے گیا اور کوٹھری کا دروازہ بند کر لیا۔ میں نے بلی کے زمین سے چھت تک اچھلنے اور پھر واپس زمین پر کودنے کی حالت زار سے بے حد لذت اٹھائی؛ دہشت زدہ، باہر نکلنے کی راہ کھوجتی، خوف سے چلاتی، غراتی بلی۔ جب میں سلاخ ہاتھوں میں اٹھائے، وار کے لیے تیار، اس کی طرف بڑھا تو اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو کر لرزنے لگا۔

میں آہستہ آہستہ اس کے قریب ہو رہا تھا؛ اس کو مفلوج کر دینے والے خوف کی لذت کے نشے میں سرشار، اس تمام دہشت کا بدلہ لیتے ہوئے جو بچپن میں بلیوں کے ہاتھوں اٹھائی تھی، اپنے آپ سے، اپنے نئے قدوقامت سے اور بدلہ لینے کے اس شاندار موقعے سے خوش اور مست۔ پھر اچانک میرے قدم تھم

گئے۔ بلی نے شدید اور دیوانہ وار کوششوں کے بعد یہ جان لیا تھا، یا مجھے ایسا محسوس ہوا، کہ فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اب کوئی راہ باقی نہ تھی۔ مجھے آج تک اس تاریک کونے میں گھری ہوئی بلی کی وہ یاس انگیز چیخ یاد ہے۔ پھر وہ پلٹی اور پہلی دفعہ اس نے میرا سامنا کیا۔ اس نے پنجے زمین پر گاڑ لیے اور میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ تب میں نے اس کی طرف نگاہ کی اور اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ میں وہ خوف کبھی نہیں بھلا سکتا؛ اتنا خالص، اتنا گمبھیر خوف، جو میں نے اس بلی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی پتلیاں پوری طرح پھیل گئی تھیں۔ اس کے دانت باہر آ گئے تھے۔ شدید خوف اس پر غالب تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جب وہ اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہونے، میرا گلا دبوچنے، اپنے دانت اور ناخن میرے گوشت میں گاڑنے، میرا چہرہ پھاڑنے اور میری آنکھیں نکالنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ وہ ایک نگاہ کافی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں اسی مقام پر گڑ گیا؛ اس کے وحشیانہ، یاس بھرے خوف کے سامنے منجمد ہو گیا۔ پھر اچانک عین وقت پر میرے اندر اتنی طاقت آ گئی کہ میں کوٹھری سے بگٹٹ بھاگا۔ نہ دائیں دیکھا نہ بائیں، ماں کو ڈھونڈتا ہوا، کانپتا ہوا اس کی گود میں گر گیا، اور اپنا چہرہ اور اپنی آنکھیں اس کی گود میں چھپا لیں، اس سعی ناکام میں کہ اس کے اندر گم ہو جاؤں۔

شاید یہی رویہ جس نے مجھے بلی کو دہشت زدہ کرنے پر اکسایا — جب کہ میں خود کسی زمانے میں ان سے خوفزدہ رہتا تھا — کہ میں اس کی توثیق کر سکوں کہ میں مرد بن چکا ہوں اور جسمانی قوت کا حامل ہوں، مستقبل میں ظاہر ہونے والے رویوں میں فطری طور پر پروان چڑھا۔ کوٹھری میں پیش آنے والے واقعے کے بعد میں نے بلیوں کے ساتھ غیر ذمہ دارانہ راہ و رسم کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ اور اگر مجھے اس کا علم ہوتا کہ اپنی مردانگی ثابت کرنے کی کوشش میں میں اس سے کہیں زیادہ مہیب حالات کا شکار ہو جاؤں گا تو شاید میں اپنی خواہشات کو بے لگام رکھنے سے گریز کرتا۔ میں نے مخفی طور پر دل کی گہرائیوں سے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ ان خواہشات کا ان کے انجام تک پیچھا کروں گا۔

مجھے یقین ہے تم کہو گے کہ قتل کرنے کی خواہش میرے ان رجحانات کے تسلسل کی کڑی تھی جو بچپن سے ظاہر ہو چکے تھے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہ تھا۔ یہ عمل برائے عمل والی کشش نہیں تھی بلکہ مجھے وہ لوگ مسحور کرتے تھے جو رات کے اندھیرے پر حکمرانی کرتے ہیں اور جو بھی ان کے راستے میں آتا ہے اسے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ جس علاقے سے میرا تعلق ہے وہاں ان لوگوں کو ''رات کے فرزند'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس عمر میں وہ لوگ میرے لیے بے حد کشش رکھتے تھے۔ میں ان لوگوں کے گروہ میں شامل ہونے کے خواب دیکھا کرتا؛ وہ لوگ جن کے نام سے مفلوک الحالی میں مگن عام بشر کانپا کرتے تھے۔ میرے لیے

رات کے فرزند مردانگی کا آدرش تھے، ایک تصور جو میرے ذہن میں غیر معمولی عمل سے منسلک ہو گیا تھا اور میں اپنی شناخت ان سے وابستہ کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ وہ ہمارے گاؤں کے لوگوں کے ارضی سکون کو برہم کرتے تھے۔

مختصراً، میں ہیرو بننا چاہتا تھا، کیوں کہ حقیقی مرد ہونے کا مطلب میرے لیے یہی تھا۔ لہٰذا میں اپنے ہیروؤں، اپنے مثالیوں کی نقل و حرکت کا، انتہائی غیر ضروری تفصیلات تک مسلسل پیچھا کیا کرتا۔ اس آتش مزاجی اور تیزی کے ساتھ جو آج کے نوجوان نے فلمی ہیروؤں اور مقبول گلوکاروں کے لیے اٹھا رکھی ہے، میں ان سے واقفیت پیدا کرنا چاہتا تھا، یا ان میں کسی ایک سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ تصور میں ہم دونوں دوست بن جاتے اور وہ مجھے اپنا فن، اپنا پیشہ سکھاتا، بتاتا کہ قتل کیسے کیا جاتا ہے، اور میں تجربے سے ایک مرد بن کر نکلتا۔

جیسا کہ میں نے کہا، میں صرف چودہ سال کا تھا؛ دبلا پتلا، زرد دیا یا ہوا، مطیع قسم کا۔ میں کبھی کسی سے نہ جھگڑا تھا، اور ہاتھاپائی تو زندگی میں کسی سے آج تک نہ ہوئی تھی۔ میری ماں، میرا باپ اور جو کوئی بھی مجھ سے واقف تھا، کہتا کہ میں نیک طبیعت اور اچھے کردار کا لڑکا ہوں۔ انھیں کبھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اندر سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں اچانک پھٹ پڑوں گا، اور یہ کہ میں اپنے ذہن میں ایک عجیب و غریب خفیہ دنیا کے خواب سموئے ہوئے تھا — وہ دنیا جو اس بے رونق اور جامد دنیا سے جس میں میں روز جیتا تھا، بالکل مختلف تھی۔ میری دنیا میں دلیری تھی، شجاعت تھی اور داؤ اونچے تھے، اور مقابلے کا خطرہ ہر دم موجود۔ وہ تاریکی کی دنیا تھی اور صرف ہیرو، رات کا فرزند ہی اس میں اتر سکتا تھا اور زندہ رہ سکتا تھا۔

۲

میں نے ان تمام راستوں کی خاک چھانی جو مجھے ان لوگوں کے قریب لا سکتے تھے۔ میں گاؤں کے اسکول میں اپنے ہم عمر ساتھیوں سے اکتا گیا تھا؛ میں چائے خانوں اور ان گلیوں میں جہاں مرد چوری، ڈاکے یا کسی اور جرم کی خبر سننے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے، اس امید پر پھرا کرتا کہ مجھے کوئی ایسا شخص ملے گا جس نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہوا ہوگا، اور اس واقعے پر بات کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ میرا مددگار ہمیشہ سیّد خلیل نکلتا جو ایک نزدیکی جاگیر میں ٹماٹروں کی فصل کا نگہبان تھا۔ اس وقت وہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا لیکن جوانی میں وہ ایک مجرم ہوا کرتا تھا، اور کسی حد تک شہرت کا حامل مفرور۔ شاید اس کے آجروں نے اس کی ماضی کی شہرت کو مدنظر رکھا ہوگا اور اسے دو ایکڑ کی فصل کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی اہلیت گردانا ہوگا۔

میں اس کے لیے تمباکو، شکر اور چائے لے جاتا، خاص طور پر چائے، کہ وہ چائے کا رسیا تھا۔ وہ

تمام چائے کی پتی ایک ساتھ ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیتا اور پھر اس کے تین مختلف کشید تیار کرتا — پہلا شکر کے بغیر، دوسرا ہلکی شکر کے ساتھ اور تیسرا میٹھا۔ اور صرف اس آخری کشید سے مجھے چائے پینے کی اجازت تھی۔ سیّد خلیل کے ساتھ نشست میرے لیے لطف کی انتہا تھی، اور جب چائے اور تمبا کو اپنا کام دکھا چکے ہوتے، اس کی حسیات کو تیز کر دیتے اور اس کے گرد معتبری کا ہالہ کھینچ دیتے، تب وہ اپنے کارناموں کی داستان شروع کرتا — ان مشہور مجرموں کے قصے جن سے وہ واقف رہا تھا۔ ان مویشیوں کا ذکر جو انھوں نے چرائے تھے، ان دیواروں کی باتیں جن میں انھوں نے سینددھ لگائی تھی، ان گھرانوں کا تذکرہ جہاں انھوں نے ڈاکے ڈالے تھے۔ مجھے یہ بات اچھی لگتی تھی کہ اس نے کبھی خود کو ہیرو بنا کے پیش نہ کیا۔ وہ ان قصوں میں اپنے کردار کو بڑھا چڑھا کر بیان نہ کرتا۔ جس کسی کے ساتھ بھی اس نے کام کیا، اس کا کردار ہمیشہ نگراں کا ہوتا — پیچھے رہ کر، خطرے سے مطلع کرنے کا کام۔

میرا خیال ہے اسے بھی میری رفاقت میں مزہ آتا تھا۔ وہ بوڑھا اور تنہا تھا، اور دن رات اس کٹیا میں بیٹھا رہتا جو اس نے اپنے لیے ٹماٹر کے کھیت کے بالائی سرے پر بنائی تھی۔ اس کی صرف ایک آنکھ تھی۔ دوسری آنکھ کی جگہ پر وہ ایک بھدا سا، مقامی نمونے کا رومال باندھے رکھتا تھا، اس طرح سے کہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کوئی نقص چھپانے کے لیے ڈالا ہوا ہے۔ اس کو باتیں کرنے میں لطف آتا تھا، اور میں بہترین سامع تھا۔ وہ گھنٹوں باتیں کرتا، بے تکان بولتا، اور میرے تخیلات سلگ اٹھتے اور میں اس آرزو میں بھسم ہونے لگتا کہ میں بھی کچھ کر گذروں؛ کسی گروہ میں شامل ہو جاؤں اور انھیں عمل میں دیکھوں۔ لہٰذا میں اس سے پوچھتا کہ کیا وہ دورِ حاضر کے کسی اپنے جیسے شخص کو جانتا ہے جن کے کارنامے ہم چھوٹی موٹی خبروں میں سنا کرتے تھے۔ اور وہ نفرت بھرے لہجے میں جواب دیتا، یاس بھرے اشارے میں کہتا، ''یہ تو لونڈے ہیں... میں تو پرانے وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔ یہ کیا جانیں کہ کیا کر رہے ہیں۔''

مجھے اس پر یقین کرنا پڑتا کیونکہ، ان کہانیوں کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے جو میں نے اس سے سنی تھیں، یہ واضح تھا کہ وہ لوگ اور وہ وقت جن کی وہ داستانیں سنایا کرتا، ایک جلیل القدر دنیا سے تعلق رکھتے تھے — وہ دنیا جو اَب معدوم ہو چکی ہے۔ میں ہمیشہ اس بات کا افسوس کرتا کہ میں پہلے نہ پیدا ہوا، اس پر کڑھتا کہ اُس شاندار اور بھرپور زمانے کو میں نے کیوں نہ دیکھا۔ صرف ایک نام ایسا تھا جس کو سیّد جلیل نے ہاتھ کے اشارے سے مکھی کی طرح نہ اڑا دیا۔ جب میں اس کے بارے میں پوچھتا تو وہ افسردہ ہو جاتا اور کہتا، ''آہ! الغریب ابو محمد۔ وہ اصل معنوں میں مرد ہے۔ پرانے وقتوں کا صرف وہی ایک باقی بچا ہے۔'' وہ اس لیے کہ الغریب کی شہرت دور دور تک تھی؛ وہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے مشہور تھا جس نے پولیس کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے، اور پولیس اس کے پیچھے دائروں میں گھوما کرتی

تھی۔ اور چونکہ الغریب کا تعلق اس نسل سے نہ تھا جس سے سیّد خلیل واقف رہا تھا، میں نے اپنی کم سنی کے باوجود محسوس کیا کہ وہ الغریب کے مقام سے انکار نہ کر سکتا تھا، بلکہ اس کی دلیری اور جرأت کا یہ کہہ کر اعتراف کیا کرتا کہ وہ پرانے وقتوں کا ہے۔

میں نے اس سے کئی دفعہ پوچھا کہ کیا وہ الغریب سے میری ملاقات کرا سکتا ہے، اس سے درخواست کی کہ مجھے اس سے صرف ایک دفعہ ملوا دے۔ اور وہ مجھے ہر بار اس خواہش سے باز رہنے کی تلقین کرتا، یہ جتاتا کہ اس کے خیال میں میں اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا ہوں۔ ''ہمیں ایسے لوگوں سے رابطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ خراب لوگ ہیں۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ ان سے دور رہو۔''

اس کا یہ جواب سن کر میں کبھی دل برداشتہ نہ ہوتا۔ یقیناً وہ خود سے اس بات کا اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہ خودرات کے فرزندوں کی تعریف کے راگ الاپ رہا تھا اور ان کی زندگی کو عظیم الشان بنا کے پیش کر رہا تھا اور ان کے سرداروں سے ہیرو کا سلوک کر رہا تھا۔ اور جب اس کی اپنی بات آتی کہ وہ بھی کبھی ان لوگوں میں سے تھا تو وہ خوف بھری آواز میں کہتا کہ اللہ نے اس پر بڑا کرم کیا اور یہ سب بہت پہلے کا واقعہ ہے؛ اب اس نے توبہ کر لی ہے، اور وہ نمازیں بھی پڑھتا ہے، اور، شکر خدا کا، رمضان میں روزے بھی رکھتا ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی سچ نہ تھی، اور میں نے اپنی آنکھوں سے آدمیوں کو اس کی جھونپڑی میں مال چھپاتے اور پھر چند دنوں بعد لوٹ کر آتے دیکھا تھا۔ میں انھیں راز داری سے اس کی جیب میں نوٹ ڈالتے بھی دیکھ چکا تھا۔ اور میں اس کے پاس ہوتا تھا جب اس کو طلب کیا جاتا؛ اور وہ تھوڑی دیر بعد پریشان اور الجھا ہوا سا واپس آتا اور مجھ سے کھوئی کھوئی آواز میں کہتا، ''آہ! ہاں... تو ہم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے؟''

اور پھر وہ ایک کہانی شروع کرتا جو میں نے پہلے سنی ہوئی ہوتی تھی۔ میں کچھ دیر توجہ سے سنتا، اس امید پر کہ شاید یہ داستان مختلف ہوگی۔ لیکن جب اس کی تفصیات یکساں نکلتیں تو میں اسے ٹوکتا اور وہ دوسرا قصہ سنانے لگتا، اور وہ بھی میرا سنا ہوا ہوتا۔ مگر جب میں نے یہ جان لیا کہ اب اس کے پاس سنانے کے لیے کوئی نئی داستان نہیں رہی، تب بھی اس کی جھونپڑی میں جانا نہ چھوڑا (وہ اس کو ''ہوائی جہاز'' کہتا تھا اور وہاں سے اپنی ایک کمزور آنکھ سے ٹماٹروں کی پھیلی ہوئی فصل پر نظر رکھتا تھا)۔ میں نے اس کے پاس جانا اس لیے ختم نہ کیا کہ دل ہی دل میں میں اس کو الغریب سے رابطے کا وسیلہ سمجھتا تھا، اور یہی ایک وسیلہ تھا جس سے میں واقف تھا۔ میں اب تک اس امید پر بیٹھا تھا کہ ایک نہ ایک دن الغریب سے ملاقات ہوگی، حالانکہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں اور دن تیزی سے گذرتے جا رہے تھے۔ اور گو کہ میرا تجسس اور شوق بڑھتا جا رہا تھا، میری امیدیں ختم ہو چلی تھیں۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی میں الغریب سے ٹکرا جاؤں گا، اور یہ ملاقات کس طرح ہوگی میرے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

۳

دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی، اور رومیل العالمین میں تھا۔ لوگ حاجی محمد ہٹلر اور اس کے اسلام قبول کرنے کے اعلان کی باتیں کر رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا وہ ایک دن آ پہنچے گا اور انگریزوں کو ہماری سرزمین سے نکال باہر کرے گا۔ لیکن ہمارے ضلعے میں جرائم کی دنیا ان مسائل میں الجھی ہوئی تھی جن کا تعلق نہ ہٹلر سے تھا اور نہ رومیل سے۔ ایک فوجی فرمان کے ذریعے مجرموں کو صحرائے سینا کی جیل میں منتقل کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا تھا۔ وہ لوگ جنھیں کسی دشمنی کا حساب چکانا تھا بہتان تراشی کی جنگ میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہر ضلعے کے کمشنر اور ہر گاؤں کے مکھیا نے کینہ پرور لوگوں کی مدد سے اپنا اپنا کام تیار کر لیا تھا۔ ہر چند روز بعد ہتھکڑیاں پہنے اور زنجیروں میں گھسٹتے لوگوں کے ایک دستے کو سینا روانہ کیا جاتا۔ ان میں کچھ حقیقی مجرم ہوتے، کچھ محض منافع خور، اور کچھ بے گناہ جن کے سر جھوٹا الزام تھوپا گیا ہوتا۔

ہمارے ضلعے کی قسمت میں ایک ایسا کمشنر آیا تھا جو بادشاہ کے آدمیوں میں سے کسی کا رشتے دار تھا، جو اخبارات کی توجہ کا مرکز تھے، لہٰذا اس نے سوچا کہ فوجی فرمان کی وہ جس طرح چاہے توضیح کر سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس تمام کارروائی کو مناسب طریقے پر منظم کرنے کی خود کو تکلیف دیتا، اس نے تمام مشکوک لوگوں کو منتقل کرنے کے انتظامات شروع کر دیے: سینا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں۔ اس نے یہ کام بڑی عمدہ سادگی سے کرنا شروع کیا جس میں نہ ہتھکڑی کی ضرورت پڑتی اور نہ آہنی زنجیروں کی۔ اگر وہ کسی مجرم یا ملزم پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا تو بجائے جیل پہنچانے کے اسے اپنے کمرے میں بلاتا اور اس سے باتیں کرتا، چائے اور سگریٹ پیش کرتا اور اس کو پُرسکون کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ جب رات آتی تو وہ اس کو اپنے ساتھ فورڈ ٹرک میں سیر کی دعوت دیتا اور وہاں جھیل کے کنارے یا جھیل میں گرنے والی کسی تاریک نہر کے پاس ٹرک روک کر مہمان کو اترنے کی دعوت دیتا اور پھر چند گولیوں سے اس کا خاتمہ کر کے جھیل میں دھکیل دیتا۔ اور پھر لاش کنارے لگے یا نہ لگے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا، کیونکہ کسی نے کچھ نہ دیکھا ہوتا، اور نہ کسی کو یہ معلوم ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے، خاص طور پر حکومت کو جس نے اپنے فرمان میں اس بات پر زور نہیں دیا تھا کہ مجرم یا ملزم کو لازماً زندہ ہی رہنا ہے۔ یہ کسی بھی سرکاری تفتیش کے دائرے سے باہر تھا کہ ان آدمیوں کی بابت ذمے داریوں کی حد مقرر کی جائے جو پولیس کی تحویل میں ہوں۔

اس بدنام سیر سپاٹے کے واقعات خطرناک حد تک بڑھ گئے اور لوگوں کے علم میں آنے لگے۔ اس

طریقے کی بدولت سرگرم کمشنر اس قابل ہو گیا کہ جتنے مجرموں سے چاہے چھٹکارا حاصل کر لے، خواہ وہ کوئی بھی ہوں؛ بس اتنا کافی تھا کہ ان کا کوئی ریکارڈ رہا ہو۔ یہاں تک کہ اس کی خوں ریز مہمات پر اتنی باتیں ہونے لگیں کہ بدنام سے بدنام ڈاکو کے کارناموں پر بھی نہ ہوتی ہوں گی۔ لوگوں کی باتیں اس کے کانوں تک پہنچتیں تو وہ دل کھول کر قہقہے لگاتا، اتنی اونچی آواز میں کہ ضلعے کے صدر دفتر کی کھڑکیوں کے باہر اس کے بھاری قہقہے گونجا کرتے۔ غالباً اس کو بھی قانون نافذ کرنے کے بجائے قانون کی حدیں توڑنے میں زیادہ لذت ملتی تھی۔

ذاتی گفتگو کے دوران، یا جب وہ اپنے ماتحتوں سے بات کرتا، اسے بار بار یہ کہنے کا بہت شوق تھا کہ اب تک جو ہوا اس کی کوئی اہمیت نہیں، اور یہ کہ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک الغریب ابو محمد کو ٹرک میں سیر کو نہ لے جائے؛ الغریب جو تمام زیریں مصر کا نہ سہی، ہمارے ضلعے کی جرائم کی دنیا کا مشہور سردار تھا۔ کمشنر مقامی حفاظتی اداروں کی کارگزاری سے بالکل مطمئن نہ تھا اور ہر روز ان کی نااہلی پر ان کو ڈانٹتا پھٹکارتا۔ کہا جاتا تھا کہ ان موقعوں پر وہ ایسی ناشائستہ زبان استعمال کرتا جو گھٹیا لوگ بھی نہ سوچ سکتے ہوں گے۔ ایسے شخص کے لیے جس کے محل میں روابط ہوں یہ بات کافی حیرت انگیز معلوم ہوتی تھی۔

ان تمام تدابیر کے باوجود الغریب دیہی علاقوں میں آزادانہ گھومتا رہا اور اس بات نے قانون کے اصولی نفاذ کی حد سے گذر کر کمشنر کے لیے ذاتی چیلنج کی حیثیت اختیار کر لی۔ کمشنر نے اس کارروائی میں اپنی رقمیں لگانی شروع کر دیں — یا شاید وہ اس کی ذاتی رقمیں نہ تھیں۔ چھاپے کی پیش بنی پر انعامات کا اعلان ہوا، اس نے جاسوس ملازم رکھے، اور شلابی کے ساتھ ساز باز کی جو الغریب کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ یہ آخری چال آخر کار کامیاب ثابت ہوئی اور ایک دن مقامی لوگوں نے حیرت سے یہ خبر سنی کہ الغریب کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی تقدیر کا منتظر ہے، اور یہ کہ یہ سب کچھ شلابی کے ساتھ حکام کے جوڑ توڑ سے ہوا ہے جسے کچھ عرصہ پہلے گرفتار کیا گیا تھا۔

مزید تعجب اس وقت ہوا جب حکام نے مغرب کے وقت اعلان کیا کہ الغریب دن دہاڑے فرار ہو گیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں ہیں اور یہ کہ جس کسی نے بھی اس کو پناہ دی یا اس سلسلے میں کوئی معلومات چھپائیں اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

مقامی لوگ اس خبر کے اثر سے باہر نہ آ سکے اور کئی دنوں تک اس پر چہ میگوئیاں کرتے اور پولیس اور ڈاکوؤں کے اس کھیل کو تماش بینوں کی طرح دیکھتے رہے۔ لیکن یہ ایک خطرناک کھیل تھا، اس لیے وہ چوری چھپے اس کو دیکھتے اور خفیہ ملاقاتوں میں سرگوشیوں میں اس پر بحث کرتے۔ پڑوسی پڑوسی کو تنبیہ کرتا اور دوست دوست کو خبردار کرتا؛ وہ ایک دوسرے کو کمشنر کے چھوڑے ہوئے جاسوسوں اور مخبروں کی موجودگی کی

یاد دہانی کراتے جو لوگوں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے اور الغریب کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

ہم اسکول کی لڑکے ایک رات ٹولی بنائے پل کی دیوار پر بیٹھے شکار کی اس عظیم الشان مہم پر بحث کر رہے تھے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ہمارے درمیان کوئی جاسوس یا خفیہ پولیس کا آدمی نہ تھا لیکن پھر بھی ہم خوفزدہ تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کرر ہے تھے۔ اور جب ہم دنیا ومافیہا کو بھول کر اس قصے میں کھوئے ہوئے تھے تو ہم میں سے ایک نے تنبیہ کی، ''رات کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اب ہمیں اپنی زبان بند کر لینی چاہیے۔'' تب ہم غفلت کی کیفیت سے نکل آئے اور خاموش ہو گئے۔

خاموشی میں سے خوف سر اٹھانے لگا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ الغریب نے وہ علاقہ چھوڑا نہیں ہے اور کمشنر سے مقابلے کی تیاریاں تیز تر کر دی ہیں؛ وہ گرمیوں میں گیہوں کی لمبی لمبی بالیوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا رہا ہے جن کے قدآور خوشے اپنے اندر ہاتھی کو بھی چھپا سکتے ہیں۔ باتیں کرتے وقت ہمیں دونوں طرف سے خطرہ تھا: کمشنر اور اس کے مخبروں سے، اور خود الغریب کی طرف سے۔ اس بات کی کون ضمانت دے سکتا تھا کہ ہمارے منھ سے کمشنر اور اس کے مخبروں کے بارے میں یا الغریب کے بارے میں ایک لفظ نکلے، اور ہم کمشنر اور اس کے مخبروں کے عتاب کا نشانہ بن جائیں یا الغریب کو غصہ آ جائے جو کہا جاتا تھا کہ ٹانگ میں چاقو اُڑس کر رکھتا ہے۔

وہاں بیٹھ کر اس موضوع پر صرف باتیں کرنا ہی ایک قسم کی دیدہ دلیری تھی جس کا نتیجہ یقیناً والدین کی جانب سے ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ کی صورت میں نکلتا، کیونکہ جب سے انھیں معلوم ہوا تھا کہ الغریب کھیتوں میں چھپا ہوا ہے، اور یہ کہ وہ کبھی کبھار کھانے اور رقم کی تلاش میں نکلتا ہے، وہ ہر ایک کی طرح شدید دہشت کا شکار تھے۔ لیکن ان کا خوف دودھاری تلوار کی طرح تھا۔ وہ اس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ کہیں ان پر یہ الزام نہ لگ جائے کہ وہ الغریب کو پناہ دے رہے ہیں یا اس کی حفاظت کرر ہے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے مغرب کی نماز تک باہر پڑھنا چھوڑ دی تھی اور وہ مویشیوں کو ہنکا کر سورج ڈوبنے سے پہلے ہی گھر لوٹ آتے۔ گلیاں اور کھیت کھلیان مغرب کے بعد ایک ہولناک ویرانے میں تبدیل ہو جاتے جہاں ایک پتا بھی نہ کھڑکتا، سوائے ان ڈراؤنی بکتر بند گاڑیوں کے جو چھپے ہوئے بھیڑیے کی تلاش میں رات کے ویران سایوں کے گرد چکر لگاتیں۔

چوں کہ ہمارے خاموش ہوتے ہی یہ تمام خیالات طوفان کی سی تیزی سے ہمارے ذہنوں میں امنڈنے لگتے، ہم زیادہ دیر خاموش نہ رہ پاتے۔ جلد ہی کوئی نہ کوئی کچھ بول پڑتا اور دوسرے فوراً ہی شامل ہو جاتے اور ہماری کوششوں کے باوجود گفتگو وہی رخ اختیار کر لیتی۔ ایک سوال جو ہم ایک دوسرے سے پوچھتے، جو درحقیقت ہم اپنے آپ سے پوچھ رہے ہوتے تھے، یہ تھا: ''اگر الغریب، تمھیں راستے میں مل

جائے تو تم کیا کرو گے؟" خوف کی ایک سرد لہر ہمارے جسموں میں دوڑ جاتی، گو کہ شاید ہم دل ہی دل میں یہ آرزو کر رہے ہوتے کہ کاش ایسا ہو جائے۔ یہ معصوم سرگوشی فوراً ہی ہمارے اندر اٹھنے والی ہزاروں آوازوں تلے دب کے رہ جاتی؛ اور پھر بزدلی کا مدافعتی عمل سر اٹھاتا اور شجاعت کی تمام گھاتوں کو اپنے قابو میں کر لیتا اور دلیری کا خیال جلد بازی، دیوانگی، یہاں تک کہ حماقت نظر آنے لگتا۔

پھر ہمارا خوف بڑھنے لگا؛ وہی خوف جس نے ہمیں پہلے وہاں اکٹھا کیا تھا جہاں ہم سل کی طرح جمے ہوئے بیٹھے تھے، اب ہماری نشست کے برخاست ہونے کا باعث بنا۔ کچھ لڑکوں نے تعداد میں پناہ ڈھونڈی اور ایک دوسرے کے ساتھ ہو لیے؛ کوئی گڑگڑا کر دوسرے سے کہنے لگا کہ گھر کے دروازے تک اس کے ساتھ چلے۔ اور باقیوں نے اس راستے سے جانے کا فیصلہ کیا جہاں آبادی تھی، مکانات تھے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے جب میں جانے کے لیے کھڑا ہوا، تو کیا وہ کوئی پیش آگہی تھی کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے، جس کی وجہ سے میں خود کو تقریباً ہلکا محسوس کرنے لگا تھا؟

۴

میں یہ قطعی طور پر تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کوئی ایسی پیش آگہی ہوئی تھی، لیکن یہ کوئی چھٹی حس، کوئی الہام وغیرہ کی کیفیت نہ تھی بلکہ کنارہ گیری کی ایک تباہ کن سی کیفیت تھی جو مجھ پر غالب آ گئی تھی اور جس کی وجہ سے میں سوچنے لگا تھا کہ حالات وہی رہیں گے چاہے اُس سے میری ملاقات ہو یا نہ ہو۔

مجھے گھر پہنچنے کے لیے ساتھیوں کے ہمراہ نہر کے کنارے والا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ لیکن جوں ہی وہ گاؤں کی طرف مڑے، میں ان کا ساتھ چھوڑ کر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر ہو لیا جو گاؤں کے باہر سے گھوم کر جاتی تھی اور جس کے ایک طرف آبادی تھی اور دوسری طرف کھیت۔ ایک عجب بات یہ تھی کہ مجھے صرف اس وقت خوف محسوس ہوتا تھا جب میں دوسروں کے ساتھ ہوتا؛ جیسے ہی میں خود کو تنہا پاتا، خوف اچانک ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔ لیکن پھر مجھے بے چینی گھیر لیتی، گویا خوف اس مقام پر پہنچ چکا ہو جہاں میں شعوری طور پر اس پر ردعمل نہ کر سکوں۔ لیکن پھر بھی میری تمام حسیں بیدار رہتیں، اپنی ذات کے تحفظ کے لیے ایک دم تیار۔ ایک احمقانہ طریقے سے مدھم سی آواز پر بھی میرے کان کھڑے ہو جاتے، اور میرا تپ زدہ تخیل ہر سفیدی کو عبا میں، ہر سیاہی کو سائے میں اور ہر سرسراہٹ کو لہراتے ہوئے چاقو میں بدل دیتا۔

مجھے مکئی کے کھیت کے ساتھ ساتھ چند ہی گز کا فاصلہ طے کرنا تھا، اس کے بعد میں گندم کی چھوٹی بالیوں والے کھیت تک پہنچ جاتا جہاں کسی کے چھپنے کی گنجائش نہ تھی، اور وہ راستہ میرے لیے اطمینان بخش ہوتا۔ رات کے اندھیرے میں کھردری سطح اور بلیڈ کی دھار جیسے تیز کناروں والے مکئی کے پتے آپس میں

سرسراتے، چہرے کو چھوتے، ہاتھوں کو زخمی کرتے؛ لیکن میں اپنی رفتار کم نہ کرسکتا تھا، اس خوف سے کہ آنے والا لمحہ اپنے ساتھ نہ معلوم کیا افتاد لائے۔ تب میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔ پہلے مجھے لگا کہ کتا بھونک رہا ہے، لیکن نہیں وہ ایک آواز تھی: ''لڑکے!''

حکم تھا کسی انسان کا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس دفعہ سرسراتے پتوں اور جھینگروں کی مسلسل ٹرٹر کو خاموش کرتی ہوئی وہ آواز صاف سنائی دی۔

''لڑکے!''

یہ تحکمانہ اور بریدہ آواز میرے احساسات کو چیر گئی۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں کھولتا ہوا پانی انڈیل دیا گیا ہو: مجھے بے دست و پا ہونے کا جلتا ہوا احساس ہوا، کہ نہ میں کچھ سن سکتا ہوں نہ ہل سکتا ہوں اور نہ سانس لے سکتا ہوں۔ لیکن ایک خیال میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا: ''یہ واقعہ ہو گیا ہے، ہو گیا ہے، ہو گیا ہے۔''

اس میں صرف ایک لمحہ لگا، لیکن بعد میں بیٹھ کر اسے منطقی طریقے سے پرکھنے اور غور کرنے پر گھنٹوں صرف ہوئے ہوں گے، کہ میں بھاگا نہیں، گو کہ میں آسانی سے ایسا کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہوتے ہوئے گلے سے نکلنے والی چیخ کو بمشکل دبایا، سانس روک لی اور خوفزدہ جھٹکے سے اچانک پیچھے مڑا۔ اور جب میں بولا تو میری نوبالغ آواز کے مہین بھاری پن نے کم و بیش مرد کا سا درشت لہجہ اپنا لیا:

''ہاں، کیا چاہتے ہو؟''

''بیٹے، خوفزدہ مت ہو۔''

کیا یہ ایک معقول تجویز تھی؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ کسی حکم کے تعمیل میں — اگر وہ کسی مخصوص شخص کی طرف سے آئے — تم واقعتاً خود کو خوف سے آزاد پاؤ؟ اگر نہیں تو میں نے اس موقعے پر کس طرح اپنے خوف پر قابو پایا؟ میرا جسم کانپ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ دوسری کیفیات نہ تھیں، گویا خوف میرے ذہن، میرے دل سے نکل کر ٹانگوں میں چلا گیا ہو۔

میری پہلی کوشش یہ تھی کہ اپنی قوت ارادی سے خوف کے اس بے ارادہ اظہار پر قابو پا سکوں۔ لیکن میں جتنی کوشش کرتا اتنے ہی غضبناک طور پر میری کپکپاہٹ میں اضافہ ہو جاتا۔ مجھے صرف ایک بات کا علم تھا کہ مجھے اپنا خوف ہرگز اس پر ظاہر نہیں ہونے دینا ہے۔ اور غیر متوقع طور پر میرے منہ سے، بے اختیار، ایک سوال نکلا۔ اس کے پیچھے صرف یہ خیال کارفرما تھا کہ کسی طرح میرے دانت بجنا بند ہو جائیں اور میرے گھٹنے بے جان ہو کے نہ رہ جائیں؛ کسی طرح، کسی بھی قیمت پر، اگلے چند لمحے گذر جائیں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو میں اپنے حواس پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور مناسب طرزِ عمل اختیار کر سکوں گا۔

''کون ہے؟''

میں نے زوردار آواز میں پوچھا، ایسی آواز میں جو کمشنر یا الغریب خود نکالتا اگر ان کی اچانک یوں مڈبھیڑ ہوئی ہوتی۔ اور پھر تیزی سے، اس سے پیشتر کہ میرے دانت پھر بجنے لگیں، میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''کون ہو تم؟''

اور جواب آیا۔ اس وقت تک مجھے یقین نہ تھا کہ وہ آواز میری پشت سے آئی ہے، یا میرے سامنے سے، یا زمین کی تہوں سے نکلی ہے۔

''میں ایک اجنبی ہوں، غریب۔''

ایک ایسے خوفزدہ آدمی کی طرح جو اندھا دھند گولیاں چلاتا ہے یہاں تک کہ گولیاں ختم ہو جاتی ہیں، میں یکدم پھر بول پڑا۔ میں کہنے والا تھا، ''غریب، یا الغریب؟'' لیکن میں نے یہ سوال منہ سے نکلنے سے پیشتر ہی روک لیا۔ اور بولا:

''تم ہو؟ تم یہ لڑکے لڑکے کیا چیخ رہے ہو؟ سلام کیوں نہیں کرتے؟ دوست؟ تم خوش آمدید کیوں نہیں کہتے؟''

میرا اسلحہ ختم ہو چکا تھا اور میں چپ ہو گیا۔ اس آواز نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اب بہرا نہ رہا تھا۔ رات کی آوازیں مجھے سنائی دینے لگی تھیں اور میری سانس ہموار ہو گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ دُم دبا کر بھاگوں، یا مدد کے لیے پکاروں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں ایسی کوئی حرکت نہ کروں گا، اور یہ کہ اگر میں چاہوں بھی تو اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں سرک سکتا۔ مجھے لگا کہ خاموشی بے حد طویل ہو گئی ہے، اور میں نے سوچا کہ سب کچھ ختم ہوا اور جس کی آواز آئی تھی وہ جا چکا ہے۔ لیکن پھر مجھے یقین ہو گیا کہ دو مخفی آنکھیں میرا معائنہ کر رہی ہیں، اور یہ کہ میری کم عمری اور میری ذہنی کیفیت کا پتا چلا لیا گیا ہے۔ یہ میرے لیے سچائی کا لمحہ تھا؛ اور اس خیال نے مجھے کیسا مضطرب کیا جب میں وہاں ننگے پاؤں اور ننگے سر کھڑا تھا، ایک ایسے آسمان کے نیچے جس کا سرد چاند آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا اور پھیلتی ہوئی تاریکی میرا دم گھونٹے دیتی تھی۔ میں اپنے مقام پر کھڑا ہوا تھا اور وہ نظر نہ آنے والی آنکھیں گھنی جھاڑیوں کے اندر سے میرا اچھی طرح جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ دہشت نہ تھی جس نے مجھے بے جان کر دیا تھا بلکہ دہشت کے بعد آنے والی تباہی تھی، وہی کیفیت جو چوہے کو چوہے دان کے اندر مردے کی طرح ساکت رکھتی ہے یہاں تک کہ اگر چوہے دان کھل بھی جائے تو وہ وہیں دبکا پڑا رہے۔

اس تاریکی میں سے جو جھاڑیوں کے سایوں کے باعث ملائم پڑ چکی تھی، میں نے ایک قہقہہ سنا۔ وہ ایسا قہقہہ نہ تھا جس کو پرکھا جا سکے: اصل کے مقابلے میں وہ تسبیح کا صرف ایک دانہ تھا، پانی کی ایک ننھی سی

بوند تھی، تھان کی ایک دھجی تھی جو سیلز مین گاہک کو بطور نمونے کے دیتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس قہقہے نے مجھے غصہ دلا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن میں خاموش رہا۔

''تمھارا باپ کون ہے میرے چاند؟''

اس سوال نے مجھے بھڑ کی طرح کاٹ کھایا۔ لیکن میں حیران کن طور پر پُرسکون رہا۔ میرا جواب سن کر اس نے بولنا شروع کیا: ''تمھارا باپ نیک آدمی ہے...'' لیکن میں نے باقی جملہ نہ سنا۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور ان میں سے ایک دبلے پتلے جسم کی عورت نمودار ہوئی۔ اس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا، سر پر اوڑھنی تھی، اور وہ ایک بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی تھی جس کا سنہرا کنارہ چاند کی زرد روشنی میں ہلکے سے چمکا۔

۵

کچھ لوگ شاید سوچیں کہ اس لباس میں وہ کسی حقیر یا مضحک شے میں بدل گیا ہوگا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں نے اپنے جسم کا ایک ایک رواں کھڑا ہوتا ہوا محسوس کیا اور میری کھوپڑی میں سنسناہٹ دوڑ گئی جب میں نے دیکھا کہ الغریب — بدنام زمانہ قاتل جس نے صوبے بھر میں آفت ڈھا رکھی تھی — ایک سیاہ لباس میں خود کو ایک عورت کی چادر میں لپیٹے ہوئے ہے۔ شر اپنی مروجہ صورت میں بھی خوف پیدا کرتا ہے، لیکن جب وہ کسی حقیر شے کا روپ دھار لے مثلاً درختوں کے نیچے اگنے والی خودرو جڑی بوٹیوں کا، تو وہ اَور منحوس اور خوفناک ہو جاتا ہے، اَور زیادہ دہشت کو جنم دیتا ہے۔

اس نے میری جانب چند قدم اٹھائے اور میرے اندر کی آواز کہتی رہی، ''بھاگو!'' لیکن اچانک وہ بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں بیٹھ گیا لیکن سوچ سوچ کے اور کچھ زیادہ آہستگی سے۔ نہر کا کنارہ بیٹھنے کے لیے اتنی آرام دہ جگہ نہ تھی، لیکن مجھے الغریب کے ارادے کی زیادہ فکر تھی۔ جہاں تک مجھے علم تھا وہ لوگوں سے صرف اُس وقت ملتا تھا جب اسے رقم درکار ہوتی یا وہ انھیں قتل کرنے جا رہا ہوتا۔ لہٰذا میں حیران ہوا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے مجھے ابھی تک ختم نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ سوچ سکتا ہوگا کہ میرے پاس کوئی رقم ہے۔

میں کچھ کہے بغیر بیٹھ گیا۔ میں بات کرنا چاہتا تھا، لیکن فطری احتیاط نے مجھے بولنے سے باز رکھا۔ وہ احتیاط جو اس وقت آڑے آتی ہے جب ہمیں سامنے والے کی نیت کا پتا نہیں ہوتا۔ اس لمحے تک مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے صحیح طور پر دیکھا بھی نہیں، گو کہ مجھے اپنے پہلو میں اس کی موجودگی کا علم پوری شدت سے تھا۔ وہ ناقابل تسخیر معلوم ہوتا تھا، کہانیوں اور روایتوں کے جال کے اندر محفوظ جو ایک

طویل عرصے میں اس کی ذات کے اردگرد بُنا جا چکا تھا: اس کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی کہانیاں، خود اس کے تعاقب کے قصے، شکاری اور شکار، ایک دلیر سرغنہ اور اشتہاری مجرم کی متضاد تصویر۔ ان تمام کہانیوں کے باوجود، یا غالباً انھی کی وجہ سے، میں اس کو دیکھ نہ سکا۔ عورت کے لباس نے اس مسئلے کو مزید الجھا دیا تھا؛ یہ لباس اس شخص تک رسائی پانے میں جس کی تصویر میرے ذہن میں تھی، ایک حقیقی رکاوٹ بن گیا تھا۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے وہ وہاں ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس کے وجود اور آواز کے اردگرد ایک سراب کا ہالہ لپٹا ہوا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ سیاہ ہیولا جو میرے پہلو میں بیٹھا ہے، میرے تخیل کے دیو پیکر شخص کا صرف سایہ ہے، اور وہ خود گندم کی بالیوں میں چھپا بیٹھا ہے؛ یا یہ کہ لبادہ خالی ہے اور الغریب اس لباس کے اندر پارے کے ایک ذرّے بھر سے زیادہ نہیں جس کو چھونا اور پکڑنا ناممکن ہے۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا ڈبا نکالا، یا میں نے امید کی کہ اس نے یہی کیا ہوگا، کیونکہ وہ جب بھی جنبش کرتا، میں اپنی جگہ سے اچھل پڑتا، اس خوف سے کہ شاید وہ ٹانگ سے چاقو نکال کر میرے سینے میں پیوست کرنے جا رہا ہے۔

''سگریٹ پیو گے؟''

''نہیں، بہت شکریہ۔''

اُن دنوں میں چوری چھپے سگریٹ پینے لگا تھا، دن بھر میں ایک یا دو، لیکن میں نے بناوٹی نرمی سے کہا، ''میں سگریٹ نہیں پیتا۔''

اس نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے سر ہلایا۔ ''اوہ، ہاں۔ تم پیتے ہو۔ چلو بھی، ایک لے لو۔''

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ کچھ زیادہ ہی چالاک ہے، کہا، ''اگر تم اس سے خوش ہوتے ہو تو لاؤ، میں ایک سگریٹ پی لیتا ہوں۔''

اس نے مجھے سگریٹ تھمایا، دیاسلائی بھڑکائی اور میرے سامنے کی۔

میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں سگریٹ جلانے میں پہل نہ کرتا، لیکن اس کا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ اس نے دیاسلائی بجھا دی۔ پھر وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب لایا، چادر کو تھوڑا سا اوپر کیا تاکہ اپنے منہ میں دبا ہوا سگریٹ سلگا سکے، اور پھر دوسری دیاسلائی جلائی۔ ہم دونوں قریب سمٹ آئے تاکہ دیاسلائی بجھنے نہ پائے۔ جلتی ہوئی دیاسلائی نے میرے اور اس کے درمیان کی جگہ کو روشن کر دیا۔ اور خدا معاف کرے، وہاں اس کا چہرہ تھا — ایک عفریت کا چہرہ۔ اس کی بادامی آنکھیں حیرت انگیز طور پر بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ چادر میں لپٹا ہوا ایک شیطانی بھیڑ کی طرح لگ رہا تھا۔

سگریٹ میرے منھ سے نکل کر گر پڑا۔ اس دفعہ میں حقیقتاً ڈر گیا تھا۔ اور مجھے یوں لگا کہ جو خوف مجھے پہلے محسوس ہوا تھا، وہ محض بیماری سے پہلے آنے والی جمائیاں تھیں: اور جس لمحے میں نے اس کے چہرے کو دیکھا، اس وقت ہڈیوں کو منجمد کرنے والا خوف کا بخار اصل بیماری تھی۔

لیکن بعض موقعوں پر انسان کتنی حیرت انگیز اہلیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر میں فطری ردِعمل کرتا تو دہشت سے میرا سر گھوم جاتا اور میں مڑ کر تیزی سے بھاگ کھڑا ہوتا یہاں تک کہ میں گر جاتا یا وہ مجھے آلیتا۔ لیکن میں اس وقت درحقیقت خود پر قابو پانے کے خوف کے شدید احساس میں گھرا ہوا اس کے پہلو میں بیٹھا رہ گیا۔ میں نے تیز دیسی سگریٹ کے کش لیے جو اس نے مجھے دیا تھا، ور میرا سر گھوم گیا کیونکہ میں سگریٹ نوشی کا، خاص طور پر کش اندر کھینچنے کا، عادی نہ تھا۔

میں نے اس کے سوالوں کے جواب پُر یقین لہجے میں دیے؛ یا کم از کم سچی، بے باکانہ کوشش کی کہ میں پُراعتماد لگوں، اور اس کوشش میں زیادہ تر کامیاب رہا۔ میرے جوابات واضح، معقول اور تقریباً فطری نکلے۔ اس نے پوچھا، میرا گھر اس مقام سے کس طرف اور کتنی دور ہے جہاں ہم بیٹھے ہیں؛ میں کہاں گیا تھا؛ کس کے ساتھ تھا؛ میں نے اپنے ساتھیوں سے کیا باتیں کیں اور انھوں نے کیا کہا؛ اور لوگ اس کے متعلق کیا باتیں کرتے ہیں۔ ان عجیب وغریب حالات میں بھی جن میں میں گھرا ہوا تھا، میں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ یہ تمام باتیں سن کر بچوں کی طرح خوش ہو رہا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کے بارے میں لوگوں کی بعض باتیں بالکل معمولی تھیں۔ کچھ باتیں میں نے خود گھڑ لیں، بہت آسانی کے ساتھ، کہ میں اس کو خوش کرنے کی فکر میں تھا: میں نے اس کی شخصیت اس کے سامنے ایک محدب عدسے میں رکھ کر پیش کی جس کی وجہ سے اس کا قد دگنا ہو گیا اور اس کے دلیرانہ کارنامے اتنے بڑھا چڑھا کر سنائے کہ وہ کسی بلند مینار کی طرح، یا کسی وسیع وعریض میدان میں کھجور کے درخت کی طرح، ایستادہ نظر آنے لگا۔

سگریٹ کے آخری کش لیتے ہوئے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کتنی دفعہ اس سے ملاقات کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ کہ سیّد خلیل، جس کا ''ہوائی جہاز'' وہاں سے دور نہ تھا، میرا گواہ ہے۔ میں جھجکا، کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں یہ بات اس طرح نہ کہہ بیٹھوں کہ اسے غصہ آ جائے۔ اور مجھے سب سے زیادہ یہ فکر تھی کہ اس وقت کوئی جملہ میرے منھ سے ایسا نہ نکل جائے، کوئی حرکت ایسی نہ ہو جائے، جو اسے ناگوار معلوم ہو۔ مجھے لگتا تھا کہ غالباً وہ اچانک، بغیر کسی وجہ کے، غصے میں آ سکتا ہے، گویا میں مجرموں اور دیوانوں کے رویے کو ایک سا سمجھتا تھا۔ لیکن پھر یہ تمام مفروضات میرے ذہن سے نکل گئے اور میں ہر شے سے بے نیاز ہو گیا، سوائے ان چمٹیوں کے جو میرے کان سے آ چمٹیں جیسے ہی میں سگریٹ کا ٹوٹا زمین میں مسل کر بجھانے کے لیے جھکا۔

انگلیاں۔ اگر وہ انگلیاں تھیں تو یقیناً ان کے جوڑ آہنی تھے جن کے اوپر کھال منڈھی ہوئی تھی، جو وقت گذرنے کے ساتھ خشک اور سخت ہو چکی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا ہو۔ لیکن ساتھ ہی مجھے احساس تھا کہ یہ مذاق کے روپ میں ایک تنبیہ ہے۔ چادر کے پیچھے سے، جو دوبارہ اپنے مقام پر، مرغ کی کلغی کی طرح ٹک گئی تھی، ایک آواز آئی:

''تم سگریٹ کیوں پیتے ہو؟ کیا یہ غلط کام نہیں؟''

میں نے اپنی چیخ کو روکا۔ میں کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھا، اور شاید یہ سمجھتا تھا کہ آواز نہ نکالنا مردانگی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ خوف ہی تھا جس کی وجہ سے میں نے اپنا منہ بند رکھا۔ جب اس نے پوچھا، کیا میں بھی اپنے باپ کی طرح نمازیں پڑھتا ہوں، جس کی پرہیز گاری کا شہرہ ہے، اور جب اس کی انگلیوں کا دباؤ بڑھا تو میں بولا، ''نہیں۔''

اس نے اَور زور سے میرے کان کھینچے اور ایک سوال، خاموش دہکتے ہوئے انگارے کی طرح، میرے کان میں اتر گیا، ''کیوں؟''

اور میں نے کہا، ''پڑھوں گا، پڑھوں گا نمازیں۔'' اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے اور اس میں جان واپس آ رہی ہے۔ میں نے ابھی آزادی سے ایک سانس کھینچا ہی تھا کہ اپنی پشت پر ایک ہاتھ، سوجے ہوئے گوشت پر قصائی کے بغدے کی طرح، پڑتا ہوا محسوس کیا۔

''نہیں۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تم بہادر لڑکے ہو۔ تم اپنے باپ کے فخر کا باعث بنو گے۔ اگر تم ڈر جاتے تو میں تمھیں زمین میں پیاز کی طرح گاڑ دیتا۔ اٹھو!''

میں کیا کر سکتا تھا؟ کھڑا ہو گیا۔

''ادھر آؤ!''

میں آگے بڑھا۔

''سنو!''

میں نے اپنا کان، جو رات کی تاریکی میں انگارے کی طرح جل رہا تھا، آگے بڑھایا۔ الغریب ابو محمد نے تھوڑا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا، اور کہا، ''میں بھوکا ہوں، بیٹے۔''

میں قسم کھاتا ہوں کہ میرا دل اتنا ہلکا کبھی نہ محسوس ہوا ہوگا جتنا یہ الفاظ سن کر ہوا۔ یہ الفاظ جنھوں نے رات کے تمام خوف اور اندیشے بھگا دیے اور میرے روح میں اتر گئے۔ یہ الفاظ میرے اندر گونجنے لگے، اور عجب خوشگوار لہریں حرکت کرنے لگیں — محبت اور نیکی کی، اور قربانی کی ایک بھرپور آرزو کی، جس کی سب سے آسان قسم بلاشبہ ذاتی قربانی ہے۔ تقریباً سرگوشی میں میں نے کہا، ''تم کیا کھانا پسند کرو گے؟''

''کچھ بھی۔ اور اگر تم لاسکو تو میرے لیے سگریٹ، ایک ٹارچ، اور پانی کی صراحی لیتے آنا۔''

میں بھاگنے کے لیے مڑا، لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں، کیونکہ اس نے اپنی خوفناک انگلیوں سے میرے جلابیے کا کنارہ پکڑ لیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا؛ اس کی چادر اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

''مرد کی زبان دیتے ہو؟''

میں خاموش رہا اور میرا منھ برا سا بن گیا کیونکہ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری توہین کر رہا ہو۔ شاید میرے زرد، برانگیختہ چہرے پر پڑتی ہوئی چاندنی نے اسے احساس دلایا کہ میں جذبات سے بے قابو ہو رہا ہوں اور رو پڑوں گا۔ اس نے میرا دامن چھوڑ دیا۔ لیکن پھر بھی میں اسی جگہ جما رہا، خاموش، کچھ کہنے سے قاصر؛ اگرچہ میں اس سے اتنی ڈھیر ساری باتیں کہنا چاہتا تھا لیکن جھجک رہا تھا کہ کیسے کہوں، غالباً ان باتوں کو الفاظ میں ڈھال بھی نہ سکتا تھا۔ اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اس کی درخواست پر جوش اور ولولے کی جو لہر میرے اندر اٹھی تھی وہ اب ختم ہو رہی تھی، اور میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں جا کر اپنے باپ کو جگا سکتا ہوں اور رات کے محافظ، اور گاؤں کے مکھیا کو ہوشیار کر سکتا ہوں، اور ہم سب جا کر اسے پکڑ سکتے ہیں۔

میں وہیں کھڑا رہا، یہاں تک کہ وہ بولا:

''جاؤ... جاؤ اب۔''

''کیا تمھیں اس بات کا خوف نہیں ہے کہ میں کیا کر بیٹھوں؟''

ایک پرسکون اور باضبط سرگوشی میں، جو میری ہڈیوں کے گودے میں اترتی چلی گئی، اس نے حکم دیا: ''جاؤ!'' اور میں بوکھلاہٹ میں راستہ ٹٹولتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

٦

کون سوچ سکتا ہے کہ میں جان بچا کر فرار ہونے کے بعد دوبارہ اس کے پاس گیا ہوں گا؟ اور کون یقین کر سکتا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ایک پائیدار تعلق قائم ہو گیا ہوگا؟ وہ مجھ پر اتنا بھروسا کرنے لگا کہ اس نے مجھے اپنی نوجوان بیوی وَردہ کی ذمے داری سونپ دی، اور اس جیسی حسین اور نازک عورت میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔

انسان ہی ایسی مخلوق ہو سکتا ہے جو جان بوجھ کر خطرے میں کود پڑے اور اسے دلیری کا نام دے، اور جانوروں کی طرح جبلی طور پر اس سے پیچھے ہٹنے کے بجائے، اس کو عظمت سمجھے۔ ورنہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے دوبارہ کھینچ کر اس مقام پر نہ لے جا سکتی تھی جہاں میں نے الغریب کو آخری بار دیکھا تھا، وہ تمام کھانے پینے کا سامان لیے جو گھر میں میرے ہاتھ لگ سکا تھا، اور پانی کی وہ صراحی جو میرے باپ کے لیے مخصوص

تھی اور جسے ہاتھ لگانے کی ہم میں سے کوئی جرأت نہ کرتا تھا۔

یہ میری الغریب سے پہلی ملاقات کی کہانی تھی؛ اور یہ آخری ملاقات ثابت نہ ہوئی۔ کئی دنوں تک میں اس سے برابر ملتا رہا؛ اسے کھانا پانی اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں پہنچاتا رہا جو اسے مکمل طور پر چھپے رہنے کے لیے درکار تھیں۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، کیوں کہ گاؤں میں کھانا خریدا نہ جا سکتا تھا، اور گھر سے کچھ حاصل کرنے کے لیے مجھے کافی ترکیبیں سوچنی پڑتیں، اور باقی کھانا رشتے داروں کے گھروں سے حاصل کرنے کے لیے معقول توجیہات تلاش کرنا پڑتیں۔

شروع میں الغریب نے میرے ساتھ محتاط رویہ رکھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں اس کے لیے کھانا لے کر گیا ہوں اور اسے اس جگہ پایا ہو جہاں ہم نے ملاقات طے کی تھی۔ وہ جگہ ہمیشہ خالی ہوتی۔ اور میں وہاں شکوک وشبہات اور خوف کے درمیان گھرا، مضطرب کھڑا رہتا، یہاں تک کہ وہ، یہ یقین کرنے کے بعد کہ میں تنہا ہوں، کسی خفیہ جگہ سے نمودار ہو جاتا۔ میں ہمیشہ اس سے رات میں ملتا، مغرب اور عشا کے درمیان۔ میری کم عمری اور ہمارے تعلق کے غیر فطری پن کے باوجود اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ جو کچھ ہمارے درمیان ہے، اس کو راز رکھوں۔ یہ کہنا بے کار ہے کہ میں یہ راز افشا کرنے سے پہلے ہی مر جانا پسند کرتا۔ وہ دن کتنے خوشگوار تھے جب میں الغریب کے راز کا رکھوالا تھا، اور باہر کی دنیا سے اس کا تنہا واسطہ۔

مجھے تمام وقت اس بات کا احساس رہتا تھا کہ بالآخر ایک ایسے طریقے سے جو میرے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا، میں اس دنیا میں داخل ہو گیا ہوں جس کے ہمیشہ خواب دیکھتا رہا تھا۔ جب ہم ساتھ کھانا کھاتے، یا معمول سے زیادہ دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے، تو مجھے کتنی خوشی ہوتی تھی۔ زیادہ تر باتیں میں کرتا اور الغریب کو اپنی باتیں جاری رکھنے کی ہمت افزائی یا باتوں کے بہاؤ کو کسی سوال سے روکنے کا کام سونپ دیتا۔ لیکن میری زندگی کے غیر معمولی واقعات کتنے معمولی نظر آتے تھے مجھے، جب میں انھیں اس شخص کے سامنے دہراتا؛ اہم لڑائیاں اور جھگڑے کتنے غیر اہم ہو جاتے جب میں انھیں اس شخص کو سناتا جو بات بے بات قتل کرنے کے لیے مشہور تھا۔

یہ کئی ملاقاتوں اور طویل نشستوں کے بعد ہوا کہ میں نے اسے سچ مچ بھرپور طریقے سے دیکھا اور اس کے خدوخال سے بخوبی واقف ہوا۔ سب سے عجیب وغریب اس کے چہرے پر پھیلی نمایاں سیاہ گھنی مونچھیں تھیں جن میں چند ایک سفید بال نمودار ہو چلے تھے۔ اس کی ناک پتلی اور ستواں تھی، اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی، جن کے پپوٹے سرخ تھے اور پلکیں کچھ جھڑ چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ عجیب تھے؛ سخت اور کھردرے، اور اُس وقت جو میرے ہاتھ تھے ان سے بھی چھوٹے، اور چھوٹی چھوٹی انگلیاں۔ اور اس کی

چپلیں اتنی چھوٹی تھیں گویا کسی چھوٹے لڑکے یا لڑکی کی ہوں، اور مجھے یاد ہے کہ میں نے اس پر غور کیا تھا کہ اس کا قد مجھ سے زیادہ نہ تھا؛ غالباً کم ہی تھا۔ جب وہ ہنستا، اس کی عادت تھی کہ قہقہے کے آخر میں ایک کھنکھار شامل کر لیتا؛ شاید وہ اس طرح اپنے قہقہے میں درشتی پیدا کرنا چاہتا تھا۔

کئی راتوں کے بعد میرا اور اس کا تعلق اس مقام پر پہنچ گیا جہاں میں نے محسوس کیا کہ میں اب اس سے ایک ایسا سوال کر سکتا ہوں جو بقول اس کے کوئی ''بچہ''، میرے جیسا، یا کوئی دیوانہ ہی پوچھ سکتا ہے: اس نے ایک عام، خدا کا خوف رکھنے والے بندے کے بجائے ایک بدنام قاتل بننا کیوں منتخب کیا؟ وہ ہنسا، کھنکھارا، اور بولا، ''یہ کس قسم کا سوال ہوا؟ کوئی اور سوال کرو۔''

لیکن میں ایک شرارتی طریقے سے، گویا اپنے باپ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہوں، اس پر بضد رہا کہ وہ میرے اس سوال کا جواب دے۔ وہ سنجیدہ ہو گیا، جیسے دور کہیں گم ہو گیا ہو، اتنی دیر تک کے لیے کہ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ وہ میرے سوال کا جواب دینے کی کوشش کے بجائے کسی آواز کے رخ کو متعین کرنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ پھر اس نے کہا، ''سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہر بار قتل کرو یا خود قتل ہو جاؤ والا مسئلہ رہتا ہے۔''

مجھے اسی وقت یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان گمبھیر الفاظ کے ساتھ ہی اس نے تاریکی کی دنیا کے راز مجھ پر آشکار کرنے شروع کر دیے ہیں۔ جوش کے مارے میرے سانس رکنے لگی۔ میں نے پوچھا:

''قتل کرو یا خود قتل ہو جاؤ؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں قتل نہ کرتا تو وہ شخص مجھے قتل کر دیتا۔ لہٰذا میں نے اسے قتل کر دیا۔''

''اور ہمیشہ اسی طرح ہوا؟''

''ہمیشہ۔''

''پہلی دفعہ بھی؟''

وہ خاموش رہا اور دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے کہا، ''نہیں۔ پہلی دفعہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں کسی کے لیے کھیت میں کام کرتا تھا۔ اس نے میرے پیسے دبا لیے۔ مین تین دفعہ اس سے اپنی اجرت لینے گیا لیکن اس نے مجھے پیسے نہ دیے۔ لوگوں نے مجھ سے کہا، حکام کو اطلاع دو۔ میں نے ایسا ہی کیا؛ اور انھوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا اور پیٹا! جب میں اندر تھا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے جان سے مار ڈالوں گا؛ اور جس دن میں باہر آیا، میں نے اپنی واحد بھینس بیچ کر ایک پستول خرید لیا اور اس کے گھر کے سامنے اسے گولی مار دی۔ مجھ سے پوچھ گچھ ہوئی لیکن کوئی کچھ ثابت نہ کر سکا۔ لہٰذا اس کے خاندان نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے کسی کو مجھے قتل کرنے پر مامور کر دیا۔ کیا میں اس انتظار میں بیٹھا رہتا کہ وہ کب مجھے قتل

کرے؟ میں نے اسے قتل کر دیا۔ اور بس۔ تب سے میں یہی کر رہا ہوں۔''

''لیکن... میرا مطلب ہے... وہ آدمی... جب تم نے اسے قتل کیا، کیا تم غصے میں نہیں تھے؟''

''ہاں میں غصے میں تھا۔ میں ایک ماہ سے بغیر کچھ کھائے پیے بیٹھا تھا۔ میں بیمار پڑ گیا تھا اور جس چیز نے مجھے صحت یاب کیا وہ یہ خبر تھی کہ اس کے گھر والوں نے مجھے قتل کرنے کے لیے کسی کو لگا دیا ہے۔''

وہ اچانک خاموش ہو گیا، اور میں مضطرب ہونے لگا۔ پھر وہ میری طرف مڑا اور تیزی سے بولا:

''تم یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''بات یہ ہے کہ میں کسی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنسنے لگا، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

''کسی کو قتل کرنا ہے؟ مجھے بتاؤ، میں کر دوں گا اسے قتل، تمھارے لیے۔''

''کوئی مخصوص شخص نہیں، کوئی بھی ہو۔''

''کوئی بھی؟ کیا مطلب ہے تمھارا، کوئی بھی ہو؟''

''کوئی بھی۔''

اسے یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؛ میری خفیہ آرزو کی تفصیل اور میرے لیے اس آرزو کی کشش، اس کی طاقت۔ کس طرح اس خواہش نے سیّد خلیل کے چکر لگوائے، اور کس طرح میں الغریب سے ملنے کا مدت سے آرزومند تھا؛ اور کسی کو آج تک یہ بتانے کی ہمت نہ کر سکا تھا — صرف اسے بتا رہا ہوں۔ الغریب نے مجھے آنکھوں کے کونوں سے دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''یقیناً، ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی کہ تم سے اس موضوع پر بات کرتا؟''

''تم کیوں مجھ سے بات کر رہے ہو؟''

''تاکہ تم مجھے قتل کرنا سکھا دو۔''

دوبارہ اس پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ لگتا تھا ہنستے ہنستے اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ اس نے میری پیٹھ پر دھپ سے ہاتھ مارا، اور کہا:

''کیا تم نہیں جانتے اس طرح کی بات کرنا غلط ہے؟ تمھیں قتل کرنا سکھاؤں؟ کیا تمھارے خیال میں یہ تاش کا کھیل سیکھنے کی طرح ہے موسیو؟''

مجھے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہوئی، خاص طور پر اس کے ''موسیو'' کہنے پر؛ وہ لفظ جو اس

نے زور ڈالتے ہوئے چڑ کر ادا کیا تھا، اس شخص نے جو میرا خیال تھا کہ اگر کبھی مجھے یہ بات اس سے کہنے کا موقع ملا تو میرا مذاق نہیں اڑائے گا— اور کہاں وہ میرے واقف کاروں یا میری اسکول کے ساتھیوں کی طرح میری ہنسی اڑا رہا تھا۔ میں نے اس کو قائل کرنے کی کچھ زیادہ کوشش نہ کی، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے مذاق سمجھ کر ٹال دے۔ لہٰذا میں نے اپنا منہ بند کر لیا۔

ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر میں نے اپنے کندھوں پر اس کا شفقت بھرا ہاتھ محسوس کیا، گویا وہ پھر دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہو۔

''اگر تم کسی کو قتل کرنا چاہتے ہو ہم انتظام کر لیں گے۔ یہ آسان سی بات ہے۔''

امید سیلاب کی طرح میری طرف واپس امنڈ آئی۔

''وعدہ؟''

''ایک شرط پر۔ اگر میں تم سے ایک کام کرنے کو کہوں تو کرو گے؟''

''جو تم کہو۔''

۷

اس وقت تک میں نے الغریب کو ہم سب جیسا انسان نہ سمجھا تھا؛ ایسا انسان جو کسی خاندان کا حصہ ہو، جس کی ماں ہو، باپ ہو، بیوی ہو، یا بیویاں ہوں۔ لیکن اس نے مجھے مہلت نہیں دی کہ اپنی حیرت کا اظہار کر پاؤں، بلکہ تیزی سے، بغیر رکے، مشن کی تفصیلات سمجھانے لگا: مجھے پانچ پاؤنڈ کا نوٹ اس کی پہلی بیوی کو پہنچانا تھا، اور دوسری بیوی کو ملاقات کے لیے اس کے پاس لے کر آنا تھا۔

پہلی بیوی ہمارے گاؤں کے قریب ہی ایک دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔ وہ ایک بوڑھی چڑیا کی طرح خاکی، اور گل فتنہ کے درخت کی ٹہنی کی طرح سوکھی ہوئی تھی۔ اس کے کم از کم دس بچے تھے جو سب کے سب اس کی طرح خاکی اور خشک تھے۔ اس نے جرح کر کر کے، الغریب کے بارے میں ہر طرح کی تفصیلات پوچھ پوچھ کر، مجھے پاگل کر دیا۔ بلاشبہ اسے شکوک و شبہات تھے۔ جب بالآخر قصہ تمام ہوا اور اس نے مجھے جانے کی اجازت دی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

اس کے بعد مجھے وردہ کے پاس جانا تھا: اس کی نئی بیوی، غیر معمولی نرم خوئی، حسن اور نسوانیت کی حامل۔ میں کبھی اُس جاگیر پر نہ گیا تھا جس کا نام الغریب نے مجھے وردہ کا پتا سمجھاتے وقت بتایا، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ جگہ ایک پمپنگ اسٹیشن کے پرے واقع تھی جہاں آب رسانی کی بڑی نہر کے پانی کی سطح کو جھیل کی سطح تک لایا گیا تھا۔ میں نے وہاں سہ پہر کے بعد جانے کا فیصلہ کیا تا کہ وردہ کو رات کی تاریکی

میں اپنے ساتھ لاسکوں۔ میں گھبراہٹ اور خوف کا شکار تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہر راہ گیر مجھے پہچان رہا ہوگا اور اس ''نشانی'' کو بھی جو الغریب نے مجھے دی تھی تاکہ وردہ کو یقین ہو سکے کہ مجھے اس نے بھیجا ہے۔ اور کیا نشانی تھی وہ بھی! بھنویں بنانے والی ایک سیاہ پنسل جو وردہ نے منگائی تھی۔ میرے لیے یہی قبول کرنا مشکل تھا کہ الغریب اس قسم کی فضول چیز کا تذکرہ کرسکتا ہے؛ کہاں یہ کہ اسے یاد رہے کہ یہ وہ چیز تھی جس کی وردہ نے فرمائش کی تھی!

جب میں باغ کے احاطے میں پہنچا تو وہاں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی نہ تھا۔ میرا استقبال مریل، فاقہ زدہ، ادھ موئے کتوں کی ایک ٹولی نے خوفناک طریقے سے بھونک کر کیا۔ کتے میرے پیچھے لگ گئے، اور اگر وہ دہقانی عورت جو مٹی میں سنے کپڑے پہنے ہوئے تھی، وقت پر نمودار ہو کر کتوں کو بھگا نہ دیتی تو میں مڑ کر بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اسی عورت نے مجھے وردہ کے دروازے تک پہنچایا۔

میری آمد کی اس نے خود ہی توجیہہ پیش کی۔ ''تم اس کے رشتے داروں میں سے ہو گے جو اسٹیشن میں رہتے ہیں۔'' لوگ صوبے کے دارالحکومت کو یہی کہہ پکارتے تھے، کیوں کہ صرف وہیں ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس نے وردہ کا دروازہ بھی خود ہی کھٹکھٹایا، اور اس کو آواز دے کر کہا کہ مہمان آئے ہیں۔ اندر سے ایک آواز نے اسے جواب دیا۔ یہ ایک مسرت بھری، مدھر آواز تھی، لیکن یہ ایک شہری آواز تھی جس کی میٹھی شائستگی دیہی علاقے کی اس دوردراز ویران جگہ سے قطعاً مطابقت نہ رکھتی تھی۔

دروازہ کھلا اور لمحہ بھر کے لیے میں نے ایک حسین ترین چہرے کا جلوہ دیکھا۔ ایسا حسن میں نے زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ جلد اتنی صاف شفاف تھی کہ اس کے پار دیکھا جا سکتا تھا، اور اس کے خدوخال اتنے درست تھے کہ وہ ترکی مٹھائیوں کے ڈبوں پر بنی ہوئی عورتوں کی طرح نظر آ رہی تھی۔ یہ واضح تھا کہ وہ ابھی نہا کر نکلی ہے اور اس نے ابھی اپنے گیلے بالوں کی صرف ایک حصے پر کنگھی کی ہے۔ اس سے پیشتر کہ وہ غیرارادی طور پر دروازے کے پیچھے سمٹ جائے، میں نے اسے ایک نظر دیکھ لیا۔ پھر وہ ایک جلابیے میں ملبوس نمودار ہوئی۔ اس کے بال ڈھکے ہوئے تھے، صرف چہرہ کھلا تھا۔ اور اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھ سکا کیونکہ شرم سے میرا سر جھک کر سینے سے آلگا تھا، اور میں نے اپنی نظریں زمین پر گاڑے رکھیں، اور جب وردہ کی مسرت بھری، نرم، مترنم آواز آئی تو اپنے کانوں کو کچھ نہ سننے کا حکم سنا دیا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور اندر بلایا، گوکہ اسے اب تک معلوم نہ تھا کہ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں۔

شرم سے میری حالت غیر ہو رہی تھی اور میری زبان گنگ ہوگئی تھی۔ میں نے بمشکل مختصراً مدعا بیان کیا۔ میرے کان سرخ ہو کر جلنے لگے جب میں نے ''نشانی'' کا تذکرہ کیا۔ لیکن یہ بتانے پر بھی اس کے برتاؤ اور اس کی آواز میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ مجھے اسی طرح خوش آمدید کہتی رہی اور بیٹھنے کی دعوت دیتی

رہی۔ جب میں جھجکا تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ملائم ہاتھ میں لے لیا جو غسل کی وجہ سے اب تک نم تھا، اور مجھے اندر کھینچ لے گئی۔ ''اندر آ جاؤ! اس کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ آؤ، اندر آ جاؤ۔ آؤ نا...''

اس نے اس وقت تک میرا ہاتھ نہ چھوڑا جب تک مجھے اندر مہمان خانے میں نہ لے گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے نفیس غالیچہ نکال کر بچھایا اور دو آرام تکیے اس پر رکھے؛ ان میں ایک بیٹھنے کے لیے تھا، اور وہ اس پر مصر تھی کہ میں دوسرا پشت پر سہارے کے لیے رکھوں۔

میں نے ابھی سانس بھی نہ لیا تھا کہ وہ چائے کا سامان لے آئی اور چائے بنانے لگی۔ جب اس نے مجھے چائے کا فنجان تھمایا تو اس کے ملائم ہاتھ کی سفید رنگت آتشیں ہو گئی۔ پھر اس نے پوچھا، چائے کیسی ہے، اور کہا کہ اس نے جان کر ہلکی رکھی ہے کہ مجھ جیسے نرم خو شخص کے لیے مناسب ہو۔

چائے کے چند گھونٹ لینے پر میرے حواس بحال ہونا شروع ہوے۔ اس وقت تک وہ اپنی مہمان نوازی میں، مجھے آرام سے بٹھانے میں، اتنی مصروف رہی کہ مجھے موقع ہی نہ ملا کہ میں کھل کر بات کر سکوں، کہ میں کیوں آیا ہوں اور اس کے شوہر سے میرا کیا تعلق ہے۔ جتنی دیر میں وہاں رہا اتنی ہی مجھ پر اس کی توجہ بڑھتی گئی۔ اس افراتفری میں میں پریشان ہوتا رہا کہ فنجان کہاں اور کیسے رکھوں۔ اس سے پیشتر کہ میں فنجان رکھتا، وہ میرے بالکل قریب آ گئی۔ ''تم کیوں اتنا شرما رہے ہو، میری جان؟ کیا تم یہاں آرام سے نہیں ہو؟ کیا ہم تمھارے لیے مناسب نہیں ہیں؟ شرماؤ نہیں، چھوٹے بھیا! پلیز شرماؤ نہیں۔''

پھر اس نے مجھے آہستگی سے ہلانا شروع کیا اور مجھے اپنے سے قریب کر لیا۔

شاید میں اپنے حواس پر قابو پا لیتا اگر اس کی طرف نہ دیکھتا۔ وہ مجھ سے کسی اسکول کے لڑکے کا سا سلوک کر رہی تھی، گو کہ وہ خود مجھ سے چند ہی سال بڑی رہی ہو گی۔ لیکن عمر کا فرق بے معنی تھا؛ اصل بات یہ تھی کہ وہ عورت تھی اور میں ایک پھٹی آواز والا نوبالغ لڑکا جس کا کنٹھ نکلا پڑ رہا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ کم عمر تھی بلکہ ناقابل برداشت حد تک خوبصورت بھی؛ اجلی شفاف رنگت، کسا ہوا ریشمی لباس جس میں سے اس کا سینہ، پیٹ ا ررانیں جیسے باہر نکل آنے کو بے تاب تھیں؛ اور اگر اس کا جسم اتنی نسوانیت کا حامل نہ بھی ہوتا تو اس کی حسین آنکھوں کی سیاہ گہرائیاں ہی شدید اور بے قابو کر دینے والی خواہشوں کو جگانے کے لیے کافی تھیں۔ ان تمام باتوں کا اس کی بے باکی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے پیار سے سہلایا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں؛ اور جب بھی میں نظریں جھکاتا، وہ اصرار کرتی کہ میں چہرہ اوپر کروں اور اس کی طرف دیکھوں۔ اس نے مجھے سگریٹ، تمباکو، جو کچھ چاہیے تھا، پیش کیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی، اور کہتی رہی، ''تمھارے بال سنہری اور خوبصورت ہیں، بالکل فرنگیوں کی طرح، ماشاءاللہ میرے بھیا۔''

جب وہ مجھے ''بھیا'' کہتی میں کانپ جاتا؛ وہ جن جذبات کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ بہن کے جذبات سے مختلف تھے۔

تمام وقت میں اس آگاہی کے ہاتھوں مضطرب رہا کہ یہ حرکتیں کرنے کے باوجود وہ نامور الغریب کی بیوی ہے جو اس وقت اکڑوں بیٹھا، اپنی بائیں ٹانگ میں چاقو اڑسے ہوئے ہماری واپسی کا منتظر ہوگا۔ جب اس کی عشوہ طرازیاں حد سے بڑھ چلیں تو میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ اور وہ البیلے پن سے میرے کندھے ہلانے لگی۔ ''یوں نہ کرو۔ تمھیں پتا ہے یہ سب کیا ہوتا ہے۔ تمھارے بال اتنے خوبصورت ہیں۔ تمھارے پیچھے تو کتنی لڑکیاں پڑی ہوں گی۔ تم بہت پیارے ہو! رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ نہیں ٹھہرو گے؟ میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔''

میرے اندر ایک جھنجھلاہٹ سر اٹھانے لگی، اس بات پر طیش آنے لگا کہ جس شخص کو کوئی خدمت سونپی گئی ہو وہ خود ہی ان خدمات کا نشانہ بن بیٹھے۔ میری آمد کا مقصد اس کے پرزور خیر مقدم، صاحب سلامت، ذاتی سوالات، ہمکناریوں اور اس کے لمس اور بظاہر پاکیزہ جذبات کی بوچھار میں گم ہو چکا تھا، اور میرا سر گھومنے لگا تھا۔

وقتاً فوقتاً میں اچانک اٹھ کھڑا ہوتا جیسے بھاگنے والا ہوں، لیکن فوراً ہی اس کے بازو مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتے، اور وہ مجھے زبردستی بٹھا لیتی۔ وہ میرے بالوں کو چومتی، جس سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ جاتی، اور ہنس کر پوچھتی، ''اتنی جلدی کیا ہے جانے کی؟'' کسی کھلونے کی طرح جس کا اپنا کوئی ذہن نہ ہو، وہ مجھے اپنی سیمابی انگلیوں سے چھوتی رہی — میرے چہرے کو، میری ٹھوڑی پر پھوٹتی ہوئی روئیدگی کو، میری نکلتی ہوئی مونچھوں کو؛ اور میں غصے میں کھولتا، بیٹھا رہا۔ یہ کوشش کرتا رہا کہ الغریب کا تصور میرے اور اس عورت کے درمیان حائل رہے جس کے انداز شہری ہیں، اور جس کا شرم و حیا سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ وہ اس طرح کی حرکتیں کر رہی تھی گویا اس سے پہلے زندگی میں کسی مرد کے پاس نہ گئی ہو۔ اور میں حیران تھا کہ الغریب جیسا شخص اس کے ساتھ کیا کر رہا ہے، کیونکہ یہ واضح تھا کہ اسے نہ الغریب کا کوئی خیال ہے اور نہ خوف۔

شاید یہ ناگواری اور بیزاری کا امتزاج تھا اور ان تمام حالات کی تعجب خیزی کہ اچانک مجھے وردہ کے لیے شدید نفرت محسوس ہونے لگی، باوجود اس کے کہ وہ غیر معمولی حسن اور دلفریبی کی حامل تھی۔ الغریب بہت دور تھا اور وہ مرد جو اس کے پاس آ سکتے تھے انھیں اپنی جان کا خطرہ تھا، اور وہ زبردستی مجرد زندگی گذارنے پر مجبور تھی۔ اور قسمت نے مجھے اس کی راہ میں لا کھڑا کیا تھا — اس کے لیے آخری راستہ۔ اس کا کیا خیال تھا؟ کون تھی وہ؟ طوائف؟ اور مجھے کیا سمجھ رہی تھی؟

اور پھر نا گہانی تغیر کے امنڈتے ہوئے سیلاب سے میں نے اپنے آپ کو کھینچ کر الگ کیا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اور بغیر کسی گھبراہٹ یا شرم کے، اس کو لفظ بہ لفظ الغریب کا پیغام سنایا۔ وہ میرے اس تغیر پر ہکا بکا رہ گئی، اور اس کی حیرت بھری آنکھیں ایک غیر یقینی کیفیت میں ڈوب گئیں۔ لیکن یہ صرف لمحہ بھر کے لیے ہوا اور پھر ان میں دوبارہ ایک قسم کی چمک آ گئی۔ یہ بات سمجھنے میں خاص ذہانت کی ضرورت نہ تھی کہ اس نے میرے ردِعمل اور میری واضح ناپسندیدگی کو اس معنی میں لیا ہے کہ اس کا نسوانی حسن اور دلکشی مجھ پر ناکام ہوگئی ہے۔ اور یہ کہ کامیابی کے لیے اسے اپنے ہتھیار مزید تیز کرنے ہوں گے۔ اور اس دفعہ اس کی لگاوٹیں اور ہم کناریاں بے حیائی میں بہت آگے نکل گئیں۔ گو کہ وہ ہر دفعہ ایک پارسا جملہ کہتی، ''خدا تمھاری حفاظت کرے، رسول پاک تمھاری نگرانی کرے۔'' میری کراہت عیاں ہوگئی اور اب اس کے شرمندہ ہونے کی باری تھی۔ آخر کار اس نے مجھ سے پوچھا:

''کیا میں تمھیں پر کشش نہیں لگتی؟''

اور اس لمحے میں خود کو تقریباً چلاتے ہوئے پایا:

''تم دونوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ مجھے الغریب نے، تمھارے شوہر نے بھیجا ہے۔ تم میرے ساتھ آ رہی ہو یا نہیں؟''

اس نے میری آنکھوں میں پڑھ لیا کہ اب واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن وہ فوراً پسپا نہ ہوئی، بولتی رہی، گویا میرے ردِعمل کی شدّت کو کم کرنا چاہتی ہو، اور ہمارے درمیان کی خلیج کو پاٹنا چاہتی ہو۔ آخر اس نے کہا کہ مجھے واپس جانا ہوگا اور الغریب کو بتانا ہوگا کہ وہ نہیں آ سکتی۔ جب میں نے پوچھا کیوں، تو اس نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا بلکہ گڑگڑا کر کہا کہ میں الغریب کو اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں بلکہ وہی بتاؤں جو وردہ نے کہا ہے۔ ایک وقفے کے بعد اس نے کہا، ''اگر وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو اس کو یہاں آنا ہوگا۔'' اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو ہم دونوں کو احساس ہوا کہ یہ پاگل پن ہے اور الغریب کا وہاں آنا خطرے سے خالی نہیں۔

جب میں نے دیکھا کہ مزید رکنے سے کوئی فائدہ نہیں تو اجازت چاہی لیکن اس نے مجھے روکے رکھا اور کاغذ میں لپٹی مٹھائیوں سے میری جیبیں بھر دیں۔ آدھے راستے میں میں نے مٹھائی کھانے کی کوشش کی لیکن وہ میرے حلق میں اٹک گئی اور میں نے پوری قوت سے لفافہ نہر میں پھینک دیا۔ اور سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ الغریب کا سامنا کیسے کروں گا۔

۸

ہماری ملاقات افسردہ کرنے والی تھی۔ معلوم نہیں کیوں، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ الغریب نے جو کام مجھے سونپا تھا میں اسے پورا کرنے میں ناکام رہا ہوں؛ اور یہ کہ میرے اور اس کے سادہ اور واضح تعلق میں پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ میرے لیے وہ ایک معصوم ہیرو تھا جس کے اس عام زندگی سے جکڑنے والے کوئی رشتے ناتے نہ تھے جو ہم گذارتے ہیں۔ اور پھر مجھے غیر متوقع طور پر معلوم ہوا کہ اس کی ایک بیوی ہے، اور ایک اَور بیوی وردہ جیسی بھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس پر شرمندگی تھی؛ گویا یہ میرا فرض تھا کہ میں یہ جاننے سے باز رہوں؛ اور میں نے اسے ایک کمزور لمحے میں دیکھ لیا تھا، ایک ایسی حالت میں جہاں اس کی عزت مشکوک ہو گئی تھی۔

جب اس نے مجھے دیکھا تو صرف اتنا کہا، ''آہ! وہ نہیں آئی؟'' اور پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ مجھے جھوٹ بولنا ہوگا، اور میں وردہ کی طرف سے بہانے تراشنے لگا۔ لیکن اس نے صرف سر ہلایا اور کہا، ''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ کسی نے تمھیں وہاں جاتے ہوئے دیکھا تو نہیں؟''

اس کے رنجور لہجے سے میں بتا سکتا تھا کہ وہ موضوع بدلنا چاہتا ہے۔ مجھے جھنجھلاٹ سی ہوئی کہ نہ اس نے مجھ پر غصہ کیا، نہ میرا گلا دبوچا، اور نہ ہی فوراً اس جاگیر کی طرف روانہ ہوا جہاں وردہ رہتی تھی تاکہ اس کو بستر سے کھینچ کر لا سکے۔ مگر جب میں نے، اس تمام واقعے پر چھپی ہوئی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے، یہ موضوع دوبارہ چھیڑنے کی کوشش کی تو وہ ناراض نہیں ہوا اور وردہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ کیسی ہے؟ ٹھیک تو ہے وہ؟ جب میں وہاں پہنچا تو وہ کیا کر رہی تھی؟ گویا وہ کوشش کر کے عام خاوندوں کی طرح پیش آنا چاہتا ہو جو وقتی طور پر اپنی بیویوں سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ہر سوال پر میری بغلوں میں ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلتا تھا، اور میں سوچنے لگتا کہیں اسے علم تو نہیں ہو گیا کہ میرے جواب پوری کہانی نہیں کہہ رہے؛ اور میں سانس روک لیتا، یہاں تک کہ وہ سر ہلاتا اور اگلا سوال کرتا۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ کیسے اس نے اچانک سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی عمر کے پچاس برسوں کو عیاں کرتے ہوئے کھچڑی بال، اس کی مخصوص سکڑتی ہوئی آنکھیں جو تاریکی میں اس طرح چھپی ہوئی تھیں کہ اس کی ناک کے دونوں طرف صرف تاریک حلقے نظر آ رہے تھے۔ میں اس کی خاموشی میں ڈوب گیا، اور اضطراب کے ساتھ ان آنکھوں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جن پر رات کی تاریکی کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے کہا، ''سنو موسیو!'' شدید دہشت نے میری آواز بند کر دی اور اس سے یہ تک نہ کہہ سکا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔

چاند دور سے ہم پر جھانک رہا تھا، تاریکی میں دبکے ہوئے پیڑوں اور ہمارے داہنی طرف قطار میں

کھڑے یوکلپٹس کے عظیم الشان درختوں کے اوپر، دودھ کی ایک ٹوٹی ہوئی صراحی کی طرح جو کسی بزرگ کے مزار پر پڑی دعاؤں کی طلب گار ہو۔ اس کی مدھم روشنی سرخی مائل تھی، ایک ایسی لالٹین کی طرح جس میں ہوا کا گذر نہ ہو؛ اور اس روشنی میں الغریب کا سر ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم کی مناسبت سے کہیں زیادہ بڑا، بوجھل اور ساکت نظروں سے گھورتا ہوا ایک بے جان سر۔ پھر اس کے ہونٹوں سے بلاجنبش ایک آواز نکلی، ''تم مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے ہو موسیو؟''

میں ڈھے گیا، دنیا کی ٹکر سے لڑھک کر، منھ کھولے مہیب خلا کے شگاف میں گرتا چلا گیا۔ میرا دل تھم گیا، ذہن مفلوج ہو گیا، میرے ہاتھ پیر سرد پڑ گئے اور میری جلد سے خوف پسینے کی ننھی ننھی بوندیں بن کر خارج ہونے لگا۔ خلا میں بے تحاشا ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے میں نے حماقت آمیز لہجے میں کہا، ''کیوں؟''

دوبارہ اس کی آواز مجھ تک پہنچی، تاریکی کی آواز، اگر تاریکی بول سکتی ہے۔ ''تم مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے ہو موسیو؟''

میں نے تھوک نگلا اور تھوک نکلنے کی آواز کو گھونٹنے کی کوشش کی؛ اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا اس نے کہا، ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

یقیناً اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں اس طرح اچھل کھڑا ہوا گویا مجھے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اور اس نے سوال کو اس طرح بنا کر دوبارہ پوچھا، ''یا اس نے تمھارے ساتھ کوئی شرارت تو نہیں کی؟''

اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا، اور اگر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تو ان دونوں سے تعلق ہمیشہ کے لیے ختم کر لوں گا۔ میرا ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں؛ میں نے بچکانہ خواہش کے نتیجے میں خود کو ان سے منتھی کر لیا ہے، اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ مول لیا ہے۔ لیکن پھر غیر متوقع طور پر ایک غیر معمولی چیز واقع ہوئی اور میری جان میں جان آئی۔ الغریب نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور رات کے سائے چکنا چور ہو کر بکھر گئے اور میرے اندیشے روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگے۔ اس کا مضبوط ہاتھ آگے بڑھا اور میرے کندھے پر دھب سے پڑا اور وہ روشنی کی آواز میں بولا، اگر روشنی کی آواز ہوتی ہے؛ اس کے خدوخال پگھل کر پرتاثر ہو گئے اور ان میں زندگی امنڈ آئی۔

''تم ڈر گئے؟ کیوں، موسیو؟ تم کو اس طرح چھیڑنا ٹھیک نہیں! پھر بتاؤ مجھے، کیا کیا اس نے تمھارے ساتھ؟''

مجھے بھلا اس بات کا کیوں کر علم ہو سکتا تھا کہ اس کی نئی بیوی کا رویہ اس کے لیے کوئی راز نہیں۔

وردہ اس کی چہیتی بیوی تھی، اس کے دل کا ٹکڑا، اور اس نے اس عورت کی کمزوری سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے اسے اپنایا تھا۔ اس نے وردہ کو کسی شادی کے موقعے پر موسیقاروں کے ایک طائفے میں گانا گاتے ہوئے سنا تھا اور کسی جنون کی طرح اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور پھر اس سے شادی کر لی تھی، کم و بیش زبردستی، اور اس کو ایک دور افتادہ جاگیر میں رکھ چھوڑا تھا— کھلے پنجرے میں ایک پرندے کی مانند، تاکہ دوسرے مردوں کی تحقیر کر سکے۔ لیکن وہ الغریب کی بھی اتنی ہی تحقیر کرتی تھی۔ اور— بقول سیّد خلیل کے جس نے مجھے پوری داستان سنائی— وہ دونوں الف لیلہ کی کہانیوں کی عورت اور جن تھے؛ جن نے عورت کو ایک بوتل میں بند کر رکھا تھا اور چابی اپنے پاس رکھی تھی، جب کہ عورت کے پاس چھلّوں سے بھرا ایک تھیلا تھا، جو اسے اُن مردوں نے دیے تھے جو عورت کی جن کے ساتھ بے وفائی کا باعث بنے تھے۔ بے شک وردہ کے پاس چھلوں کا کوئی تھیلا نہیں تھا اور الغریب جن سے کہیں زیادہ اثر اور طاقت کا مالک تھا، اور کہیں زیادہ وردہ سے محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ، اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ، کنجوسی کرتا تھا تاکہ وردہ پر چیزیں نچھاور کر سکے۔ اور وہ وردہ کو وفادار رہنے کو بھی نہ کہتا تھا، حتیٰ کہ ایک روایتی وضع داری کا پاس رکھنے کا بھی مطالبہ نہ کرتا تھا؛ بلکہ اس نے یہ کہہ کر اسے بظاہر کھلی چھٹی دے دی تھی کہ ''اگر تمھیں کچھ کرنے کا موقع ملا تو وہ تمھارا حق ہوگا۔'' شاید اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا، اور وہ بوقت ضرورت وردہ کی غلط حرکتوں کی توجیہہ کرنے کی کوشش کرتا۔ اور اس تمام اثنا میں شک کی آگ اس کی روح کو چاٹتی اور اسے اذیت پہنچاتی رہتی اور یہ سوال اس کو ڈستا اور اس کی قوت کو زائل کرتا رہتا: کیا اس نے موقعے کا فائدہ اٹھالیا ہے؟ کیا اس کو موقع مل گیا؟ یا وہ اب تک بے وفائی کرنے کی قوت سے محروم، اس کی قید میں ہے، اس وجہ سے کہ الغریب کا نام دل میں اس قدر دہشت پیدا کرتا ہے؟

جب بھی وردہ پر اس کے اعتماد کی کمی اور اس کا اپنی ذات پر شک ایک خاص نقطے تک پہنچتا، وہ اپنی طاقت کے مظاہرے پر مجبور ہو جاتا تاکہ خود کو اور دوسروں کو یقین دلا سکے کہ وہ اب تک مختار کامل ہے۔ وہ طیش میں آ کر آس پاس کے علاقوں پر اپنا غصہ اتارتا اور اپنی شہرت کو جن کی بوتل سے بھی زیادہ خوفناک بنا دیتا۔

میں بھلا کس طرح جان سکتا تھا کہ اس نے مجھے ایک مہرے کی طرح استعمال کیا تھا تاکہ وردہ کو چھیڑ سکے، اس کو بتا سکے کہ گو الغریب اس سے بہت دور ہے مگر وہ میری قوت ارادی کو مفلوج کرنے اور وردہ کو بے وقوف بنانے کے لیے مجھے استعمال کرنے کے قابل ہے۔ وردہ کو یقیناً پتا ہوگا کہ جلد یا بدیر میں ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا اور الغریب کو سب کچھ بتا بیٹھوں گا، اس لیے اس کا رویہ میرے ساتھ اتنا ناپا تلا تھا، تاکہ وہ الغریب کے چیلنج کا سامنا کر سکے اور جواب میں اس کو خود چیلنج کر سکے۔ میں ایک جیتا جاگتا خط تھا جو

الغریب نے اپنی بیوی کی ذہنی کیفیت کی تفتیش کے لیے لکھ کر بھیجا تھا؛ اور وردہ نے اس کا جواب، اس کے خلاف بغاوت سے بھرپور خط، اسی کاغذ پر لکھ بھیجا تھا۔ الغریب نے مجھے وہاں اس لیے بھیجا تھا کہ اپنی بیوی پر ثابت کر سکے کہ اس کے حسن و جمال اور نسوانی کشش کے مقابلے میں الغریب کا اثر مجھ پر زیادہ حاوی تھا۔

لیکن اس رات جب میں الغریب کو بتا رہا تھا کہ وردہ کے گھر کیا ہوا تھا، وہ صرف ہمہ تن گوش رہا، وقتاً فوقتاً ہنستا رہا، اپنے پرانے لہجے میں نہیں بلکہ ایک نوبالغ لڑکے کی طرح جو اپنے وجود پر اور اپنی مردانگی پر خوش ہو رہا ہو۔

جب میں نے بات ختم کی تو اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا، ''اچھا موسیو، اگر وہ تمھاری بیوی ہوتی اور اس طرح کی حرکتیں کرتی تو تم اس کے ساتھ کیا کرتے؟'' میں نے واقعتاً غصے میں آ کر جواب دیا، ''میں اسے کب کا قتل کر چکا ہوتا۔''

''اتنی آسانی سے؟ کیا کسی کو قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے؟''

''کم از کم تمھارے لیے تو ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ ''لوگوں کو قتل کرنا اَور بات ہے، اور اپنی بیوی کو قتل کرنا اور بات۔ کون جانے... مجھے لگتا ہے میں جس سے بھی ملتا ہوں اس نے کبھی نہ کبھی اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا ہوتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کرو یا نہ کرو۔ ایک دن تم خود سے کہتے ہو: بس بہت ہو چکا، اس سے کوئی امید نہیں کی جا سکتی؛ اسے ختم کر دو۔ مگر دوسرے دن شاید تم خود سے کہو: ایک موقع اور دے دو؛ ہو سکتا ہے وہ اپنی عادتیں بدل ڈالے... اور پھر ان دونوں ارادوں کے درمیان تمھاری کشمکش جاری رہتی ہے، عمر بھر۔ اگر فیصلہ کرنا اتنا ہی آسان ہوتا تو ہر شخص اپنی بیوی کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار تو ضرور قتل کر چکا ہوتا۔''

میں سمجھ نہ سکا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے صاف بات نہیں کر رہا ہے جو کہ خلافِ معمول تھا؛ اور میں یہ پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے مسئلے کو غیرسنجیدگی سے برتنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کے لیے شدید اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے اس سے کہا:

''لیکن میرا تو خیال تھا کہ تم ایسے نہیں ہو۔''

اس نے اپنا سر ذرا سا اٹھایا اور کچھ مذاق اور کچھ سنجیدگی سے کہا، ''جلد ہی تم بڑے ہو جاؤ گے اور سمجھ جاؤ گے کہ میرا کیا مطلب ہے۔''

میں نے دیکھا کہ اس کی گردن جھک گئی ہے اور اس کا سر ایک غیریقینی ساکت جھنڈے کی طرح

لٹک گیا ہے۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں اب اس سے تھک چکا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھے بیٹھے اکتا گیا، اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اس نے اپنے کان کھڑے کر لیے جیسے کوئی کتا خطرے کی بو سونگھ رہا ہو۔ اس کی سانسیں تیز ہو گئیں، جیسے وہ میلوں دور سے بھاگتا آیا ہو: اور پھر اس کی آواز آئی، ''اپنی عبا دانتوں میں دبا لو، اور جان بچا کر بھاگو۔ رکنا نہیں، گھر پہنچ کر دم لینا۔''

۹

وہ رات میں نے کروٹیں بدل کر گذاری، اس تفکر میں کہ اس نے مجھے بھاگنے کا حکم کیوں دیا تھا، یا پھر اس گفتگو پر غور میں جو ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ میں الغریب کے اس پیکر کا جو میں نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا، اس سے ملاقات کے بعد قائم ہونے والی رائے سے تطابق تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا: ایک طاقتور شخصیت، پھر بھی عجیب طور پر کمزور: ایک شخص جس نے دنیا بھر کو دہشت میں مبتلا کر رکھا تھا لیکن وردہ کو مرعوب نہیں کر سکا تھا جس کو اس سے سب سے زیادہ خوفزدہ ہونا چاہیے تھا۔ اس دوران الغریب نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ تکلیف دہ راتوں میں سے ایک رات گذاری جیسا کہ مجھے دوسرے دن پتا چلا۔

اس کی حسیات درست ثابت ہوئی تھیں، ایک بہت بڑا حفاظتی دستہ کمشنر کی سربراہی میں اس کی تلاش میں ان ہی کھیتوں کے اطراف گشت کر رہا تھا۔ اگر ہم چند لمحے اور باتیں کرتے رہتے، یا اس کی سماعت اتنی حساس نہ ہوتی، تو انھوں نے ہمیں گھیر لیا ہوتا۔

دوسری رات میں اس کے لیے تربوز لے کر گیا جس کی اس نے خواہش کی تھی۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کو بیچ سے کاٹا اور بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر ہو گئی اور وہ نہ آیا۔ میں جتنا تربوز کھا سکتا تھا، کھا لیا اور بچا ہوا حصہ زمین میں دبا کر گھر واپس آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوشی مناؤں یا افسوس کروں اس دھاگے کے ٹوٹنے پر جس نے مجھے الغریب سے باندھ رکھا تھا۔ گو کہ میری اس سے ملاقات کو مختصر سا عرصہ ہوا تھا لیکن یہ میرے تجسس کو کند کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن دوسری طرف ان ملاقاتوں سے میرا مقصد حاصل نہ ہوا تھا: اس نے مجھے قتل کرنا نہیں سکھایا تھا جو کہ میری خواہش تھی، اور اب مجھے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ خود اسے بھی قتل کرنا نہیں آتا۔

چند دن یوں ہی گذر گئے، شاید دو یا شاید تین۔ اور پھر ایک رات میں اپنے بستر کے ساتھ والی دیوار پر ہلکی سی دستک کی آواز سے چونک کر جاگ گیا۔ میں پوری طرح جاگ گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ دوسری دفعہ وہ آواز صاف اور واضح تھی۔ یہ ایک کنکر کی آواز تھی جو مجھے یقین تھا کسی نے جان بوجھ کر میری توجہ

مبذول کرانے کے لیے کھڑکی پر مارا ہے۔ میں سوچنے لگا یہ کون ہوسکتا ہے، کیونکہ الغریب کو یہ ٹھیک سے معلوم نہ تھا کہ میرا گھر کس جگہ واقع ہے؛ اگر اس نے معلوم کر بھی لیا ہو تو اسے یہ کیسے پتا چلا ہوگا کہ میرا کمرہ کون سا ہے اور میں کس کھڑکی کے قریب سوتا ہوں؟

میں اٹھ بیٹھا، شدید اندیشوں کے باعث خالی الذہنی کی کیفیت میں، یہاں تک میرا دماغ ایک خالی ٹین کے ڈبے کی طرح معمولی سی آہٹ اور مبہم سے خیال سے بھی بجنے لگا۔ میں نے احتیاط سے کھڑکی کھولی اور گھر کے باہر مدھم سی روشنی میں، سرگوشی میں ایک حکم سنا: ''نیچے آؤ''۔ اور پھر ایک اور حکم: ''اور اطالوی لے آنا۔''

وہ الفاظ تاریکی میں چاقو کے تیز پھل کی طرح اچانک چمکے، اور غائب ہو گئے۔ سب کچھ تاریک سکوت میں لوٹ گیا، سوائے ایک تاریک ترین ساکت نقطے کے جس نے ہلنا شروع کیا، انسانی شکل اختیار کی اور کھیتوں کی طرح چل پڑا۔

میری مسرت ہر چیز پر غالب آ گئی— میری بوکھلاہٹ پر، میرے خوف پر کہ کہیں گھر میں کوئی اور بھی اٹھ نہ بیٹھا ہو، خاص طور پر میرا باپ، کہ ہلکی سی آواز پر بھی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ خوشی میرے اندر موجزن ہوگئی جب میں کبوتر خانے کے پیچھے والے گودام کے راستے کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا جہاں میں نے وہ اطالوی سب مشین گن چھپا رکھی تھی جو الغریب نے مجھے دی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں جب اس سے میری ملاقاتیں ختم ہوگئی تھیں، میری زندگی پرانے معمول کے ڈھرے پر لوٹ آئی تھی: بے معنی، بے ماجرا، راز اور رات سے خالی وہ زندگی کتنی مختلف معلوم ہوتی تھی۔ میں اکثر مکئی کی بالیوں میں بھٹکتا پھرتا، اس امید میں کہ شاید اس دھاگے کو پکڑ سکوں جو مجھے اس تک واپس لے جائے۔ اور اب وہ خود لوٹ آیا تھا، اور اس طرح کہ میرے تخیل کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

میری مسرت میرے شکوک پر حاوی آ گئی اور پلک جھپکتے میں میں اس کے سامنے کھڑا تھا، اسی جگہ جہاں ہم دونوں ملا کرتے تھے۔ اکھڑی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے لیے تربوز لے کر آیا تھا، بندوق اسے پکڑائی اور اس کے سامنے اسے لوڈ کیا جیسا کہ اس نے مجھے سکھایا تھا۔ جب میری سانسیں بحال ہوئیں اور میرا درجۂ حرارت معمول پر آنے لگا، تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ بوکھلاہٹ میں مجھے احساس ہوا کہ وہ پہلے جیسا الغریب نہ تھا؛ وہ خاموش اور سمٹا ہوا تھا اور اس نے اپنی حسیات کو یکجا کر کے اپنی قوت ارادی کو ایک مخصوص مقام پر مرکوز کر رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا تاثر تھا جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا: ایک پرجوش محویت بلکہ دیوانگی اور ایک نئی روح اس میں دوڑ اٹھی تھی، جس نے مجھے اچانک خاموش کر دیا، اور ایک سپاہی کا سا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جو اپنے افسر کے حکم کا

منتظر ہو؛ اور بلاشبہ میں نے اسے کہتے سنا:

"تم گھر جاؤ گے یا میرے ساتھ آ رہے ہو؟"

میں نے فوراً جواب دیا، "میں تمھارے ساتھ چلوں گا — لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"پوچھو مت۔ شاید ہم کسی کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔ شاید ہمیں کوئی قتل کر دے۔ تم آ رہے ہو؟"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مکئی کی بالیوں کے درمیان راستہ بنایا اور پھر اس کا منحنی ہیولا غائب ہو گیا۔

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

۱۰

میں نے اس سے بات چیت جاری رکھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ایسے شخص کی طرح چلا جا رہا تھا جو کسی دور دراز منزل کی جانب گامزن ہو — ایک منزل جو اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ اسے نہ سانس لینے کی فرصت تھی اور نہ کسی سے بات کرنے کی۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے میں نے کتنے ہی پل پار کیے، نہروں کے کنارے گھوم کر طے کیے اور سیلابی نالوں کی تہہ میں گھٹنوں کے بل رینگ کر نکلا۔ وہ نہ مجھے دیکھ رہا تھا اور نہ کچھ سن رہا تھا۔ وہ میرے وجود سے بے خبر تھا۔ کبھی اگر وہ کچھ بولتا بھی تو اس سے زیادہ نہیں: "کیا؟ کیا کہا تم نے؟" اور جب بھی میں نے سوال کرنے کی کوشش کی تو وہ جواب میں بڑبڑانے لگا اور مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا ہے اور اس سے جواب اگلوانے کی کوشش بے کار ہے۔

رات وسیع و عریض تھی، اور ہیبت ناک، دن کی موت کے ماتم میں سیاہ لبادہ اوڑھے، کسی خیمے کی مانند؛ صرف زرد چاند اور تارے سوگواروں کو راستہ دکھانے کے لیے مدھم روشنی میں جل رہے تھے۔ کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے، دن کے کھیتوں سے زیادہ وسیع و عریض۔ کٹی ہوئی گندم، مکئی کی کھڑی بالیوں کے لیے راستہ بنا رہی تھی، اور جو کپاس کے لیے۔ اور ہم پانی میں، جس نے زمین کو چاول کی کاشت کی امید میں ڈبویا ہوا تھا، مبہم سائے دیکھ رہے تھے۔ زمین... حدِ نظر تک زمین ہی زمین تھی؛ ہر انچ کا ٹکڑا کاشت کیا ہوا، محنت سے سنوارا ہوا۔ وہ بے چاری خلقت اپنے پلنگوں پر لیٹی ہوئی تھی جس نے اس کے لیے خون پسینہ ایک کیا تھا اور پھر تھک کر، گویا اداس ہو کر، کروٹیں بدلتی ہوئی سو گئی تھی، اس انتظار میں کہ دن نکلے اور انھیں اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر زمین کے چہرے پر بکھیر دے اور وہ ایک بار پھر اس تاریک ویرانے کو سبزے میں اور اس کی مٹی کو کپاس میں تبدیل کر دیں یہاں تک کہ رات آ جائے اور ان کو کاٹ کر اپنے رازوں سے

دور اسی مٹی سے بنائے ہوئے انسانی گوداموں میں محفوظ کر دے۔
کیسی خلیج تھی جو ہمارے اور ان کے درمیان حائل تھی۔ وہ جو زمین کی یافت پر زندہ رہتے تھے اور پھر اس کو اپنی ہڈیوں کے گودے سے سینچتے تھے، وہ اس وقت دور اپنے مکانوں میں سوئے ہوئے تھے، وجود کے سامنے اپنی مکمل سپردگی سے مطمئن، کٹھور آسمان اور زمین سے بے نیاز اور اپنے بے تغیر روز و شب پر قانع۔ اور ہم ان کی دنیا سے گذر رہے تھے، ان کی کوششوں کے ثمر کو جواں مردوں کی طرح آراستہ کرنے اور تصرف میں لانے کے لیے۔ الغریب میرے آگے تھا؛ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں اور طاقتور بازوؤں کے ساتھ دن کی گرفت سے فرار کی کوشش میں رات کے ہاتھوں کاٹ ڈالے جانے کی کشمکش سے بچ کر نکلتا ہوا، اور ان کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے آگے زیر کرتا ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی طاقت لوگوں پر ظاہر ہوتا کہ وہ اس سے اس طرح خوف کھائیں جیسے خدا سے اور اگلے جہاں سے اور سرما کی کاٹنے والی سردی سے خوف کھاتے ہیں۔ میں نے رات کی وسعت کو اور پشت سے اس کے مختصر سے وجود کو دیکھا؛ باوجود اس کے کہ بندوق اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی، مجھے محسوس ہوا کہ وہ رات کی باگیں پکڑنے، اس پر قابو پانے کے لیے بہت کمزور ہے۔
لیکن وہاں ہم تنہا نہ تھے۔ میں نے اسے کچھ بڑبڑاتے اور پھر واضح طور پر کسی کو سلام کرتے سنا۔ میں نے اپنے اطراف میں نظر ڈالی اور دو، یا شاید زیادہ، آدمیوں کو دیکھ سکا جنھوں نے پل کے نیچے یا شاید کسی پن چکی کے سائے میں پناہ لے رکھی تھی۔ بجائے اس کے کہ میں تعجب کرتا کہ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں اور کیوں اپنے بستر چھوڑ کر اس تاریک ویرانے میں خاموش مشاورت کے لیے آئے ہیں، ایک جھرجھری اور اپنے سر کی ایک غیر ارادی جنبش کے ساتھ میں نے جان لیا کہ وہ رات کے فرزند ہیں اور الغریب جیسی زندگی کے طلب گار۔ جب انھوں نے اس کی آواز سنی تو خود کو محفوظ تصور کیا اور سلام کا جواب دیا، گویا وہ کوئی اسمِ شب ہو۔ انھوں نے اپنی خوشگوار مہمان نوازی ترک نہ کی اور کہا، ''تشریف لائیے۔'' میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ انھوں نے مجھے الغریب کے ساتھ دیکھ کر مجھے بھی دعوت دی۔
بتدریج، رات کے طویل قرب کے بعد، جب ہم تاریکی میں مزید اندر اتر گئے تو میں نے الغریب کو نئی آنکھوں کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ گو کہ میری بینائی ہمارے اطراف میں پھیلی ہوئی رات سے دھندلا گئی تھی، میں یہ محسوس کرنے کے قابل تھا کہ رات اور وہ کس طرح یک جان ہو گئے ہیں۔ یہ میرے لیے ناممکن ہو گیا کہ رات کا تصور الغریب کے بغیر یا اس کی اور اس جیسوں کی زندگی کا تصور رات کی پناہ دینے والی بانہوں کے بغیر کر سکوں۔ یہ وہ اجنبی تھے جو دن کے غیر مبہم نسب سے انحراف کر کے اپنے مبینہ سلف، رات، کی پناہ میں آ گئے تھے۔ رات کی گمنامی کی کشش انھیں اپنی طرف جذب کرتی تھی، اور دن کی صراحت

اور ضابطہ پرستی سے انھیں تنفر تھا۔ جو کوئی بھی رات سے ان کی بے تکلفی کا، اور رات کی وحشت سے ان کے عادی ہونے کا گواہ ہے، وہ اس نتیجے تک پہنچنے پر مجبور ہوگا کہ ان جیسے لوگ ہمیشہ رہیں گے، چاہے یہ دنیا الٹ پلٹ کر پھر سے آباد ہوجائے۔ جب تک رات کا جادو باقی ہے، کون انھیں الزام دے سکتا ہے؟ کیونکہ یہ رات ہی ہے جس نے ان کو دن سے کھینچ کر جدا کیا اور انھیں وہ بنایا جو کہ وہ ہیں۔ رات اپنے ساتھ اپنی مخلوق لاتی رہے گی، جس طرح پانی مچھلیاں، صحرا گلہ بان اور جلاوطن گھر کی یاد لاتا ہے۔

اس طرح کے مرد ہمیشہ ہوتے آئے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے، اس کے باوجود کہ وہ صدیوں سے کڑی سزاؤں کا شکار رہے ہیں اور ختم ہوتے رہے ہیں۔ جب بھی ان میں سے ایک ختم ہوتا ہے، رات دن سے ایک اَور حاصل کر لیتی ہے تاکہ یہ پہیا اس طرح گھومتا رہے۔ اور ہمیشہ دو واضح دنیائیں موجود رہتی ہیں: رات کی دنیا اور دن کی دنیا۔ گوکہ جو دن کے باسی ہیں وہ اکثریت میں ہیں — شاید اس لیے کہ ہمیں یقین رہے کہ ہمارے پاس متبادل موجود ہے اور ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں، جس دنیا میں چاہیں رہیں۔

اچانک الغریب نے مجھے روکنے کے لیے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ میں نے خود کو اس کے مقابل پایا: وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس لمحے میں نے خود سے سوال کیا کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس شخص کو مجھے قتل کرنے سے روکے ہوئے ہے۔ ہم ایک دور افتادہ ویرانے میں تھے: صرف خاموش رات ہماری گواہ تھی۔ اور اگر اسے کسی بہانے کی ضرورت ہوتی تو جو کچھ میرے اور وردہ کے درمیان ہوا، وہی کافی تھا۔ صرف ایک وجہ تھی جو میں سوچ سکتا تھا: وہ یہ کہ الغریب مجھے جانتا تھا، اور یہ کہ اب اس کے اور میرے درمیان تعلق کی نوعیت ایسی تھی جس سے مجھے تسلی تھی۔ کسے معلوم؟ شاید اگر لوگوں کے درمیان باہمی پہچان کا رشتہ مضبوط ہو تو وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے گریز کریں؛ ان کے درمیان خوف کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے جب وہ بولا، ایسی آواز میں جو طویل خاموشی اور شبنم کی نمی سے بھاری ہو رہی تھی۔

''کیا تم خوفزدہ ہو؟''

''نہیں۔''

''ہر چیز کے لیے تیار ہو؟''

''کس قسم کی چیز کے لیے؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ ایک بار پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا، ''کیا تم وہ آگ دیکھ سکتے ہو؟''

میں نے اب تک اس پر غور نہ کیا تھا لیکن جب میں نے جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو کافی فاصلے پر ایک دمکتا ہوا نقطہ نظر آیا، جیسے کسی کانے بھیڑیے کی آنکھ جو دہکتے ہوئے انگارے بھی ہو سکتے تھے۔

''تمھیں معلوم ہے وہاں کون ہے؟''

''کون؟''

''شلابی۔''

''شلابی کون؟''

''میرا دوست، میرا عزیز دوست۔ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ اتنا عرصہ ہوگیا اس سے ملے ہوے۔ میں اسے دل کی گہرائیوں سے یاد کر رہا ہوں۔''

اور پھر اس نے کارروائی میں میرا کردار بتایا: وہ چاہتا تھا کہ میں شلابی اور اس کے ساتھی کو خوفزدہ کر دوں۔ وہ آگ میں بھٹے بھون رہے تھے اور مکئی کی خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ مجھے مشین گن لے کر رینگتے ہوے ان تک پہنچنا تھا اور ان کے سامنے کود کر چلانا تھا: ''حرامیو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس لمحے، الغریب نے مجھے تسلی دی، وہ سامنے آجائے گا اور میں ہنس پڑوں گا اور ہم سب بیٹھ کر بھٹے اڑائیں گے۔

مجھے اقرار کرنا ہوگا کہ اس وقت میں نے خود کو موت کے منھ میں جاتا ہوا محسوس کیا؛ بندوق میرے ہاتھ میں کانپنے لگی اور مجھے دونوں ہاتھوں سے اس کو پکڑ کر کندھے سے لگانا پڑا۔ بے حد آہستگی سے میں آگے بڑھا۔ اور وہ چند لمحے پھیل کر ایک صدی پر محیط ہو گئے، جن میں میں فاصلہ طے کر کے ان کے سامنے پہنچا اور اس قابل ہوا کہ ان کے چہرے دیکھ سکوں۔ ان میں سے ایک جوان اور خوبصورت تھا اور ایک اونی ٹوپی سر پر ترچھی اوڑھے ہوے تھا۔ اور دوسرا واضح طور پر کوئی سرکاری چوکیدار نظر آتا تھا۔ وہ پالتی مارے، اپنی بندوق گھٹنوں پر رکھے، بیٹھا آگ کو کرید رہا تھا؛ جب کہ نوجوان اپنے گھٹنے بازوؤں میں گھیرے بیٹھا تھا اور متفکر نظر آتا تھا۔ اگر مجھے الغریب کا خوف نہ ہوتا تو میں ان کے سر کے اوپر ہوا میں گولیاں چلاتا؛ بھری ہوئی بندوق بہت بڑی ترغیب تھی، اور فاصلے سے گولی چلانا، ان کے سامنے جانے سے کہیں زیادہ آسان تھا۔

میں وہاں کھڑا رہا، کانپتا اور جھجکتا ہوا، یہاں تک میں نے الغریب کو ان دونوں کی پشت پر، کھلیان کے دروازے سے نکلتے ہوے دیکھا اور اس لمحے، گویا مجھے حکم ملا ہو، میں اچانک ایک پاگل سانڈ کی طرح اچھل کر ان کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ وحشیانہ قلانچوں میں بھرتا، ڈکراتا ہوا، لمحہ بھر میں ان کے سامنے تھا اور ہمارے درمیان صرف آگ کے دہکتے ہوے کوئلے تھے۔ میں نے بے حد احمقانہ انداز میں بندوق سے ان کا نشانہ لیا، لیکن یہ شرارت میری توقع سے کچھ زیادہ ہی کامیاب ثابت ہوئی؛ وہ سچ مچ خوف زدہ ہو گئے اور ڈر کے مارے اچھل کر پیچھے کو ہوے۔ چوکیدار یوں چیخنے لگا گویا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہو۔ اب جب میں اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو یہ سب تفصیلات مجھے دلدل میں دھنسی، گہرائی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جیسے کبھی پیش ہی نہ آئی ہوں۔ اس کی وجہ وہ دوسرے واقعات ہیں جو اسی لمحے وقوع پذیر ہونا شروع ہوے؛

میری زندگی کے سب سے بھیانک، دہشت انگیز مناظر۔

میرے پاس اس کے سوا کوئی راہ نہ تھی کہ ان واقعات کو ہوتے ہوئے دیکھوں۔ اور مجھے آج، اس لمحے تک یاد ہے کہ الغریب کیسے قریب آتے آتے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سر کے اوپر اٹھا لیے۔ میں نے ان ہاتھوں کو نیچے آتے دیکھا یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا؛ لیکن جو مجھے یاد ہے وہ ایک ایسی آواز تھی جو میں نے آج تک نہ سنی تھی، یا جس کا وجود تک نہ ہوگا—ایک انڈے کی دوسرے انڈے کو پاش پاش کرنے کی آواز، اگر انڈا انسانی سر کے برابر ہو: کسی دہکتی ہوئی دھات کے پانی میں بجھتے ہوئے سسکارنے کی آواز۔ مجھے صرف وہ آواز یاد ہے، اور پھر اس اوباش نوجوان کا اپنے پیروں پر جھک کر کھڑا ہونا اور پھر دوبارہ نہ بیٹھنا۔ اس کی ٹانگ ہوا میں اچھلی، اور پھر یکساں وقفوں میں جھٹکوں کے ساتھ نیچے آنے لگی۔ اس کا سر بھی زمین پر آ گرا، لیکن وہ سر نہیں جسے میں نے دیکھا تھا بلکہ ایک گڈمڈ سے مادّے کا ڈھیر، جو ایک سیاہ چمکدار شے سے کھل گیا تھا: اور یہ علم کسی بھی مضبوط اعصاب کے مالک اور مستقل مزاج شخص کو ہلا دینے کے لیے کافی ہوتا کہ وہ شے ایک کلھاڑی تھی جو اس کی ایک آنکھ سے ہوتی ہوئی سیدھی ٹھوڑی تک اتر گئی تھی۔

۱۱

اس تمام کارروائی میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہ لگے ہوں گے، لیکن اس واقعے تک لوٹ لوٹ کر جانے اور ان کے بارے میں سوچنے میں میری زندگی کے کئی سال صرف ہوئے۔ ہر دفعہ وہی کراہت کا احساس غالب آ جاتا، وہی تشنج، رونگٹوں کا اسی طرح کھڑا ہو جانا، گویا وہ میں خود تھا جس کی کھوپڑی کھل گئی تھی۔

ہم میں کوئی ایسی انجانی طاقت ہے جو کسی دوسرے کو اذیت میں گرفتار دیکھ کر ہمیں خود اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے، اور کسی دوسرے کی موت پر، ہم خود بھی کم و بیش ختم ہو جاتے ہیں۔ میرے اور اس نوجوان کے درمیان کوئی رشتہ نہ تھا، لیکن اس کی دہشت ناک موت مجھے بار بار دہلاتی رہی۔ اور یہی نہیں کہ میں مقتول کے لیے انسانی جذبات کی وجہ سے اذیت میں مبتلا رہا، بلکہ اس سے بدتر یہ کہ قاتل کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس بھی مجھے کچوکے دیتا رہا۔

وہ دہشت جو اس کی موت کے بعد کے چند منٹوں میں مجھ پر طاری رہی وہ اس دہشت سے کہیں زیادہ شدید تھی جو اس کی موت کے لمحے میں ہوئی تھی۔ الغریب کا چہرہ، جب اس نے ہولناک طور پر گڑی ہوئی کلھاڑی کو کھینچ کر باہر نکالا، وحشت ناک ہو رہا تھا؛ اور وہ، ہانپتا ہوا، اس پر جھکا کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر چوکیدار کو جو زمین پر اوندھا پڑا تھا، یا خوف سے مر چکا تھا۔ آگ کی لَو نے الغریب کے چہرے

کو روشن اور اس کے تاثرات کو نمایاں کر دیا تھا۔ میں اپنی جھرجھری پر قابو پانے میں ناکام ہو گیا اور مجھ پر باقاعدہ کپکپی طاری ہو گئی۔

میں نے اس کی چھوٹی آنکھوں کو کبھی اتنا پھیلا ہوا نہ دیکھا تھا؛ میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ انسانی آنکھ میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ گول ہو کر اتنی پھیل جائے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ خود قتل ہوا ہوتا تو اس کی آنکھوں میں اتنی دہشت نہ ہوتی، اور نہ اس کا چہرہ اتنا ستا ہوا ہوتا۔ یوں لگتا تھا کہ جس وار نے نوجوان کے سر کے دو ٹکڑے کر دیے تھے، اسی وار نے کوئی خفیہ در کھول دیا تھا جس میں سے کسی شیطانی عفریت نے نکل کر خود ایک کلھاڑی سے الغریب کی کھوپڑی کھول دی تھی۔ صرف ایسی کوئی بدروح ہی الغریب کی ابلتی ہوئی آنکھوں اور اس کے اچانک حواس کھو بیٹھنے کی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس کی حرکات اور جنبشیں جنونیوں کی سی ہو گئی تھیں،؛ وہ اپنے اردگرد آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا، دائروں میں گھومتا، پہلو بدلتا، کلھاڑی لیے وار کے انداز میں ہاتھ اٹھاتا۔ یہ کوئی دوسرا آدمی تھا؛ اس الغریب سے بالکل مختلف جو میرے ساتھ رات کے اندھیرے میں اتر کر آیا تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ وہ آسانی سے کلھاڑی میرے سر میں بھونک سکتا تھا، بغیر کسی اشتعال کے؛ یا زمین پر اوندھے پڑے ہوئے چوکیدار کے دو ٹکڑے کر سکتا تھا۔ یقیناً، وہ اس غیر عقلی کیفیت میں کچھ بھی کر سکتا تھا؛ اور اگر وہ خود کو اس نظر نہ آنے والے عفریت سے بچانے کے لیے جو اُس کے سامنے کھڑا اسے دہشت زدہ کر رہا تھا، خوں ریزی اور تباہ کاری پر اتر آتا تو اسے روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ میں اور چوکیدار اس رات بچ نکلے۔ میری یہ کیفیت تھی کہ میں بندوق کی لبلبی دبانے ہی والا تھا جیسا کہ الغریب نے مجھے سکھایا تھا۔ ہم سب یکساں طور پر دہشت زدہ تھے: ایک عادی مجرم اور قاتل اُتنا ہی خوفزدہ تھا جتنا ایک بے وقوف نو آموز۔ زندگی کی بقا کے لیے میں بندوق سے چمٹا ہوا تھا اور وہ کلھاڑی سے؛ دیوانگی کے عالم میں اس شے کو تلاش کرتا ہو جو اسے دہلا رہی تھی۔ اور اس دوران چوکیدار نے بے ہوشی میں تحفظ پایا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مقتول بھی یہی پسند کرتا کہ اسی طرح مرا پڑا رہے، بجائے اس کے کہ دوبارہ زندہ ہو کر پھر سے کلھاڑی کے وار کا نشانہ بنے۔ آگ بھڑکتی رہی، خود کو بجھنے سے بچائے رکھنے کے لیے وہ بھٹے کے دانوں کو جلاتی رہی اور وہ آگ سے اپنی بقا کی جنگ لڑتے رہے؛ اپنے مقدر کے خوف سے سسکارتے، وقتاً فوقتاً چٹختے، آگ سے رحم کی التجا کرتے کہ زندگی کی آخری رمق تو نہ بجھائے۔ موت کا بھرپور چھا جانے والا خوف اور زندگی سے ہٹ دھرمی کے ساتھ چمٹاؤ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے؛ اور رات دن سے مقابلے کی کوشش میں، دبیز تر ہو گئی۔ صرف چاند ایک غیر جانب دار تماشبین تھا — اپنی موٹی سی ناک لیے، ہم پر ترس سے گھٹتا ہوا، بظاہر مقدر کے کھیل پر گم سم۔

اور پھر ہمیں انسانی گوشت کے جلنے کی بو محسوس ہوئی جو مکئی کی خوشبو میں مل گئی تھی اور ہوا میں پھیل رہی تھی۔

اچانک ہم حرکت میں آ گئے۔ الغریب کی ایک لات سے چوکیدار اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ان دونوں نے مل کر لاش کو اٹھایا اور آگ بجھائی جو اس کے کپڑوں میں پھیلنے لگی تھی اور اس کے بازوؤں کے گوشت تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے بندوق اور کلھاڑی اٹھائی اور وہ دونوں اپنے بوجھ کے ساتھ مجھ سے آگے نکل گئے۔ ہم زیادہ دور نہیں گئے؛ چند گز کا فاصلہ طے کر کے ہم ایک ویران پن چکی پر پہنچ گئے جو اس وقت جب دریائے نیل میں پانی کم ہوتا تھا، زیرِ زمین پانی نکالنے کے کام آتی تھی۔ اس کے اردگرد گھاس اگ آئی تھی اور اس کا پانی ٹھہرا ہوا تھا؛ دھات کے رنگ کا اور چکنا ہو چلا تھا۔ وہ پن چکی پہلے ہی ان کے ہاتھ لگ چکی تھی، اور وہ اسے کمیں گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے اور وہاں لوٹ کا سامان چھپایا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ پن چکی ان لوگوں کی قبر کا کام بھی دیتی ہے جن کو روایتی طریقوں سے دفنانا مناسب نہیں ہوتا۔ پانی میں پھینکنے سے پہلے لاش سے ایک بھاری پتھر باندھ دیا جاتا اور پانی اس کے کپڑوں اور اس کے مردہ جسم کو چند ہی دنوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا۔

ہم ایک خاموش جلوس کی صورت میں واپس آئے۔ اس دفعہ میں سب سے آگے تھا، چوکیدار بیچ میں، اور الغریب پیچھے بندوق اور کلھاڑی اٹھائے ہوئے جو میں نے اسے تھما دی تھیں۔ چوکیدار اور الغریب نے کچھ کانا پھوسی کی اور پھر چوکیدار جلد ہی غائب ہو گیا اور ہم دونوں اکیلے واپس ہوئے۔

چند لمحوں تک ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا، اور پھر الغریب اپنی معمول کی آواز میں اس خطرناک کھیل میں مجھے شامل کرنے کی معافی مانگنے لگا: اسے شلابی کو ختم کرنا ہی تھا اور اس کی مدد کرنے والا اور کوئی نہ تھا۔

اور پھر اس نے مجھے شلابی کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ وہ صرف اس کا مددگار یا اس کے گروہ کا ایک رکن ہی نہ تھا بلکہ اس کا عزیز ترین دوست بھی تھا۔ ان کی دوستی کا آغاز بدھ بازار میں ایک جھگڑے کے بعد ہوا تھا اور یہ دوستی دس سال تک قائم رہی۔ الغریب اس کے خلوص پر شبہ کیے بغیر اسے اپنا سب کچھ دے ڈالتا: اپنا آپ، اپنا نام، اپنا اثاثہ — اس دن تک جب وہ آخری بار اس پن چکی پر ملے تھے جہاں ہم نے کچھ لمحے پہلے اسے چھوڑا تھا۔ جب الغریب اس روز پن چکی پر پہنچا تو اس نے خود کو پولیس کے پچاس نشانہ بازوں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ اس پر بندوق تنی ہوئی تھی: اور جب اسے ٹرک میں دھکیلا گیا اور شلابی پیچھے رہ گیا تب بھی الغریب اس پر شبہ نہ کر پایا۔ وہ کس طرح یہ جان سکتا تھا کہ ان تمام برسوں میں شلابی حسد کی آگ میں جلتا رہا ہے اور اس کو اکھاڑنے کی سازشوں میں لگا ہوا ہے تاکہ خود

الغریب کی جگہ لے سکے، گروہ کا سردار بن سکے اور — جس بات نے الغریب کو زیادہ کھایا — وردہ کے ساتھ سو سکے؟ اور شلابی ہی تھا جس نے کمشنر کی ایما پر اس چھاپے کا انتظام کیا تھا۔

الغریب نے یہ سب کہانی کی صورت میں نہیں سنایا بلکہ اس طرح گویا وہ کوئی ایسا زخم دکھا رہا ہو جس میں سے اب تک خون رس رہا ہو، ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔ ایک بار وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا، اور پھر بے حد مضطرب ہو کر بولا، ''اس نے جو ٹوپی چھاپے کی رات پہن رکھی تھی وہ میری تھی۔ میں نے اسے ایک ٹھیلے سے دو پونڈ میں خریدا تھا۔ اسے وہ ٹوپی بے حد پسند آئی تھی، اس لیے میں نے اسے دے دی تھی۔'' وہ ہنسا اور کہنے لگا، ''اگر تم سچ جاننا چاہو تو غلطی اس کی نہیں بلکہ میری تھی۔ اگر میں دوستی اور وفاداری کی توقع کر رہا تھا تو میں غلطی پر تھا۔ رات میں ہر شخص صرف اپنے لیے ہوتا ہے۔ اگر تم اپنی گردن کی حفاظت کی ذمے داری کسی اور کو سونپ دو، تو پھر کچھ ہونے پر اس کو الزام نہیں دے سکتے۔''

اور پھر الغریب مڑا اور بتانے لگا کہ کس طرح اس نے شلابی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا: بالکل ویسے ہی جس طرح شلابی نے اسے پولیس کے ہتھے چڑھوایا تھا، کم و بیش اسی جگہ پر، اور انھیں ہتھیاروں سے: دوستی اور اعتماد۔ وہ چوکیدار اسی جاگیر سے آیا تھا جہاں وردہ رہتی تھی۔ شلابی نے فوراً ہی اس سے دوستی کر لی تھی اور اس پر تحفے تحائف اور عنایتوں کی بارش کر دی تھی تاکہ وردہ کے پاس بلاخوف و خطر آ جا سکے۔ اس رات دونوں نے وردہ کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ دو اَور آدمیوں کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اپنی کارروائی شروع کر سکیں۔ بے شک شلابی کو ہرگز یہ علم نہ تھا کہ چوکیدار نے اس کا راز فروخت کر دیا ہے، جب کہ اس تمام کارروائی کا اختتام خود چوکیدار کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔

گو کہ میں وہ سب غور سے سن رہا تھا جو الغریب کہہ رہا تھا، لیکن ساتھ ساتھ یہ عیارانہ خیال بھی میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ اگر میرا باپ مجھے اس وقت دیکھ لے تو کیا کہے؟ وہ متقی پرہیزگار شخص جو پانچوں وقت کی نماز پڑھتا تھا اور خدا کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلتا تھا، اگر اسے یہ علم ہو جائے کہ میں نے ابھی ابھی اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا ہے تو اس کا کیا ردِعمل ہو؟ اور یہ جان کر کہ میں کس شخص کا چیلا بن گیا ہوں؟ اس شخص کا جس نے مجھے اپنی باتوں سے ایک ایسی غیر معمولی، عجیب و غریب دنیا میں پہنچا دیا ہے جس کی معمولی سے معمولی تفصیل بھی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔

ان باتوں نے مجھے اتنا الجھائے رکھا کہ میں نے غور ہی نہ کیا کہ اس وقت ہم اس جاگیر میں داخل ہو گئے ہیں جہاں وردہ رہتی ہے، اور کم و بیش اس کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ الغریب نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے میرا جلابیہ کھینچا، ''یہ دیکھو، خون ہے شاید۔'' جب میں نے نزدیک سے دیکھا تو مجھے اس کے ہاتھ میں خون کے دھبے نظر آئے اور جب اس نے اپنی ران کو دوبارہ چھوا تو وہاں خون ہی خون تھا۔ اس

نے کپڑے اوپر کیے۔ وہاں ایک گھناؤنا زخم تھا جیسے کسی پاگل مخلوق نے اس جگہ کے گوشت کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہو۔ غالباً جب وہ شلابی کو قتل کر رہا تھا، کلھاڑی کا کوئی وار غلطی سے اس کی اپنی ران پر لگ گیا تھا۔

۱۲

زخم، بلاشبہ، بھر گیا، ایک ڈاکٹر معروف نامی کی کوششوں سے جس نے طب کا علم تجربے سے حاصل کیا تھا۔ وہ ایک معمولی سا حجام تھا لیکن اس کی شہرت بحیثیت ایک جراح کے چار دانگ میں پھیلی ہوئی تھی، اور لوگ کہتے تھے کہ اس کے عورتوں کے سے نرم و نازک ہاتھ کسی اصلی ڈاکٹر سے زیادہ بہتر طور پر علاج کرنے کے اہل ہیں۔

زخم کا مندمل ہونا، اور اس میں میرا حصہ، بذاتِ خود ایک ناول بن سکتا ہے، لیکن اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ اس جھولتے ہوئے پل کے نیچے ہوا جہاں ہم نے الغریب کی صحت یابی تک پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس پل کے نیچے اتنی گنجائش ہوگی اور وہ جگہ اتنی محفوظ ہوگی کہ کسی شخص کے لیے کئی ماہ وہاں یوں پڑا رہنا ممکن ہوگا کہ اوپر سے گزرنے والوں کو پتا بھی نہ چلے، اور نہ یہ کہ میرے لیے یہ غیر متوقع طور پر مسرت آمیز واقعہ ثابت ہوگا، ایک بے حد ولولہ انگیز تجربہ، گویا تم پل کو اپنے کاندھوں پر لیے کھڑے ہو۔ اور وہ سب کتنا عجیب تھا — ایک چھوٹی سی ڈھلان کے دامن میں پانی کو قریب سے بہتے ہوئے محسوس کرنا، ان آوازوں کو سننا جو مٹی اور لوہے کے پل سے گزرتے ہوئے قدموں کی چاپ اور پانی کی نرم گنگناہٹ کے امتزاج سے پیدا ہوتی تھیں۔

میں نے اس کے ساتھ بہت دن وہاں گزارے۔ اپنے گھر اور باہر کی دنیا سے کٹ کر، گویا میں کسی اَور قسم کی زندگی کو جانتا ہی نہ ہوں؛ اور ایسا خود بخود اور فطری طور پر ہو گیا، میرے شعوری فیصلے کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ مجھے صرف الغریب کی صحت یابی کی فکر تھی، اور یہی وجہ تھی میرے زندہ رہنے کی، میرے وجود کی۔ اس زمانے میں ہم ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے۔ میں اس کے تضادات کو قریب سے دیکھ سکتا تھا: کمزوری اور طاقت اس کے اندر ساتھ ساتھ موجود تھے۔ اس کے جسم اور روح دونوں میں غیر معمولی قوت پنہاں تھی، لیکن پھر بھی وہ زخم پذیر تھا اور اذیت سہنے کا اہل۔ وہ کم بولتا تھا لیکن تھا بذلہ سنج، اور اس کے پاس یقیناً معلومات کا وسیع ذخیرہ ہوگا لیکن وہ بتاتا کم تھا۔

اس کے آغازِ صحت کے دنوں کی ایک یاد میرے ذہن میں آج تک روشن ہے۔ جب ڈاکٹر معروف اسے دافع درد انجکشن دینے کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد ہو گیا، وہ پسینے میں تربتر ہو گیا، اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

پہلے تو میں اس کا رویہ سمجھ نہ سکا۔ اور میں نے سوچا کہ یہ اس کے زخم سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کی علامات ہوں گی۔ لیکن پھر ڈاکٹر معروف نے اس سے پوچھا، ''تم ڈر رہے ہو کیا؟'' اور اس نے شدت کے ساتھ انکار کیا، اور میں اس نتیجے پر پہنچا— گو کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا— کہ وہ الغریب جس سے لوگ دہشت کھاتے تھے اور جو کسی کے آگے جھکنا نہ جانتا تھا، وہ بچوں کی طرح انجکشن لگوانے سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ جب معروف نے سوئی لگانے کی کوشش کی تو اس نے تھوڑی دیر رکنے کی التجا کی، اور پھر چلانے لگا کہ وہ اسے سانس لینے کا موقع تو دے۔ کمزوری اس پر اتنی غالب آ گئی کہ وہ ڈر کے مارے تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا اور پھر اچانک ساکت ہو گیا کہ اس کی پشت پل کی دیوار سے جا لگی تھی۔ اس موقعے پر معروف نے زبردستی اس کا بازو پکڑا اور سوئی اس میں بھونک دی۔ اس کے اندر ایک تبدیلی رونما ہوئی اور وہ کسی جنونی کی طرح نظر آنے لگا یا کسی بلی کی طرح جو شدید دہشت کے عالم میں اپنے مقابل پر دانت اور پنجے گاڑنے کے لیے تیار ہو۔ ڈرامائی طور پر میری نظروں کے سامنے وہی وقت پھر گیا جب اس نے شلابی کو قتل کیا تھا: اس کی آنکھیں غیر انسانی طور پر پھیل گئیں اور مدافعتی خوف سے دہکنے لگیں، اور وہ انگلیوں کی پوروں تک مردے کی طرح پیلا پڑ گیا، گویا اس نے دوبارہ کوئی عفریت دیکھ لیا ہو جو اسے نیست و نابود کرنے کے درپے ہو۔ وہ ایک بدہیئت لمحہ تھا جب معروف نے سوئی نکالی اور الغریب اس کی طرف جھپٹا، اور میں نے سوچا کہ وہ اس کا گلا دبا ڈالے گا۔ بجائے اس کے وہ حرکت وہیں ختم ہو گئی، ایک معطل جوش کی طرح۔ اور اس کا عکس ہمارے اطراف پانی میں پڑنے لگا، ایک ٹھہرے ہوئے زندہ منظر کی طرح، پانی کی لہروں میں مرتعش ایک ایسے آدمی کا عکس جو خوف سے وحشی ہو گیا ہو۔

ایک دفعہ جب اس کا درد وقتی طور پر کم ہوا تو میں نے وردہ کے بارے میں اس سے بات چیت کی۔ اس وقت تک وردہ سے میرا کافی واسطہ پڑنے لگا تھا اور مجھے اس سے شدید نفرت ہو چلی تھی، اور اس کے نتیجے میں لامحالہ الغریب سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ جب میں وردہ کی شکایت کرتا تو وہ اس طرح سر ہلاتا گویا اسے اس موضوع سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ مجھ سے یہ بات ہضم نہ ہوتی تھی کہ اس جیسا تجربہ کار آدمی اتنی مستقل مزاجی کے ساتھ وردہ جیسی عورت کے پیچھے لگا ہوا ہو— ایک ایسی عورت کے جو الغریب کے قابل نہ تھی اور جو اس کے اختیار کا کسی طور پر بالکل لحاظ نہ کرتی تھی۔

وہ لیٹا ہوا تھا، ایک پنکھے سے مکھیاں جھلتا ہوا، جو میں نے اسے کھجور کے پتوں سے بنا کر دیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بوکھلایا ہوا اور شرمندہ ہو، اور اپنی صورت حال کی توجیہہ کے لیے اس کو الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ یہ بات واضح تھی کہ وردہ کے لیے اس

تعلق کی کوئی اہمیت نہیں؛ نہ وہ اس کے خطوط کا جواب دیتی اور نہ اس کی التجاؤں پر کان دھرتی۔ ایک دفعہ جب وہ پل کے نیچے الغریب کو دیکھنے آئی تھی تو میرے بے حد اصرار پر، اور یہ جتا کر کہ وہ صرف میری خاطر آئی ہے۔ کاش الغریب کو معلوم ہوتا کہ مجھے اس کی کیا قیمت دینی پڑی۔ وہ بہت دیر تک آنکھیں بند کیے لیٹا رہا، اور جب آخرکار اس نے آنکھیں کھولیں تو کہا کہ بس بہت ہو چکا، اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس تعلق کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا؛ وہ طلاق دے کر وردہ کو اس کے راستے پر چلا جانے دے گا۔ لیکن جس انداز سے اس نے کہا کہ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے"، اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اگرچہ وہ اپنی نیت میں مخلص ہے، لیکن اس کا فیصلہ الفاظ سے آگے کبھی نہیں بڑھ سکے گا۔

اس جیسا، شہرت اور طاقت کا حامل شخص آخر کیوں وردہ جیسی عورت کے پیچھے پڑا ہوا تھا؟ کیا وہ محبت تھی جیسا کہ لوگ کہتے تھے؟ یا وہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ اس کی شخصیت کے چند گوشے ایسے ہیں جہاں اس کا کوئی اختیار نہیں؛ اور عام آدمی کی طرح اس کی بھی حدود ہیں؟

فیصلہ درحقیقت وردہ کی طرف سے کیا گیا: جب میں دوسرے دن اس کے گھر گیا تو وہ وہاں نہ تھی۔ گھر خالی تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ اپنے کپڑوں اور ساز و سامان کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ کہاں؟ یہ کسی کو علم نہ تھا۔

میں نے یہ خبر بچکانہ جوش کے ساتھ الغریب کو سنائی، یہ سوچے بغیر کہ اس بات کا اس پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کے چند گھنٹوں بعد مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئیں گے۔

لیکن ہم کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔ زخم اب بھر چلا تھا اور اس کی بو قابل برداشت ہو گئی تھی؛ اور الغریب نے کسی حد تک اپنی خود اعتمادی اور قوت بحال کر لی تھی اور دن میں مچھلیاں پکڑنے سے دل بہلانے لگا تھا۔ اس دوران میں ایک مسئلے پر غور کرتا رہا اور اس کا سامنا کرنے کے لیے رات کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اپنی زندگی پر تنقیدی نظر ڈالی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں سیڑھیوں پر کھڑا محوِ رقص تھا، نہ اوپر جاتا تھا اور نہ نیچے اترتا تھا: نہ میں الغریب کے آدمیوں جیسا بن رہا تھا اور نہ اپنی روزمرہ کی زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ میں اپنا گھر چھوڑ چکا تھا، پلٹ کر نگاہ تک نہ ڈالی تھی، اور اپنے خوابوں کی تکمیل کی آرزو میں خود کو الغریب سے منسلک کر لیا تھا؛ لیکن اب تک جو ہوا وہ بس یہ تھا کہ دونوں چیزیں—— میرے خواب اور میری معمول کی زندگی—— مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں، اور میں محض ایک غلام کی سی زندگی گذار رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا اور بے صبری سے مناسب لمحے کا انتظار کرنے لگا جب میں اپنا فیصلہ اس پر آشکار کر سکوں۔

آخرکار کڑے انتظار کے بعد رات آئی۔ ہم نے شام کا کھانا ختم کیا اور ہمارے اردگرد ہر شے نے تاریکی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ میں نے الغریب سے پوچھا کہ کیا میں اس سے ایک بات کر سکتا ہوں۔ اس کو

فطری طور پر احساس ہوگیا کہ وہ کوئی ایسی بات ہے جس کا میں مزید متحمل نہیں ہوسکتا۔ انتہائی توجہ کے ساتھ اس نے میری بات سنی اور مجھے اس بات کا موقع دیا کہ پہلے میں اِدھراُدھر کی باتیں کر کے اپنی بے چینی کو کم کرلوں اور پھر سکون سے اصل بات پر آؤں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں چاہتا ہوں وہ اپنا وعدہ پورا کر کے مجھے اس آرزو کی تکمیل میں مدد دے جس کی وجہ سے میں نے اپنی معمول کی زندگی ترک کر کے اس کی شاگردی اختیار کی تھی۔ وہ سنتا رہا، لیکن پھر — جیسے وہ جانتا نہ ہو — اس نے پوچھا کہ آخر میری آرزو کیا ہے۔ میں نے کہا:

''تم جانتے ہو میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کسی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو جاؤ، اور قتل کر دو کسی کو۔''

''میں نہیں جانتا کیسے کروں، جب تک تم مجھے نہ سکھاؤ۔''

''تمھیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ قتل کس طرح کیا جاتا ہے۔ اگر تم کسی کو قتل کرنا چاہتے ہو تو بس تم قتل کر دیتے ہو۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ پھر اس کوشش میں ہے کہ مجھے اس سے باز رکھے؛ اور میں اپنے آپ کو مضبوط کر کے ہر چیز کے لیے تیار ہوگیا۔ میں نے، سنجیدہ لہجے میں، جو کچھ پہلے کہا تھا اس کو دہرانا شروع کیا، اور اس سے کہا کہ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے میں میری مدد کرے؛ اور میں نے یہ بات اس پر واضح کر دی کہ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ مجھے سنجیدگی سے نہیں لے رہا ہے، میرا انداق اڑا رہا ہے اور مجھے صرف اس لیے رکھے ہوئے ہے کہ میں دوڑ دوڑ کر اس کی خدمت کرتا رہوں۔

وہ تاسف میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور پھر کھول دیں۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم رات کے فرزند بننا ہی چاہتے ہو تو وہ کام کرو جو وہ اب تک نہ کر سکے — مجھے قتل کر دو۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ تم یہ کام کمشنر سے زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے ہو۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔ جیسا کہ سعد زاغلول نے کہا تھا، بس بہت ہو چکا۔ مجھے قتل کر دو، اور تمھارا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہ جائے گا، ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے الغریب کو ٹھکانے لگایا۔''

اگر میں نے یہ محسوس نہ کیا ہوتا کہ وہ یہ بات کہتے ہوئے انتہائی سنجیدہ ہے تو شاید میں اپنا غصہ برداشت نہ کر پاتا اور اسی وقت اٹھ کر چلا جاتا۔ حقیقت یہ تھی — مجھے اقرار کرنا پڑے گا — کہ میں نے اس کی اس تجویز پر لمحہ بھر غور کیا۔

میں نے مایوسی سے سر ہلایا اور ایک جھنجھلاہٹ بھری خاموشی میں ڈوب گیا؛ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔

لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے نرمی سے تھپتھپائے، بالکل ایسے جیسے وردہ چھوا کرتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ناراض نہ ہو۔ میں تمھیں کسی کو قتل کرنے دوں گا، اگر تم یہی چاہتے ہو۔ اور تم کو سند بھی مل سکتی ہے جو یہ ثابت کر دے کہ تم اس امتحان میں پورے اترے ہو۔ لو، یہ رہی بندوق۔ جو بھی پہلا شخص اس پل پر سے گذرے، کسی بھی جانب سے، تم اسے گولی مار دو گے۔''

میں خوشی سے اچھل پڑا اور پل کے آہنی شہتیر سے تقریباً ٹکرا کر، تکلیف سے چلایا:

''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''اگر تمھیں یقین ہے کہ تمھارا مطلب وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو تو میں سنجیدہ ہوں۔ میں تم سے خوش تھا، بالکل اس طرح جیسے تم میرے بیٹے ہو، کیونکہ تم شریف ہو، پڑھے لکھے ہو، اچھے طور طریقوں کے مالک ہو، اور سمجھ سکتے ہو کہ یہ سب کیا ہے۔ میں تمھارے جیسا ہونے کی کوشش کر سکتا تھا، یا اپنے بیٹے کو تم جیسا بنانے کی آرزو کر سکتا تھا؛ لیکن اگر تم مجھ جیسا بننا چاہتے ہو اور اسکول کا طالب علم رہنے سے مطمئن نہیں ہو تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ بات کافی آگے جا چکی ہے۔ اب یا تو تم پہلے راہ گیر کو قتل کرو گے یا میں تمھیں قتل کروں گا۔ اور میں شریف آدمی نہیں ہوں۔''

۱۳

پھر یوں ہوا کہ ہم پل کے نیچے سے نکل آئے اور رینگتے ہوئے اس دیوار تک پہنچے جو پل کے کنگورے سے متصل تھی۔ میرے پاس اطالوی مشین گن تھی اور ہم دونوں تقریباً جھک کر مستعد ہو گئے۔ ہماری آنکھیں تلاش میں اندھیرے کو چیرنے لگیں، کیونکہ چاند اب تک نہ نکلا تھا: اور ایک ایسے لہجے میں جو میرے لیے بالکل نیا تھا، الغریب نے سرگوشی میں کہا:

''جب تم اسے آتا ہوا دیکھو تو سب کچھ بھول کر اپنی توجہ اس پر مرکوز کر دو۔ نشانہ اس وقت تک نہ لو جب تک وہ تمھارے قریب نہ آ جائے، اس درخت کی سطح پر۔ نشانہ لیتے وقت اپنی سانس روکو۔ اور نشانہ اس کے سینے کے درمیان کا لو، اور پھر لبلبی دبا دو۔ جھجکو مت، ورنہ وہ تمھیں قتل کر دے گا۔ اسے مسلح جانو، اسے مار دو، یا مرنے کے لیے تیار رہو۔ اگر تمھارے اعصاب جواب دینے لگیں تو یہ تصور کرو کہ یہ وہ شخص ہے جس نے تمھارے باپ کو قتل کیا ہے۔ خواہ تمھارا باپ زندہ ہو، یہ فرض کرنا لازم ہے۔ اگر وہ پہلی دفعہ میں نہ گرے تو فوراً دوسری گولی چلا دو، اور پھر ایک اَور۔ اور اگر وہ گر پڑے تو پھر سے نشانہ لے کر ایک بار پھر گولی چلاؤ، اس کو بالکل ختم کرنے کے لیے۔''

زندگی میں پہلی دفعہ میں نے خود کو سکھائے جانے والے سبق کے لیے مکمل طور پر ہمہ تن گوش پایا۔ جو کچھ مجھے بتایا جا رہا تھا، میں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر کے اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ میری ہر پور، ہر سانس یہ سمجھ رہی تھی کہ آنے والے لمحے میں اسے کیا کرنا ہے۔ میں پیش آنے والے واقعے کی سنگینی میں پوری طرح ڈوب گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک سرور میں آ گیا: آخر کار میں ان کے راز پانے والا تھا، انھیں سیکھ رہا تھا، کیونکہ میں نے مطلوبہ نمبر حاصل کر لیے تھے۔ اگر الغریب کو مجھ پر اور میری صلاحیتوں پر اعتماد نہ ہوتا تو وہ کبھی اس بات پر راضی نہ ہوتا کہ میں اس طرح اس کا شاگرد بن جاؤں۔

اب وہ میرے برابر دوہرا ہوا بیٹھا تھا اور اس کی آواز اور جسم کی حرکات نے اس کی دوسری شخصیت کے خدوخال ڈھالنے شروع کر دیے تھے: قاتل الغریب، حملے کی تیاری کرتا ہوا۔ لیکن جس چیز پر میری نظر پڑی اور جسے دیکھ کر ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا اور جس نے میرے سرور کو خوف میں تبدیل کر دیا، وہ اس کا ہاتھ تھا جو اس کے کپڑوں کے اندر چھپی ہوئی کلھاڑی کو گرفت کیے ہوے تھا — وہی کلھاڑی جس نے شلابی کی کھوپڑی کھول دی تھی، اب میرے انتظار میں تھی، اگر میں اپنے مشن میں ناکام رہا۔

میں نے اچانک محسوس کیا کہ اس تمام اثنا میں، ان تمام دنوں میں میں اپنے خوابوں میں رہتا رہا تھا، ایک دوسری دنیا میں؛ اور اب وہ وقت آ چکا تھا، وہ لمحہ سر پر آن پہنچا تھا، جب مجھے اپنے جسم کو بھی خوابوں کی سرزمین میں لانا تھا۔ خواب دیکھنا اَور چیز ہے اور اپنے جسم کو خواب کا حصہ بنانا ایک دوسری چیز۔ اور جب زندگی کا دارومدار ہی اس پر ہو تو کیا ہو؟

اس نے کہا، ''یہ لو!''

وہ ایک بیڑی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس کے سامنے تمباکو نوشی سے انکار کیا تھا، لیکن اس وقت بیڑی میں نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لی، اس کو سلگایا اور ہم مردوں کی طرح کش لگانے لگے، اور میں خود کو مردوں کی طرح محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا، ''جب یہ کام ہو جائے گا، ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر آنکھوں میں چمک لیے میری طرف مڑا۔ ''شاید تم خوش قسمت نکلو اور کوئی امیر شکار حاصل کر لو۔ خیر جو بھی ہو، جب تم اپنا کام کر چکو تو اس بات کا اطمینان کر لینا کہ بندوق تمھارے پاس ہے۔ اس کی تلاشی لینا، جو کچھ ہاتھ لگے رکھ لینا اور چلتے بننا۔ اور اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں اس کی تلاشی لیتے وقت تم خود اپنی کوئی چیز نہ گرا بیٹھو۔''

میں نے پُراعتماد نظر آنے کی کوشش میں سر ہلایا۔

وقت رینگ رہا تھا، اور ہم نے اپنے نامعلوم شکار کی جھلک کے انتظار میں دور فاصلے پر نظریں گاڑ

رکھی تھیں۔ جوں جوں انتظار طویل ہوتا گیا، میرا ذہنی دباؤ ہر گذرتے ہوے لمحے کے ساتھ بڑھنے لگا یہاں تک کہ میری برداشت سے باہر ہو گیا؛ اور میرے جذبات کا لاوا ابلنے لگا۔ میں کھڑا ہونے ہی والا تھا، چیخنے ہی والا تھا، کہ مجھے اپنے بازو پر اس کے چھوٹے سے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔

''صبر! انتظار کرو۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ اپنے جذبات، اپنی کیفیت کو بالکل فراموش کر دو۔ تمھیں سائیکل چلانا سکھاتے وقت کیا بتایا گیا تھا؟ کیا انھوں نے نہیں کہا تھا کہ سیدھے سڑک پر دیکھو، اپنے سامنے۔ یہ لازم ہے کہ تم اپنے اندر اپنی ذات میں نہ جھانکنے لگو، ورنہ تم بازی ہار جاؤ گے۔ صرف آنے والے پر توجہ مرکوز رکھو۔''

اس کے الفاظ نے کچھ اثر کیا؛ دباؤ کم ہوا، میں پرسکون ہو گیا، اور ایک بار پھر سامنے نظریں جما دیں۔

چاند نکلا۔ پہلے پہل اس کی روشنی مشرق سے نکلتے ہوے سورج کی طرح تھی لیکن پھر وہ جیسے جیسے آسمان پر چڑھتا گیا— گول لیکن نامکمل— اس کی روشنی سفید ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ کر اس طرح لٹک گیا گویا دنیا کی چھت پر کوئی بلب لگا ہوا ہو۔ اب جب کہ رات کا سورج نکل آیا تھا اور مکمل تاریکی کی جگہ نامکمل روشنی نے لے لی تھی، ہمیں پل پر سے جاتی ہوئی اور پل سے آگے نکلتی ہوئی سڑک دکھائی دینے لگی، اور آدھی روشنی میں نہائے ہوے دور کے کھیت اور قریب کی فصلیں نظر آنے لگیں۔ ہم اپنے اردگرد دیکھتے رہے، ہر تبدیلی کا غور سے جائزہ لیتے رہے؛ اور تب ہمیں اپنی طویل شبِ انتظار کا پھل ملا، اور ایک نقطہ مکمل سکوت کے درمیان حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔

میرے دل نے اتنی تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا، ایک تیز دھپ دھپ کی آواز جو کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی۔ اس کے فوراً بعد ایک اور آواز آنے لگی— بہت دور اور مدھم لیکن لامحالہ کسی کے گانے کی آواز— اور پھر میرا دل وحشیانہ طور پر دوبارہ دھڑکنے لگا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ایک سال کا عرصہ ہو جس عرصے میں چاند کی دن جیسی روشنی کے افق پر اس آواز کا مالک نمودار ہونا شروع ہوا۔ ابتدا میں وہ ایک سفید سا ساکت نقطے کی طرح نظر آیا، پھر حرکت کرتا ہوا، اور پھر کوئی ایسی مخلوق دکھائی دیا جس کا اوپر کا حصہ سفید تھا اور نیچے کا سیاہ۔ پھر یہ واضح ہوا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو کسی جانور پر سوار تھا اور گا رہا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ الغریب کچھ کہے، لیکن اس نے میری خاموش التجا پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا، اس وقت بھی نہیں جب میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ نہیں سنا؛ لیکن اس کی آنکھیں اس متحرک ہدف پر گویا کسی تار سے بندھی ہوئی تھیں، اور اس نے کلھاڑی

پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی تھی۔

میں نے مڑ کر اس آدمی کو دیکھا، اس نمکین پسینے کے پار جو میری پیشانی پر بہہ کر میری آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ میں نے پسینہ پونچھا اور اس شخص پر نظریں جما دیں؛ میرا اس وقت تک نشانہ باندھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا جب تک وہ درخت کی سطح تک نہ آ جائے۔

لہٰذا میں نے بندوق کی نالی کے اوپر سے اس کے جانور کی حرکت پر نظر رکھی اور پوری کوشش کے باوجود میں وہ لوک گیت سننے لگا جو وہ گا رہا تھا۔ اس کی آواز اچھی نہ تھی، اور نہ ہی گیت کے بولوں سے لگا کھاتی تھی، لیکن وہ ایک اونچی، بھرپور آواز تھی ۔ وہ گا رہا تھا: ''اے رات...'' گویا اس نے خود کو رات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو اور اس سے التجا کر رہا ہو کہ اسے تمام شر سے محفوظ رکھے۔ اور جب اس نے گایا: ''اے آنکھو...'' تو میں نے تصور کیا کہ وہ اپنے آپ پر رو دیا ہے، کہ رات نے اس کی نہیں سنی۔ گانے میں محبوب کے باغ کا ذکر تھا جہاں خوبانی، انار اور نرگس کے پھول اگے ہوئے تھے اور کس طرح وہ اس باغ میں داخل ہونے اور پھل توڑنے جا رہا تھا۔ مجھے اس شخص کے اور جانور کے بیچ کوئی شے نظر آنے لگی: ایک بوری، جس میں یقیناً آٹا ہوگا؛ اور میں نے جان لیا کہ اسے چکی سے واپسی پر دیر ہوگئی ہے۔

اس اثنا میں الغریب ناقابلِ یقین حد تک غیر انسانی طریقے سے خاموش رہا، خاموشی جو اتنی گمبھیر، اتنی یقین دلانے والی تھی گویا اسے جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ہو، تاکہ مجھے یوں محسوس ہو کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے؛ صرف رات میری رفیق ہے۔ اس خیال کے ساتھ کہ اب میں آزاد ہوں، الغریب کی موجودگی اور اس کی کلھاڑی سے آزاد، اور جو چاہوں کروں، مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی بوجھ مجھ پر آن گرا ہو۔ میں خوفزدہ نہ تھا اور نہ کسی دباؤ میں تھا؛ جب بھی نظر چرا کر الغریب کو دیکھتا اور اسے قبر کی سی خاموشی میں گم پاتا، مجھے یقین ہونے لگتا کہ میں آزادانہ عمل کر رہا ہوں۔ میں اس صورت حال پر پوری طرح مختار تھا۔ میں مسلح تھا۔ رات اور حیرانگی کے عناصر میری طرف تھے۔ پہلی دفعہ میں نے شاگردی کے جامے اور چیلے کی ذہنیت کو اتار پھینکا اور خود کو واقعتاً رات کا فرزند تصور کرنے لگا جو عمل کی قوت رکھتا ہے۔

اس اعتماد کی موج میں رواں، میں نے اپنے ہدف کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس شخص اور اس مخصوص درخت کے درمیان اب صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کی آواز صاف اور واضح تھی اور گانے کے بول متناسب اور پختہ۔ شاید وہ گیت جو اس نے خوف کے زیر اثر شروع کیا تھا اپنا کام دکھا چکا تھا اور اس نے اسے دنیا سے ہم آہنگ کر دیا تھا؛ گیت اب انبساط سے لبریز تھا گویا وہ گیت کے لیے گا رہا ہو۔ وہ گا رہا تھا: ''اے رات...'' رات کی تاریک شان و شوکت کی تعریف میں، اور: ''اے آنکھو...'' ان آنکھوں کی بدقسمتی پر جو محوِ خواب تھیں اور رات کے حسین نظارے سے محروم تھیں۔

ایک منٹ کے اندر اندر مجھے اس شخص کو ختم کرنا تھا جو نغمے کے سرور اور گائیکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بندوق کی نالی اس کی پیش قدمی پر نظر رکھے ہوئے تھی، اور جیسے ہی وہ درخت کی سطح پر آتا، مجھے نشانہ لینا تھا، اور گولی چلانی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ ''مجھے قتل کرنا تھا''، اور اُس وقت ''قتل'' صرف ایک لفظ تھا میرے لیے۔ اب اس کے اردگرد نہ کوئی ہالہ تھا اور نہ کوئی کشش۔ وہ صرف ایک خالص عملی کارگذاری تھی جس کے لیے مجھے اپنی سانس روک لینی تھی، نشانہ لینا تھا، اور پھر داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ہلکی سی حرکت کے ساتھ لبلبی دبانی تھی۔

وہ شخص کافی نزدیک آ چکا تھا، اور اس کے اور درخت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

میں نے سانس روک لی اور اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرنے لگا کہ میرے ہاتھ میں دنیا بھر کا سیسہ بھر گیا ہے تا کہ اس کا ہلکا سا ارتعاش تک روک لوں اور اس کے سینے کو نشانہ بنائے رکھوں۔ میں یہ تصور کرنے لگا کہ میرا باپ اسی رات کو قتل ہوا ہے اور یہ شخص میرے باپ کا قاتل ہے جو جائے واردات سے لوٹ رہا ہے۔ لبلبی پر ایک ہلکے سے دباؤ سے سب کچھ تمام ہو جائے گا؛ میں رات کی سلطنت میں اس کے سب سے خوفناک دروازے سے اندر داخل ہو جاؤں گا۔ ایک معمولی سی حرکت، ایک ہلکا سا دباؤ۔

اس کے بعد میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا۔ مجھے جو کچھ یاد ہے وہ چاند کی روشنی تھی اور اس شخص کا حیرت انگیز طور پر اجلا سفید جلابیہ، اور اس کا گیت جو اتنا خوبصورت لگ رہا تھا کہ اس نے درخت کی چوٹیوں پر بیٹھے پرندوں کو اسے سننے پر تقریباً مجبور کر دیا تھا۔ اور اس کا وہ احساس— دنیا سے اور اپنے آپ سے ہم آہنگی کا احساس— جو اس کے ساتھ رہا، درخت کی سطح تک آ جانے اور اس سے آگے نکل جانے کے بعد بھی۔ سب کچھ مختلف ہوتا، میری زندگی آج کسی اَور ڈگر پر ہوتی، اگر اس شخص نے ذرا بھی خوف کا مظاہرہ کیا ہوتا، اگر وہ گیت گاتے گاتے چپ ہو گیا ہوتا، یا اگر اس نے خطرے کی بو سونگھ لی ہوتی، یا شاید اگر میں نے زیادہ پُراثر طور پر تصور کیا ہوتا کہ اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے، یا ہم دونوں کے اختیار سے باہر کوئی واقعہ ہوا ہوتا، یا کوئی ایسی بات پیش آئی ہوتی جس سے اس کے اردگرد تنی ہوئی، اس کے ساتھ ساتھ چلتی، شر کے اثر کو کاٹتی ہوئی اس ناقابلِ تسخیر دیوار میں کوئی دراڑ پڑ جاتی۔ میں آج تک نہ جان سکا کہ میری انگلی نے وہ معمولی سی حرکت کیوں نہ کی اور لبلبی کیوں نہ دبائی۔ میرے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ وہ آواز جو میری روح کی گہرائیوں سے، میری انگلیوں کی پوروں سے، میرے بالوں کی جڑوں سے نکلی، اور وہ آواز میں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ نہ کبھی اس کے وجود پر غور کیا تھا، اور نہ کبھی یہ سوچا تھا کہ عین موقعے پر میرے اندر کی آواز مجھے حکم دے گی: ''تم یہ نہیں کرو گے۔''

ہر وقت بے سوچے سمجھے ہم دوسروں پر پابندیاں لگاتے ہیں اور یا تو ان کو قبول کر لیتے ہیں یا مسترد کر دیتے ہیں؛ لیکن اپنے آپ پر پابندی لگانے کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا، اور اس آواز نے مجھے بالکل منتشر کر دیا۔ یہ کیوں کر ہوا؟ یہ خیال مجھے اب تک الجھن میں ڈال دیتا ہے۔

میرے جسم کے ہر حصے سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ میری ہتھیلی اور میری اسی انگلی کی پور میں چھوٹے چھوٹے سمندر ابھرنے لگے جو اس تمام کارروائی میں مرکزی کردار ادا کرنے والی تھی۔ بندوق تقریباً میری گرفت سے نکل گئی، اور میں نے جتنی مرتبہ لبلبی دبانے کی کوشش کی، میری انگلی پھسل جاتی رہی۔ میرا پسینہ بھی بلاشبہ میرے ارادے کی کمزوری کا مظہر تھا، وہ قوتِ ارادی جس کو میں نے اپنے اندر کی آواز کے خلاف طلب کرنے کی کوشش کی۔ اس آواز پر لعنت بھیجتے ہوے، اس پر جھنجھلاتے ہوے، اس کے مآخذ کو تلاش کرتے ہوے جس نے میری قوت ارادی کو ہوا میں تحلیل کر دیا تھا، اور میرے جسم کے ہر حصے کو، انگلیوں کے ایک ایک جوڑ تک کو مفلوج کر دیا تھا۔

آخرکار میں نے اس آواز کے مآخذ کو پہچان لیا: وہ شخص — اونچی آواز میں گاتا ہوا، اپنے اردگرد کی دنیا کا آقا۔ بظاہر اس کو شر کے وجود کی بِھنک بھی نہ ہوئی تھی ۔ اور اس کی جھلک نظر آتے ہی — اس کا صافہ اور سفید جلابیہ اور اس کی آٹے کی بوری — مجھے محسوس ہوا کہ اس کے اور میرے درمیان جو فاصلہ تھا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ میں اس کے گیت کے بولوں کو سمجھ رہا تھا، مجھے اس میں معنی نظر آ رہے تھے، اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ میرے لیے نغمہ سرا ہو: شاید مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے۔ جانور کی پشت پر اس کی چھڑی اور گیت کی تال کے ساتھ اس کا رکاب میں پیر ہلانا اور اس کے گلے کی ہر گونج، میرے لیے ایک تحکمانہ فرمان تھی: ''تم یہ نہیں کرو گے۔'' آخر میں اس کی ہر جنبش، جس سے اس کے انسان ہونے کا ثبوت ملتا تھا، میرے اندر یہی ردِعمل پیدا کرنے لگی، یہاں تک کہ وہ انداز بھی جو نوعِ انسان کے لیے مخصوص ہے — جس طرح وہ سواری کی پشت پر گردن تانے بیٹھا تھا — ان تمام اثرات نے میرے اندر اکٹھا ہو کر اس کے اطراف ایک ناقابلِ تسخیر مدافعت پیدا کر دی اور وہ اس طرح حرکت کرتا ہوا نظر آنے لگا گویا ایک مقدس حصار میں ہو، وہ حصار جو پھیل کر بالآخر مجھے چھو رہا تھا اور جس نے مجھے منجمد کر دیا تھا — یہ سب کچھ مجھ پر اس حد تک اثرانداز ہوا کہ جب وہ پل پر بال بھر کے فاصلے پر تھا اس کی نظر ہم پر پڑی؛ اس نے سلام کیا؛ بندوق میری گرفت سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی اور میں نے خود کو جواب دیتے ہوے پایا: ''وعلیکم السلام۔''

جب وہ ہمارے عین متوازی ہوا تو اس نے معافی چاہی کہ سواری سے اتر کر سلام کرنے کے بجاے وہ اس پر بیٹھا ہوا گذر رہا ہے۔ ایک آواز — جس کو میں یکسر بھلا چکا تھا — میرے قریب سے

آئی: ''سلام۔کوئی بات نہیں۔''

میں نے تمام تفصیل سے اپنے مقدر کو یاد کیا جو میرا منتظر تھا۔عجب بات یہ تھی کہ میں بے خوف تھا اور مکمل بے اعتنائی سے مرنے کے لیے تیار تھا۔

۱۴

لیکن الغریب نے مجھے قتل نہیں کیا اور نہ اس شخص پر حملہ کیا۔میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوے بولنا شروع کیا لیکن اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔''اس کی کوئی ضرورت نہیں...کلھاڑی تمھارے لیے تیار تھی، یہ حقیقت ہے۔'' میں نے پوچھا، پھر اس نے استعمال کیوں نہ کی۔ مجھے تعجب ہوا جب اس نے کہا کہ وہ کلھاڑی صرف اس وقت استعمال کرتا اگر میں نے اس شخص کو قتل کیا ہوتا۔اس بات نے مجھے حیران کر دیا اور میں اسے سننے پر مجبور ہو گیا، گو کہ اس نے کچھ زیادہ کہا نہیں۔جو کچھ اس نے کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ گو وہ خود جرائم اور قتل و غارت میں سر تک ڈوبا ہوا تھا، اگر میں چاہتا بھی تو وہ مجھ کو اس راستے پر جانے نہیں دے سکتا تھا۔میں اگر ایک دفعہ قتل کر بیٹھتا تو پھر پیچھے مڑ کر دیکھنا بے کار تھا؛ میں اس کی طرح بن جاتا اور ایک المناک زندگی گذارتا جیسی اس نے گذاری: خود مدافعتی میں، دوسروں کی زندگیاں برباد کر کے، خود اذیت میں مبتلا اور دوسروں کو اذیت پہنچاتے ہوے، ان سے شدید نفرت کرتے ہوے اور ان کی شدید نفرتوں کا نشانہ بنتے ہوے۔اور آخر میں میں شلابی کی طرح غدار ہو جاتا۔اگر میں عزت اور اعتماد کے ساتھ لوگوں سے پیش آتا تو مجھے اپنی جان کی قیمت ادا کرنی پڑتی۔اور اگر میں ہر شخص پر شک و شبہ نہ کرتا، خواہ وہ کتنے ہی سچے اور پرخلوص کیوں نہ ہوں، تو میں کہیں کا نہ رہتا۔

''یہ ایک بھیانک زندگی ہوتی ہے جب تم کسی پر بھروسا نہیں کرتے اور کوئی تم پر اعتماد نہیں کرتا۔نہ تم کسی کی بات کا یقین کرتے ہو اور نہ کوئی تم پر یقین کرتا ہے۔اس سے بہتر ہے کہ تم مر جاؤ؛ مگر المیہ یہ ہے کہ تم خود اپنی جان نہیں لے سکتے۔تم جتنے لوگوں کو چاہو قتل کر سکتے ہو لیکن تم خود کو ختم نہیں کر پاتے۔اس وجہ سے میں تم پر ترس کھا کر تم کو قتل کر دیتا۔بس میری خواہش ہے کہ کاش میری کبھی ایسے شخص سے ملاقات ہو جائے جو مجھ پر یہ مہربانی کر سکے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا، چاند کو گھورتا رہا اور پھر گویا خود سے مخاطب ہو کر بولا:

''اگر تم اسے قتل کر دیتے تو کم از کم مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ اب تم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔اگر کوئی ایک دفعہ قتل کر بیٹھے تو وہ اس مادہ بھیڑیے کی طرح ہو جاتا ہے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے، پاگل کتے کی طرح جو بلا تخصیص ہر ایک پر جھپٹ پڑتا ہے، چاہے وہ اس کے دوست اور ساتھی ہی کیوں نہ ہوں۔کچھ اور

نہیں تو تم میری مخبری ہی کر دیتے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور بندوق مجھ سے لے لی، اس کا معائنہ کیا اور پھر بولا:

"یہ بات واضح ہے کہ اب مجھے بیدار ہونا ہوگا۔ ورنہ میں تم کو اسی گڑھے میں لے جاؤں گا جس میں خود پڑا ہوا ہوں۔ میں نے اب تک تم پر بہت زیادتی کی ہے۔ اس تمام دوران میں یہ امید کرتا رہا ہوں کہ ایک دن میں اپنی آنکھیں بند کرلوں گا اور جب انھیں دوبارہ کھولوں گا تو خود کو تمھارا باپ اور تمھیں اپنا بیٹا پاؤں گا۔ لیکن ظاہر ہے تمھارے حقیقی باپ کو مجھ پر ترجیح حاصل ہے۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں بوکھلا گیا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا میں اس میں غرق تھا اور اس کے آخری الفاظ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا اور اس کی آواز فیصلہ کن اور واضح تھی، کسی ہچکچاہٹ اور رحم کی جھلک سے مبرّا۔ میں پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے اسے دیکھا اور اس نے مجھے جواب میں جامد، سخت سرد اور درشت نگاہوں سے گھورا۔ "جاؤ۔ بھاگو۔ اور بھاگتے رہو جب تک گھر نہ پہنچ جاؤ۔"

ایک بھیانک دھماکا ہوا اور گرم ہوا کا ایک جھونکا میرے کندھے کے بالکل اوپر سے، تقریباً کان کو اڑاتا ہوا گذر گیا۔ جب میں اپنے حواس میں آیا تو سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ دور فاصلے پر ایک اور دھماکا ہوا اور میرے سر کے اوپر سے گولیوں کی ایک باڑھ ہوا میں سوراخ کرتی ہوئی گذری۔ لیکن میں نے ہمت کر کے، دوڑتے دوڑتے مڑکر الغریب پر ایک نظر ڈالی— یہ جانتے ہوئے کہ یہ اس کی آخری جھلک ہے۔ شاید وہ میرا واہمہ ہو لیکن مجھے یوں لگا گویا میں ساکت ہوں اور وہ بھاگ رہا ہے۔ وہ بے حد بوڑھا نظر آ رہا تھا؛ اس کے کندھے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ اس کا منحنی سا ہیولا رات میں اترتا جا رہا تھا، اس کی گہرائیوں میں ڈوبتا اور سیاہی کے ساتھ مدغم ہوتا ہوا، تاریکی میں جو پیچھے ہٹ رہی تھی، صبح کی روشنی سے پسپا ہو رہی تھی۔

یوسف ادریس

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کرسی بردار

آپ خواہ اس پر یقین کریں یا نہ کریں، لیکن یہ کہنے پر مجھے معاف فرمایئے گا کہ آپ کی رائے میرے نزدیک ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ میں نے اُسے دیکھا، اُس سے ملا، اُس سے بات کی اور اپنی آنکھوں سے کرسی کا مشاہدہ کیا۔ اس سے مجھے یقین ہوا کہ میں ایک معجزہ دیکھ رہا ہوں۔ لیکن معجزے سے بڑھ کر حیران کن — بلکہ تباہ کن — بات یہ ہے کہ اس شخص، اس کرسی اور اس واقعے نے میدان الاوبرا، شارع جمہوریہ میں، یا پورے قاہرہ میں، یا تمام دنیا میں، کسی اَور راہگیر کو ایک لمحے کے لیے رکنے پر بھی مجبور نہ کیا۔

یہ ایک بہت بڑی کرسی تھی۔ اسے دیکھ کر آپ کو گمان ہوا ہوتا کہ یہ کسی اور دنیا سے آئی ہے، یا یہ کہ کسی بہت بڑے جلسے کے لیے اس عظیم الشان کرسی کو خاص طور پر تیار کیا گیا ہے؛ چیتے کی کھال اور ریشمیں تکیوں سے ڈھکی ہوئی وسیع و عریض نشست کے ساتھ یہ اپنے آپ میں ایک ادارہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک بار اسے دیکھ لینے کے بعد آپ کی عزیز ترین خواہش یہ ہوتی کہ اس پر بیٹھ سکیں، ایک بار، صرف ایک لمحے کے لیے ہی سہی۔ کرسی متحرک تھی، شاہانہ وقار سے آگے کی سمت یوں حرکت کر رہی تھی گویا کسی مذہبی جلوس میں چل رہی ہو۔ آپ کو خیال ہوتا کہ کرسی خود بخود حرکت میں ہے۔ استعجاب اور ہیبت میں آپ اس کے سامنے سجدے میں گر پڑتے اور اس پر قربانیوں کی نذریں گذارنے لگتے۔

لیکن بالآخر مجھے کرسی کے جسیم، چمکتی دھات کی نعلوں جڑے پایوں کے درمیان ایک پانچویں پائے کی جھلک نظر آئی۔ یہ پایہ باقی چار کے مقابلے میں بے حد پتلا تھا اور جسامت اور شان وشکوہ کے اس مظہر کے درمیان عجیب اور بے محل لگ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ کوئی پایہ نہیں بلکہ ایک نحیف ونزار انسان تھا جس

کے بدن پر پسینے کے بہتے رہنے سے موریاں اور نالیاں سی بن گئی تھیں اور سر پر بالوں کے جنگل اگ آئے تھے۔ مجھ پر یقین کیجیے، میں کسی بھی متبرک چیز کی قسم کھانے کو تیار ہوں، میں نہ جھوٹ بول رہا ہوں اور نہ مبالغہ کر رہا ہوں؛ میں تو صرف ان گھڑ طریقے سے وہی بیان کر رہا ہوں جو میں نے دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ دبلا پتلا، کمزور آدمی ایسی عظیم الجثہ کرسی کو اٹھائے لیے جا رہا ہو جس کا وزن زیادہ نہیں تو ایک ٹن تو ضرور ہی ہوگا؟ ذہن میں اس کی ایک ہی توجیہہ آتی تھی: یہ کسی طرح کی شعبدہ بازی ہے۔ لیکن آپ تھوڑی دیر تک اور ذرا قریب سے اس کا مشاہدہ کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس میں کوئی فریب نہیں، کہ آدمی نہ صرف اس کرسی کو واقعی اٹھائے ہوئے ہے بلکہ اسے لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔

جو بات اس سے بھی زیادہ غیر معمولی اور پر اسرار، اور واقعی بے حد چونکانے والی تھی، وہ یہ کہ میدان الاوبرا، شارع جمہوریہ میں، بلکہ پورے قاہرہ میں، ایک بھی راہگیر ایسا نہ تھا جسے اس بات نے حیران کیا ہو یا جس نے اس واقعے کو ذرا بھی غیر معمولی سمجھا ہو؛ وہ سب اسے ایسی عام سی، معمول کی بات سمجھ رہے تھے گویا یہ کرسی نہیں بلکہ کوئی تتلی ہو جسے کوئی چھوٹا سا لڑکا لیے چلا جا رہا ہو۔ میں نے لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر کرسی اور اس آدمی پر نظر ڈالی، یہ سوچ کر کہ شاید میں کسی اٹھتے ہوئے ابرو یا حیرت سے دبے ہوئے ہونٹ کی جھلک پا سکوں، یا استعجاب کی ہلکی سی چیخ سن سکوں، لیکن کسی ردعمل کا کوئی نشان نہ پایا۔

مجھے یہ تمام معاملہ اس قدر ہولناک محسوس ہونے لگا کہ مزید ایک لمحہ اس پر نظر جمائے رکھنا دشوار ہو گیا۔ عین اس لمحے اس عظیم بوجھ کو اٹھائے ہوئے وہ آدمی مجھ سے ایک آدھ قدم کی دوری پر تھا، اور میں جھریوں کے باوجود اس کے چہرے کی نیک باطنی کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس کی عمر کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ تب میں نے اس کے جسم پر نظر ڈالی: وہ کمر میں بندھی ہوئی ڈوری اور آگے پیچھے اس پر سے لٹکتے ہوئے بادبانی کپڑے کے چیتھڑے کے سوا بالکل برہنہ تھا۔ اس کے باوجود اس کو دیکھ کر اس انکشاف پر آپ کے قدم تھم جاتے کہ یہ شخص نہ صرف قاہرہ شہر میں، بلکہ ہمارے پورے دور میں اجنبی ہے۔ آپ کو خیال ہوتا کہ اس شکل وصورت کے لوگ آپ نے تاریخ یا آثار قدیمہ کی کتابوں میں دیکھے ہیں۔ اس لیے مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس نے، کسی گداگر کے سے مسکین انداز میں مسکرا کر مجھے دیکھا، اور عجیب سی آواز میں منہ ہی منہ میں بولا:

''بیٹے، تمھارے ماں باپ پر مہربانی ہو، تم نے کہیں پتاہ رع کو تو نہیں دیکھا؟''

کیا وہ قدیم تصویری زبان کو عربی اصوات میں ادا کر رہا تھا یا عربی کو تصویری زبان میں؟ کیا یہ شخص کوئی قدیم مصری تھا؟ میں اس کی طرف مڑا:

''سنو — مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم قدیم مصری ہو۔''

''کیا قدیم اور جدید بھی ہوتے ہیں؟ میں مصری ہوں۔''

''اور یہ کرسی کیا ہے؟''

''یہ وہ ہے جسے میں نے اٹھا رکھا ہے۔ تمھارے خیال میں میں پتاہ رع کو کیوں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں؟ اس لیے کہ شاید وہ مجھے اس کرسی کو اتار کر نیچے رکھنے کا حکم دے، جس طرح اس نے مجھے اس کو اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ میں تھک کر چور ہو گیا ہوں۔''

''کیا تم بہت دیر سے اسے اٹھائے ہوے ہو؟''

''بہت دیر سے — تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''ایک سال؟''

''ایک سال سے تمھاری کیا مراد ہے، بیٹے؟ کوئی پوچھے تو اس سے کہنا، ایک سال اور چند ہزار۔''

''ہزار کیا؟''

''سال۔''

''مثلاً اہرام کے زمانے سے؟''

''اس سے بھی پہلے سے۔ نیل کے زمانے سے۔''

''نیل کے زمانے سے؟ کیا مطلب؟''

''اس زمانے سے جب نیل کو نیل نہیں کہا جاتا تھا، اور مرکز کو پہاڑوں سے دریا کے کنارے پر منتقل کیا گیا تھا۔ تب پتاہ رع نے مجھے بلایا اور کہا: حمال، اسے اٹھا لے۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اُس وقت سے اسے اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہوں اور پتاہ رع کو ڈھونڈ رہا ہوں تاکہ وہ مجھے اس کو اتارنے کا حکم دے، مگر اس دن سے اب تک وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔''

استعجاب کی صلاحیت یا خواہش مجھ میں بالکل ختم ہو چکی تھی۔ جو شخص اس جسامت یا وزن کی کرسی کو ایک لمحے کے لیے بھی اٹھانے پر قادر ہو، وہ اسے ہزاروں سال بھی اٹھائے پھر سکتا ہے۔ تعجب یا احتجاج کا یہ کوئی موقع نہ تھا۔ صرف ایک سوال کیا جا سکتا تھا:

''اور فرض کرو تمھاری پتاہ رع سے ملاقات نہ ہو سکے، تو کیا تم اسے اٹھائے گھومتے رہو گے؟''

''اور کیا کروں گا؟ میں نے اسے اٹھا رکھا ہے اور اسے میرے سپرد کیا گیا ہے۔ مجھے اس کو اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا، تو میں حکم کے بغیر کیوں کر اسے اتار سکتا ہوں؟''

شاید یہ غصے کی لہر تھی جس سے مغلوب ہو کر میں نے کہا، ''اسے اتارو۔ کیا تمھارا جی نہیں بھرا؟ بندۂ خدا، تم تھکے نہیں؟ پھینک دو اسے، توڑ ڈالو، جلا دو۔ کرسیاں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ لوگوں کو اٹھائیں، نہ کہ لوگ انھیں اٹھائے پھریں۔''

''میں ایسا نہیں کرسکتا۔ کیا تمھارے خیال میں میں اسے تفریح کی غرض سے اٹھائے پھر رہا ہوں؟ میں اپنی روزی اسی طرح کماتا ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ جب تم دیکھ رہے ہو کہ یہ تمھیں تھکا کر چور کررہی ہے، تمھاری کمر توڑے دے رہی ہے، تو تمھیں اس کو اتار پھینکنا چاہیے — تمھیں تو یہ کام زمانوں پہلے کرلینا چاہیے تھا۔''

''تم تو ایسا ہی کہو گے، کیونکہ تم اس قصے سے باہر اور محفوظ ہو۔ اس کا بوجھ تمھارے سر پر نہیں ہے، تو تمھیں کیا پروا۔ اسے میں نے اٹھا رکھا ہے کیونکہ اسے میرے سپرد کیا گیا تھا، اس کی ذمے داری مجھ پر ہے۔''

''خدا کی پناہ، مگر آخر کب تک؟''

''جب تک پتاہ رع مجھے حکم نہ دے۔''

''وہ کب کا مر کھپ چکا۔''

''تو اس کا وارث، اس کا نائب، اس کا کوئی خلف، کوئی بھی شخص جسے اس کی طرف سے اس کا اختیار حاصل ہو۔''

''تو ٹھیک ہے، میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اُسی وقت اسے نیچے رکھ دو۔''

''تمھارے حکم کی تعمیل ہوگی — اور تمھاری دردمندی کا بھی بے حد شکریہ — لیکن کیا تم اس کے خاندان سے ہو؟''

''بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔''

''کیا تمھارے پاس اس کا اختیار نامہ ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر مجھے میری راہ جانے دو۔''

اس نے چلنا شروع کردیا تھا، لیکن میں نے چلا کر اسے روک لیا۔ کیونکہ میری نظر اس شے پر پڑ گئی تھی جو ایک اعلان کی شکل میں کرسی کے سامنے والے حصے پر چسپاں تھی۔ درحقیقت یہ ہرن کی کھال کا ایک ٹکڑا تھا جس پر قدیم رسم الخط میں کوئی عبارت درج تھی اور وہ آسمانی کتابوں کے اولین نسخوں کی طرح لگ رہا تھا۔ میں بہت دشواری سے یہ عبارت پڑھ سکا:

اے کرسی بردار
بہت دیر تو نے یہ بوجھ اٹھایا

اور اب وقت آ گیا ہے کہ کوئی کرسی تیرا بوجھ اٹھائے
یہ عظیم و جسیم کرسی
جس کی نظیر کبھی تیار نہیں ہوئی
تیرے ہی لیے ہے
اسے اٹھا لے
اور اپنے گھر لے جا
اسے کسی ممتاز مقام پر رکھ
اور عمر بھر اس پر نشست کر
تیرے دنوں کے خاتمے پر
یہ تیرے بیٹوں کی ملکیت ہے

''میرے برادر، کرسی بردار، یہ بے پناہ رع کا فرمان ہے؛ اس کا واضح حکم جو اُسی وقت جاری ہوا تھا جب اس نے تمھیں کرسی اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ اس پر اس کے دستخط ہیں اور اسے اس کے خرطوشے سے مہر کیا گیا ہے۔''

میں نے یہ سب اس سے بے حد مسرت کے عالم میں کہا، کسی ایسے شخص کی سی مسرت جو طویل حبس سے باہر آیا ہو۔ جس لمحے سے میں نے کرسی کو دیکھا تھا اور یہ قصہ سنا تھا، میں یوں محسوس کر رہا تھا گویا یہ بوجھ مجھی پر ہے اور ہزاروں سال سے مجھی پر رہا ہے؛ گویا وہ میری ہی کمر ہے جو ٹوٹی جا رہی ہے، اور جو مسرت مجھ پر طاری ہے وہ اس بوجھ سے بالآخر رہا ہو جانے پر میری اپنی مسرت ہے۔

وہ شخص سر جھکائے میری بات سنتا رہا، کسی جذبے کی ایک رمق تک سے عاری، وہ فقط سر جھکائے میری بات پوری ہونے کا انتظار کرتا رہا، اور جیسے ہی میں نے اپنی بات ختم کی اس نے اپنا سر اٹھایا۔ میں اس سے اپنی جیسی مسرت، بلکہ سرخوشی کے اظہار کی توقع کر رہا تھا، لیکن مجھے کوئی ردِعمل دکھائی نہ دیا۔

''یہ فرمان ٹھیک تمھارے سر کے اوپر لکھا ہوا ہے — بہت زمانوں سے۔''

''مگر میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔''

''مگر میں نے تمھیں پڑھ کر سنا دیا ہے۔''

''میں تمھاری بات پر یقین کر لیتا اگر تمھارے پاس اختیار نامہ ہوتا۔ ہے تمھارے پاس؟''

جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ غصے سے کچھ بڑبڑاتا ہوا جانے کو مڑا:

''لوگوں کو بلاوجہ راہ کھوٹی کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ اس قدر بھاری بوجھ ہے اور دن بھر میں ایک چکر بھی پورا نہیں ہو پاتا۔''

میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ کرسی اپنی سست اور ہموار رفتار سے حرکت کرنے لگی تھی، جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ خود بخود حرکت میں ہے۔ وہ شخص ایک بار پھر اس کا پانچواں پایہ بن گیا تھا جس کے بل پر کرسی متحرک تھی۔

میں کھڑا اسے، پسینے سے تر ہوتے، ہانپتے اور کراہتے ہوئے دور جاتے دیکھتا رہا۔

میں گنگ کھڑا تھا، خود سے سوال کر رہا تھا کہ آیا مجھے دوڑ کر اسے جالینا اور مار ڈالنا چاہیے، تاکہ اپنے غضب کا اظہار کرسکوں۔ کیا مجھے دوڑ کر کرسی کو زبردستی اس کے کندھوں پر سے دھکیل کر نیچے گرادینا چاہیے اور اسے آرام کرنے کے لیے بٹھادینا چاہیے؟ یا مجھے اس کے لیے صرف طیش آمیز جھنجھلاہٹ پر اکتفا کرنا چاہیے؟ یا مجھے اپنے غیظ پر قابو پاکر اس کے لیے صرف تاسف محسوس کرنا چاہیے؟

یا پھر مجھے اس بات کے لیے خود کو قصوروار ٹھہرانا چاہیے کہ مجھے علم نہیں کہ اختیار نامہ کیا ہوتا ہے؟

یوسف ادریس

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

بیت اللحم

چراغ کے پاس رکھی ہوئی انگوٹھی... خاموشی بوجھل ہے، کان اندھے ہوجاتے ہیں۔ انگلیاں دُزدانہ حرکت کرتی ہیں، خاموشی سے انگوٹھی کو گرفت میں لیتی ہیں اور روشنی گل کردیتی ہیں۔ اندھیرا مسلط ہوجاتا ہے اور اندھیرے میں آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں۔ عورت، اس کی تین بیٹیاں، اور ان کا مکان: محض ایک کمرہ۔

ابتدا خاموشی ہے۔ بیوہ دراز قد، گوری جلد اور چھریرے بدن والی ہے، عمر تقریباً پینتیس سال۔ اس کی بیٹیاں بھی لمبی اور تندرست ہیں۔ انھوں نے اب تک سوگ کا سیاہ لباس پہن رکھا ہے۔ ان میں سب سے چھوٹی سولہ سال کی ہے، سب سے بڑی بیس کے لگ بھگ۔ تینوں کم رُو ہیں، انھوں نے اپنی گہری رنگت اور غیر متناسب، فربہ اور بے ڈول جسم باپ سے اور قد ماں سے پایا ہے۔ کمرہ اپنی تنگی کے باوجود دن بھر انھیں اپنے اندر سمیٹے رکھتا ہے۔ انتہائی مفلسی کے باوجود کمرہ سلیقے سے، قربت اور آسائش کے انداز میں، آراستہ ہے اور نسوانی لمس کا پتا دیتا ہے۔ جب رات آتی ہے تو ان کے جسم پورے کمرے میں پھیل جاتے ہیں۔ گرم، دھڑکتے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے ڈھیر، تنہا بستر یا دیوان پر پسرے ہوئے؛ سانس لیتے اور ہانپتے ہوئے، گہری بے خوابی کے شکار۔

خاموشی اس گھر پر دو سال سے منڈلا رہی ہے جب مرد نے، طویل بیماری کے بعد، جان دی۔ سوگ کا عرصہ گذر گیا لیکن سوگواروں کی عادتیں قائم رہیں، جن میں سب سے حاوی عادت خاموشی کی تھی۔ یہ درحقیقت انتظار کی خاموشی تھی، کیونکہ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں اور انتظار کا عرصہ ان پر بوجھل ہو رہا تھا۔ دروازے پر خواستگار دستک نہیں دیتے تھے۔ کون شخص ہوگا جو غریب، کم رو لڑکیوں کے دروازے پر دستک

دے، خاص طور پر جب وہ یتیم بھی ہوں؟ لیکن بے شک امید اب تک برقرار تھی (شراب اپنے خریدار کے آنے تک مٹکے میں پڑی رہ سکتی ہے)، اور ان میں سے ہر لڑکی کو یقین تھا کہ قسمت بدل جائے گی۔ (کوئی کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی اس سے بھی زیادہ غریب ضرور ہوگا، اور اگر بدصورتی غالب ہے تو کوئی نہ کوئی اَور زیادہ بدصورت بھی ہوگا... اور اگر صبر کافی ہو تو خواب پورے ہو جاتے ہیں...)

خاموشی کبھی کبھی قرآن پڑھنے کی آواز سے ٹوٹتی تھی؛ یکساں، اور جذبوں سے عاری آواز۔ قاری اندھا ہے، مگر تلاوت مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کی جاتی ہے۔ ہمیشہ اپنے معین وقت پر، ہر جمعے کی سہ پہر کو وہ اپنی چھڑی سے ٹٹولتا ہوا دروازے پر آتا ہے۔ وہ خود کو بڑھے ہوئے ہاتھ کے سپرد کر دیتا ہے جو اسے اندر لے آتا ہے۔ اندر آکر وہ چٹائی پر دوزانو بیٹھ کر تلاوت کرنے لگتا ہے۔ تلاوت پوری ہونے پر وہ ٹٹول کر اپنے جوتے اٹھاتا ہے، سلام کرتا ہے جس کا جواب دینے کی زحمت کوئی نہیں کرتا، اور چلا جاتا ہے۔ وہ عادتاً آتا ہے، عادتاً تلاوت کرتا ہے اور عادتاً چلا جاتا ہے۔ کوئی اس کے وجود کو محسوس نہیں کرتا۔

خاموشی ہر وقت قائم رہتی ہے... اُس وقت بھی جب تلاوت کی آواز اسے پارہ پارہ کر رہی ہو۔ گویا خاموشی ہی خاموشی کو توڑتی ہے۔ ہمیشہ کا انتظار، کمزور لیکن مستقل امید، کیونکہ امید ہر حقیر مخلوق کے لیے موجود ہے، کوئی نہ کوئی اس سے زیادہ حقیر بھی ہوگا۔ اور انھیں بہت زیادہ کی آرزو بھی نہیں ہے۔ نہیں... انھیں آرزو نہیں ہے۔

خاموشی قائم رہی جب تک تبدیلی واقع نہ ہوئی، اُس جمعے تک جب قاری نہیں آیا۔ ہر معاہدہ، خواہ وہ کتنے ہی طویل عرصے تک قائم رہا ہو، آخر ختم ہو جاتا ہے، اور غالباً یہ معاہدہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ تب بیوہ اور اس کی بیٹیوں کو احساس ہوا کہ اس کی آواز نہ صرف گھر کی تنہا مردانہ آواز تھی جو ہفتے میں ایک بار خاموشی کو توڑتی تھی، بلکہ وہ واحد مرد تھا جو ان کے دروازے پر دستک دیتا تھا۔ ان پر اَور باتیں بھی عیاں ہونے لگیں۔ ہاں، وہ انھی کی طرح مفلس تھا، لیکن اس کا لباس ہمیشہ صاف، جوتے ہمیشہ چمکتے ہوئے اور عمامہ ہمیشہ اچھی طرح بندھا ہوا ہوتا تھا (جو کسی بھی آنکھوں والے مرد کو شرمندہ کر دیتا)، اور سب سے بڑھ کر، اس کی آواز طاقتور، گونج دار اور مترنم تھی۔ یہ خیال ہوا میں منڈلانے لگا: معاہدے کی تجدید کیوں نہ کر لی جائے، اور اسے فوراً بلوا کیوں نہ لیا جائے؟ کیا وہ کہیں اَور مصروف ہو گیا ہے؟ وہ انتظار کر لیں گے، کیونکہ انتظار کے قدیم کھیل میں انھیں بہت مہارت ہے۔

شام اپنے اختتام پر تھی، اور وہ، گویا پہلی بار، تلاوت کر رہا تھا۔ تب یہ تجویز سامنے آئی، کیوں نہ ان میں سے کوئی ایک اس مرد سے شادی کر لے جس کی آواز گھر کو بھر دیا کرے؟

وہ کنوارا تھا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں، وہ نوجوان تھا۔ لفظوں سے لفظ جنم لیتے ہیں، اور وہ بھی کسی مناسب عورت کی تلاش میں تھا۔ لڑکیاں اس معاملے پر آپس میں مشورہ کرتی ہیں اور ماں ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ان میں سے کون اس خوش نصیبی کی مستحق ٹھہرے گی۔ لیکن ان کے چہرے اس کی متجسس نظروں سے گریزاں ہیں اور یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں: کیا ہمارے طویل انتظار کا صلہ یہ ہے؟ کیا ہمیں اپنا روزہ ایک اندھے مرد سے افطار کرنا ہوگا؟ کیونکہ وہ اب تک خواستگاروں کے آنے کا خواب دیکھتی ہیں، اور خواستگار عموماً آنکھوں والے نوجوان مرد ہوتے ہیں۔ بے چاریوں کو ابھی مردوں کی دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ اپنی زندگیوں کے اس حصے میں ان کے لیے یہ جاننا ناممکن ہے کہ مرد کو جانچنے کا پیمانہ فقط بینائی نہیں ہے۔

''اماں، تم اس سے شادی کرلو... تم کرلو۔''

''میں؟ کیسی شرم کی بات ہے! لوگ کیا کہیں گے!''

''لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہنے دو۔ یہ بہرحال گھر میں مرد کے بغیر، مرد کی آواز کی گونج کے بغیر رہنے سے بہتر ہوگا۔''

''کیا تم چاہتی ہو کہ میں تم سے پہلے شادی کرلوں؟ یہ کبھی نہیں ہوسکتا...''

''کیا تمھارا ہم سے پہلے شادی کرنا بہتر نہیں ہوگا، تاکہ ہمارے گھر میں مردوں کا آنا جانا شروع ہو جائے؟ پھر ہماری بھی شادیاں ہوسکتی ہیں۔''

''شادی کرلو، اماں، اس سے شادی کرلو...''

اور ماں نے اس سے شادی کرلی... ہوا میں ایک اَور سانس شامل ہوگیا اور ان کی آمدنی میں بھی تھوڑا سا اضافہ ہوگیا، اور ایک اس سے بھی بڑا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ یہ درست ہے کہ ان دونوں نے اپنی پہلی رات کسی طرح کاٹ لی، لیکن پھر وہ انجانے میں بھی، ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے۔ لڑکیاں سو رہی تھیں، یا سوتی بن رہی تھیں، لیکن ماں کریدتی ہوئی انسانی نظروں کی شعاعوں کو، جانوروں کے چوکنے محاسوں کی طرح، درمیان کی خالی جگہ کو ٹٹولتا محسوس کررہی تھی۔ لڑکیاں اتنی بڑی ہوچکی ہیں کہ سب کچھ سمجھ سکیں، اور کمرہ یک لخت دن کی روشنی میں جھلملاتے ہوئے، حساس اور دھڑکتے ہوئے وجودوں میں منقلب ہوگیا ہے۔

جب صبح ہوئی تو تینوں، ایک ایک کرکے، گھر سے نکل گئیں اور مغرب کے وقت، ہچکچاتی ہوئی، گھبرائی ہوئی واپس لوٹیں۔ وہ اپنے پیروں کو گھسیٹتی ہوئی، ہنسی کی آواز سے بھرے ہوئے مکان میں داخل ہوئیں؛ اس ہنسی کا تسلسل کبھی کبھی ایک عورت کی دھیمی آواز سے ٹوٹتا تھا۔ ضرور یہ ماں کی ہنسی ہوگی، اور وہ جس محترم قاری سے واقف تھیں وہ بھی اب ہنس رہا تھا۔ ننگے سر، گیلے بال، اور ہاتھ میں کنگھی لیے ہوئے اور اب تک

ہنستے ہوے، ماں نے انھیں خوش آمدید کہا۔ انھوں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور انھیں اندازہ ہوا کہ ان برسوں میں یہ ایک بجھا ہوا چراغ رہا تھا جس کے کونوں میں چھپکلیوں اور مکڑیوں نے گھر بنالیا تھا۔ اب یہ چہرہ یک دم روشن ہوگیا تھا اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں کی جگہ اب وہاں ہنسی سے چھلکتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ خاموشی مکمل طور پر ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت اونچی آوازوں، شوخیوں، قاری کی پرجوش، تھرتھراتی ہوئی، دلکش آواز میں ام کلثوم اور عبدالوہاب کی نقلوں سے پر رہا۔

بہت خوب اماں! یہ چہل پہل اور ہنسی جلد ہی اَور مردوں کو اس گھر کی طرف مائل کردے گی، کیونکہ ایک مرد کی موجودگی اَور مردوں کے آنے کا باعث بنتی ہے۔

لڑکیو، یقین رکھو۔ جلد ہی مردوں کا آنا جانا شروع ہوگا اور رشتے آنے لگیں گے۔ لیکن حقیقت میں اس کے ذہن پر رشتے لانے والے مردوں کا نہیں بلکہ اس نوجوان کا غلبہ تھا۔ وہ اندھا ضرور تھا لیکن کسی کا اندھا ہونا ہمیں اس کو دیکھنے سے کس طرح باز رکھ سکتا ہے؟ ہاں، وہ اس تندرست نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی چھلکتی ہوئی قوت نے بیماری اور بے بسی کے برسوں اور اس کے قبل از وقت بڑھاپے کی تلافی کردی تھی۔

خاموشی کبھی نہ لوٹنے کے لیے جاچکی تھی، اور اس کی جگہ زندگی کی ہلچل نے لے لی تھی۔ یہ مرد قانونی طور پر اس کا خاوند ہے؛ اس نے خدا کے قانون اور رسول کی سنت کے مطابق اس سے نکاح کیا ہے۔ نہیں، اسے کسی بات پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس نے قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کیا؛ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ کسی فعل کو راز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی، یا جب رات آتی ہے اور وہ سب ساتھ ساتھ پڑے ہوتے ہیں، اور جب بدن اور روح کی قوت مغلوب کرلیتی ہے، خواہ لڑکیاں اپنی کمیں گاہوں میں بیدار اور ہوشیار ہوں اور آہوں اور کراہوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کررہی ہوں۔

اِس کی صبحیں مال دار لوگوں کے گھر کپڑے دھونے میں گذرتی تھیں، اور اُس کا دن غریبوں کے گھر قرآن کی تلاوت کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

شروع شروع میں وہ دن کے درمیانی وقفے میں گھر نہیں لوٹتا تھا، مگر جوں جوں اس کی راتیں طویل ہونے لگیں، اس نے اپنے تھکے ہوے جسم کو آرام دینے، اور رات کے لیے اپنی قوت بحال کرنے کے لیے گھر آنا شروع کردیا۔

اور ایک بار، جب وہ رات سے سیر ہوچکے اور رات ان سے سیر ہوچکی، تو اچانک اس نے عورت سے سوال کیا کہ اسے دوپہروں میں کیا ہوجاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ وہ رات میں اتنی باتونی اور بولنے کے لیے بے قرار ہوتی ہے اور اُس وقت بالکل چپ سادھ لیتی ہے؟ اس نے مرد کی پسندیدہ انگوٹھی — اس کی جانب سے شادی کا تحفہ، جہیز اور مہر — اِس وقت کیوں پہن رکھی ہے اور دوپہر کو وہ اسے کیوں اتار دیتی ہے؟

اگر وہ اپنے اوسان کھو کر خود کو الگ کر لیتی، ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر چلانے لگتی تو روا تھا۔ اگر وہ خود کو ہلاک کر لیتا تو بھی بجا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس کا ایک ہی مفہوم تھا، اور وہ نہایت ہولناک اور سفاک تھا۔ ایک گھٹی ہوئی سسکی نے اس تمام ردعمل کی راہ روک دی۔ اس نے سانس روک لیا اور مشتعل نہ ہوئی۔ اس نے اپنے کانوں کو آنکھوں، ناک اور تمام حسوں کے اعضا میں بدل لیا، اور اپنے ایک ایک ریشے میں تناؤ پیدا کر کے یہ پتا چلانے کی کوشش کی کہ ان تینوں میں سے مجرم کون ہے۔ کسی سبب سے اسے یقین تھا کہ یہ حرکت منجھلی کی ہے، کیونکہ اس کی آنکھوں میں ایسی سرکشی نظر آنے لگی تھی جس کا خاتمہ صرف بندوق کی گولی سے ممکن تھا۔ لیکن اس نے اپنے کان لگائے رکھے۔ تینوں کی سانسیں بھاری، تیز اور گرم، شعلہ بار، مجوب اور ناہموار ہو گئیں اور جوانی کے ان خوابوں سے سنسنانے لگیں جن میں مداخلت کرنا ناقابل معافی ہوتا۔

بھاری سانسیں رفتہ رفتہ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں، پیاسی زمین سے ابلتے ہوئے لاوے میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ اس کے حلق میں پیدا ہونے والی گرہیں گہری اترنے لگتی ہیں اور اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اپنے ریشوں کے تمام تناؤ کے باوجود وہ دھڑکتے ہوئے گرم گوشت کے ایک ڈھیر اور دوسرے ڈھیر میں تمیز کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ تینوں بھوکی ہیں۔ تینوں ہانپتی اور کراہتی ہیں۔ اور یہ کراہیں صرف کراہیں نہیں ہیں؛ یہ امنگیں ہیں، یا شاید التجائیں، یا شاید اس سے بھی بڑھ کر۔

اس نے خود کو پوری طرح اپنے دوسرے قانونی حق کے سپرد کر دیا ہے، اور لڑکیوں کو، اپنے پہلے قانونی فرض کو، بالکل فراموش کر دیا ہے۔ صبر نے دستۂ مُر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب خواستگاروں کا سراب بھی باقی نہیں رہا۔ یکا یک، جیسے انھیں کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو، یا کسی رازدارانہ پکار پر ان کی آنکھ کھل گئی ہو، لڑکیاں بھوک سے بے تاب ہو اٹھی ہیں۔ یہ حرام غذا ہے، لیکن بھوک اس سے بھی بڑھ کر گناہ آلود ہے۔ اس بھوک سے زیادہ گناہ آلود کوئی چیز نہیں۔ وہ اس سے کتنی اچھی طرح واقف ہے۔ اور یہ بھوک اس سے کتنی اچھی طرح واقف ہے؛ اس نے اس کی روح کو آزاد کیا ہے، اس کی ہڈیاں کھنکھو لی ہیں۔ وہ اس بھوک سے واقف ہے۔ اب جب اس کی اپنی بھوک مٹ چکی ہے، اس کے لیے اس کو بھلانا ناممکن ہے۔

تینوں بھوک سے بیتاب! وہ جس نے اپنے منھ کا نوالہ نکال کر ان کا پیٹ بھرا، وہ جس کا واحد انہماک خود کو بھوکا رکھ کر انھیں کھانا کھلانا تھا، وہ جو ماں ہے — کیا اسے یاد نہیں رہا؟

اور مرد کے مطالبوں میں اصرار خواہ کتنا ہی بڑھ گیا ہو، اس کا درد خاموشی میں بدل گیا۔ ماں خاموش ہو گئی اور اس لمحے کے بعد سے خاموشی نے کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ صبح ناشتے پر، بالکل جس طرح اس نے سوچا تھا، منجھلی خاموش تھی اور اس کے بعد بھی خاموش رہی۔ رات کے کھانے پر نوجوان مرد مسرور اور زندہ دلی سے بھرپور، نابینا اور خوش تھا، ہنس رہا تھا اور گا رہا تھا، اور صرف چھوٹی اور بڑی اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

صبر کا امتحان لیا جاتا ہے اور اس کی تلخی مرض بن جاتی ہے، اور کوئی شخص آ کر دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا۔
ایک دن بڑی لڑکی ماں کی انگوٹھی کو دیکھ کر تحسین کا اظہار کرتی ہے، اور ماں کا دل ڈوب جاتا ہے؛ اور جب بڑی صرف دن بھر کے لیے اسے پہننے کی فرمائش کرتی ہے تو ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ ماں خاموشی سے اسے اپنی انگلی سے اتار دیتی ہے اور لڑکی خاموشی سے اسے اپنی انگلی میں پہن لیتی ہے۔

اور اُس رات بڑی لڑکی خاموش رہتی ہے اور ایک لفظ منھ سے نہیں نکالتی۔

اور نابینا مرد گا رہا ہے اور زور زور سے ہنس رہا ہے، اور صرف منجھلی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔

پھل نہ پانے والا صبر اور تردد سے نہ بدلنے والی قسمت چھوٹی لڑکی کو بھی بڑا کر دیتی ہے، اور اپنی باری پر وہ بھی انگوٹھی کی فرمائش کرتی ہے، اور خاموشی سے اس کی بھی باری آ جاتی ہے۔

انگوٹھی چراغ کے پاس رکھی ہے اور خاموشی چھا جاتی ہے اور کان اندھے ہو جاتے ہیں، اور جس کی باری ہے وہ انگلی دُزدانہ حرکت کر کے خاموشی سے انگوٹھی کو گرفت میں لیتی ہے اور روشنی گل کر دیتی ہے۔

اندھیرا مسلط ہو جاتا ہے اور اندھیرے میں آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ صرف اندھا نوجوان مرد خوش رہتا ہے۔ لیکن اپنی اونچی آواز اور قہقہوں کے پیچھے وہ اس خاموشی کے ہاتھوں الجھن میں رہتا ہے، بے یقینی کا عذاب جھیلتا ہے۔ شروع میں وہ خود سے کہتا تھا: ہمیشہ بدلتے رہنا غالباً عورت کی فطرت ہوتی ہوگی۔ کبھی وہ صبح کی اوس کی طرح تازہ ہوتی ہے، کبھی دلدلی پانیوں کی طرح بوجھل اور تھکی ہوئی۔ کبھی گلاب کی پتی کی طرح نرم، کبھی تھوہر کی طرح کانٹے دار۔ انگوٹھی تو ہر بار وہی ہوتی ہے، لیکن انگلی ہر بار مختلف لگتی ہے۔ اسے کم و بیش یقین تھا کہ انھیں سب کچھ معلوم ہے۔ تو پھر خاموشی بولتی کیوں نہیں؟ بولتی کیوں نہیں؟ اس خیال کے آتے ہی نوالہ اس کے حلق میں پھنس گیا۔ اور اس لمحے کے بعد سے اس نے ایک لفظ منھ سے نہ نکالا۔ وہ اس بے بسی کی حد پار کرنے کے خیال کے ہاتھوں خوف کے نرغے میں رہا۔ اس بار خاموشی مختلف تھی، سب اس کا احترام کرتے تھے۔ شعوری خاموشی؛ مفلسی یا صبر یا مایوسی سے پیدا ہونے والی خاموشی نہیں، بلکہ سب سے زیادہ گہری، سب سے زیادہ لازم، کسی رسمی معاہدے کے بغیر نافذ کی ہوئی خاموشی۔ بیوہ اور اس کی تین بیٹیاں، اور مکان، جو محض ایک کمرہ تھا۔ یہ نئی طرح کی خاموشی تھی۔ یہ خاموشی اندھے قاری کی جانب سے آئی تھی جس نے خاموشی سے خود کو یقین دلا لیا تھا کہ بستر میں اس کے ساتھ ہمیشہ اس کی قانونی بیوی ہوتی ہے، اس کی دی ہوئی انگوٹھی کی مالک، ہمیشہ بدلتی رہنے والی، ہر بار نئی.. جوان اور معمر، ریشم جیسی نرم یا بے حس اور کھردری، کبھی فربہ اور کبھی دبلی پتلی، جو بھی کچھ ہو، اصلیت اسی کا مسئلہ ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ آنکھوں والوں کا معاملہ ہے اور انھیں کی ذمے داری ہے۔

کیوں کہ صرف انھی کو یقین کی نعمت حاصل ہے؛ وہی امتیاز کے اہل ہیں؛ جبکہ وہ صرف شک کو جان

سکتا ہے، شک جسے صرف بینائی کی نعمت دور کرسکتی ہے۔ جب تک وہ اس نعمت سے محروم ہے، یقین سے بھی محروم رہے گا، کیونکہ وہی اندھا ہے اور اندھوں کے لیے کوئی شرم نہیں۔

یا ہے؟

توفیق الحکیم

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

بکاؤ کرامات

طائر اپنے آشیانوں میں بیدار ہوئے تو اس کے بعد ہی حسبِ عادت پادری بھی منہ اندھیرے اٹھ کر تسبیح و عبادات اور مشرقی علاقے کے اپنے اس حلقے کے کاموں میں مشغول ہو گیا جس کی روحانی رہنمائی اس کے سپرد تھی اور جہاں کے دین دار لوگ اس کا بہت ادب اور عوام اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس کے دروازے کے سامنے پام کا ایک چھوٹا سا پیڑ تھا جو خود اس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ وہ روزانہ سویرے اس پیڑ کو پانی دیتے ہوئے سورج کے کھجور جیسے سرخ کناروں کو افق سے اُبھرتے اور اپنی کرنوں سے اوس میں بھیگے پتوں سے ٹپکتی چاندی جیسی بوندوں پر سنہری جال بنتے دیکھتا تھا۔

اس صبح پام کو پانی دے کر پادری جیسے ہی اندر جانے کے لیے پلٹا، اس نے اپنے سامنے کچھ مغموم اور پریشان حال لوگوں کو کھڑا ہوا پایا۔ ان میں سے ایک ہمت کرتے ہوئے آگے بڑھا اور منت سماجت کرنے لگا۔

''فادر! ہمیں بچا لیجیے۔ آپ کے سوا کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ میری بیوی کی جان اٹک رہی ہے اور مرنے سے پہلے وہ آپ کی دعائیں چاہتی ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''قریب کے ایک گاؤں میں۔ سواریاں تیار ہیں۔'' اس آدمی نے دو کسے بندھے گدھوں کی طرف اشارہ کیا جو ان کی سواری کے منتظر کھڑے تھے۔

''اچھا میرے بیٹو،'' پادری نے کہا۔ ''بس تھوڑا توقف کرو۔ ہم اپنے معاملات نپٹا لیں اور اپنے بھائیوں کو بتا دیں، پھر چلتے ہیں۔''

''وقت بہت تنگ ہے،'' وہ سب بیک زبان بولے۔'' عورت دم بہ لب ہے۔ کہیں پہنچنے میں دیر نہ ہوجائے۔ جو واقعی آپ کو ہمارا خیال ہے اور اس مرنے والی کے مہربان، مغفرت چاہنے والے ہیں تو فوراً چلیے۔ جگہ زیادہ دور نہیں۔ دو پہر ہوتے ہوتے ہم واپس بھی آجائیں گے۔''

''اچھا، تو پھر فوراً چل دو،'' پادری نے گرم جوشی سے کہا۔ وہ دونوں گدھوں کی طرف بڑھے، باقی لوگ ان کے پیچھے پیچھے آئے۔ ایک گدھے پر اس کو سوار کرایا گیا، دوسرے پر عورت کا شوہر سوار ہوا اور وہ سب تیزی سے روانہ ہوگئے۔

سفر گھنٹوں جاری رہا۔ پادری بار بار پوچھتا رہا کہ وہ کدھر جارہے ہیں، اور وہ لوگ گدھے کو ہانکتے ہوئے کہتے رہے،''بس ہم پہنچ گئے۔'' دو پہر کے قریب وہ گاؤں نظر آیا۔ کتوں کے بھونکنے اور لوگوں کے استقبالیہ نعروں کے درمیان وہ داخل ہوئے اور سب جلوس کی شکل میں موضعے کی بیٹھک تک آئے۔ پادری کو ایک بڑے سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں اس نے ایک عورت کو بستر پر اس طرح پڑے دیکھا کہ اس کی آنکھیں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے عورت کو آواز دی مگر وہ کچھ نہ بولی۔ وہ موت کی دہلیز پر تھی۔ پادری نے اس پر دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کرنا شروع کیا۔ ابھی وہ اپنی دعائیں پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ عورت نے طویل گہری سانس لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پادری کو محسوس ہوا کہ بس اب چل چلاؤ ہے۔

مگر جان دینے کے بجائے اس نے پپوٹے پھڑ پھڑائے اور نظر ذرا صاف ہوئی تو وہ منمنائی:

''میں کہاں ہوں؟''

حیرت زدہ ہوکر پادری نے کہا،''اپنے گھر میں۔''

''پانی... پانی دو۔''

گھبرا ڈالے ہوئے رشتے دار چلائے،''پانی لاؤ! صراحی لاؤ!''

فوراً پانی سے بھرا کٹورا لایا گیا جس میں سے عورت نے غٹا غٹ بہت سارا پانی پی ڈالا۔ پھر ڈکار لے کر بولی:

''بڑی بھوک لگی ہے۔ کھانے کو لاؤ۔''

ہر شخص کھانا مہیا کرنے کو دوڑ پڑا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر ایک نے اس عورت کو کھاتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ اپنے بستر سے اتری اور سارے گھر میں اس طرح ٹہلنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر سب پادری کے سامنے سجدے میں گر پڑے، اس کے ہاتھوں اور پیروں کو چومنے لگے اور کہنے لگے:

''اے خدا کے ولی! آپ کے دم قدم سے برکت اس گھر پر نازل ہوئی اور مردہ عورت کو دوبارہ زندگی ملی۔ اس احسان اور عنایت کا شکرانہ ہم کس طرح ادا کریں؟''

''ہم نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا جس کا شکرانہ ادا کیا جائے،'' پادری نے جواب دیا۔ وہ اس واقعے سے خود بہت حیران تھا۔ ''یہ سب خدا کی قدرت کا کمال ہے۔''

''آپ جو چاہیں نام دیں،'' صاحب خانہ نے جواب دیا، ''مگر اے خدا کے ولی، یہ بہر حال ایسی کرامت ہے جو آپ کے ہاتھوں انجام پائی۔ آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے۔ آپ کے آنے سے نہ صرف ہماری عزت بڑھی بلکہ ہم پر خوش بختی بھی نازل ہوئی۔ آپ ہم کو، ہماری بساط بھر، اپنی میزبانی کا شرف بخشیں جو آپ کے شایانِ شان ہو۔''

اس نے حکم دیا کہ ایک پر سکون کمرہ مہمان کے لیے آراستہ کیا جائے، اور وہاں اس کو ٹھہرایا۔ پادری نے جب بھی جانے کی بات کی، میزبان نے قسم کھا کر کہا کہ وہ اپنے مقدس مہمان کو تین دن سے پہلے رخصت نہیں کرے گا؛ کہ جس بزرگ ہستی نے اس کی بیوی کو دوبارہ زندگی بخشی ہو اس کی میزبانی کم سے کم اتنی مدت تو کی جائے۔ اس عرصے میں اس نے پادری کی بہت خدمت اور تکریم کی۔ جب میزبانی کی میعاد پوری ہوئی تو اس نے ایک سواری تیار کی اور اسے تحائف سے — دالوں اور مرغیوں اور گھر میں تیار کی ہوئی روٹیوں سے — لاد دیا، اور ساتھ ہی اس نے پادری کے ہاتھ پر کلیسا کے چندے کے طور پر پانچ پونڈ بھی رکھ دیے۔ ابھی وہ اسے گھر سے باہر لے جا کر گدھے پر سوار کرا ہی رہا تھا کہ ایک آدمی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچا اور آتے ہی پادری کے قدموں پر گر پڑا۔

''فادر!'' وہ گڑگڑانے لگا۔ ''آپ کی کرامت کی داستان چاروں طرف پھیل چکی ہے۔ میرا چچا، جو میرے باپ کی جگہ ہے، موت کی دہلیز پر ہے اور آپ کی دعاؤں کی طلب میں جی رہا ہے۔ خدارا اس کی خواہش پوری ہوئے بغیر اس کی روح کو پرواز نہ کرنے دیجیے۔''

''مگر بیٹے، ہم تو اب گھر جانے کو تیار ہیں،'' پادری نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

''اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گا جب تک آپ میرے ساتھ چچا کے پاس نہیں چلیں گے۔'' اس آدمی نے گدھے کی باگ سنبھال لی اور ہنکا لے چلا۔

''تمھارا یہ چچا کہاں ہے؟'' پادری نے دریافت کیا۔

''بالکل قریب... چند منٹ کا فاصلہ ہے۔''

پادری کو اس کی بات ماننے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ وہ ایک گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد اگلے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں بھی اس نے پہلے کی طرح ایک مکان میں ایک جاں بہ لب بوڑھے کو بستر پر پڑے پایا۔ اس کے اقربا اس کے گرد کھڑے امید و بیم کی حالت میں جھول رہے تھے۔ جیسے ہی پادری نے اس کے پاس جا کر دعائیں پڑھیں، کرامت ظہور میں آئی۔ وہ جاں بہ لب شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور کھانے اور

پینے کو مانگنے لگا۔ یہ ماجرا دیکھ کر ہکا بکا رہ جانے والے لوگوں نے اپنی جان سے عزیز چیزوں کی قسم کھا کر کہا کہ اس مقدس ہستی کی میزبانی اب ان پر لازم آئی — وہی پورے تین دن کا قیام۔

میزبانی کے قیام کی یہ مدت پادری نے ان کی پُرتعظیم خدمتوں سے لطف اندوز ہونے میں گذاری۔ مگر جوں ہی وہ پادری کو تحائف سے لاد کر اپنے موضعے کے آخری سرے تک پہنچے، ایک اَور شخص آ گیا اور اس کو اپنے گاؤں لے جانے پر اصرار کرنے لگا، چاہے تھوڑی ہی دیر کو سہی، کہ اس کو بھی اس مقدس ہستی کی دعائیں مل جائیں جس کی کرامات کی شہرت پورے ضلعے میں پھیل چکی تھی۔

پادری اس شخص کی خواہش کی زد سے نہ بچ سکا جو اس کے گدھے کی راس کھینچتا ہوا روانہ ہو گیا اور اسے اپنے گاؤں کے ایک مکان پر لا کھڑا کیا۔ وہاں انھیں ایک نوجوان ملا جو اپاہج تھا۔ ابھی پادری نے اسے چھوا ہی تھا کہ وہ بوڑھوں اور جوانوں کے نعرۂ تحسین میں پورے قد سے دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اب تو سب لوگ قسمیں کھا کھا کر اس صاحب کرامت ہستی کی میزبانی کا فرض ادا کرنے پر اصرار کرنے لگے، جو انھوں نے بہت پُرتکلف اور شان دار طور پر، دوسروں کی طرح پورے تین دن اور تین راتوں تک، ادا کیا۔ جب یہ مدت پوری ہوئی تو وہ اپنے مہمان کے پاس بہت سے تحفے لے کر آئے اور پہلے سے موجود تحفوں میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ ان کے بوجھ تلے گدھا دوہرا ہو ہو گیا۔ انھوں نے دوسرے گاؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ چندہ پیش کیا، اتنا کہ اب پادری کے پاس تقریباً بیس پونڈ جمع ہو گئے جو اس نے اپنے بٹوے میں رکھے اور اس کو اپنے لباس کے اندر چھپا لیا۔ وہ گدھے پر سوار ہوا اور اس نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ وہ اسے بہ حفاظت چھوڑ آئیں۔ چناں چہ وہ ساتھ ہو لیے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

''ہماری جانیں آپ کا فدیہ۔ ہم اپنے دلوں میں آپ کو چھپا کر رکھیں گے،'' انھوں نے کہا۔ ''ہم اس وقت تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک بہ حفاظت آپ کو اپنوں میں نہ پہنچا دیں۔ آپ ہمارے لیے اتنے ہی بیش قیمت ہیں جتنا سونا۔''

''ہم تمھیں تکلیف دے رہے ہیں،'' پادری نے کہا۔ ''مگر کیا کریں، راستہ محفوظ نہیں۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے، سارے علاقے میں جتھے گھوم رہے ہیں۔''

''سچ مچ!'' وہ بولے۔ ''ان علاقوں میں تو دن دہاڑے بندہ غائب کر دیا جاتا ہے۔''

''سرکار تک ہر طرف پھیلے ہوئے اس شر کو ختم کرنے میں بے بس ہے،'' پادری بولا۔ ''کہتے ہیں اغوا کرنے والے راستوں میں بسوں کو روک لیتے ہیں اور مسافروں میں سے کسی موٹی سی اسامی کو چھانٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ بعد میں اس کے لواحقین سے لمبا تاوان وصول کریں۔ بعض اوقات تو قانون

کے محافظوں کی موجودگی میں واردات ہوجاتی ہے۔ میں نے سنا ہے ایک ایسی بس میں جسے ڈاکوؤں نے روکا، دو پولیس والے بھی سفر کر رہے تھے۔ جب اغوا کیے جانے والوں نے پولیس سے فریاد کی تو وہ ڈاکوؤں سے اتنے خوف زدہ تھے کہ اغوا ہونے والوں سے کہا بھی تو بس اتنا کہا: چلو اب جاؤ، ہماری جان چھوڑو!''

وہ لوگ ہنسے اور پادری سے بولے، ''آپ بالکل نہ ڈریں۔ جب تک ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ اس گدھے سے اسی وقت اتریں گے جب حفاظت سے اپنے گاؤں پہنچ جائیں گے۔''

''ہم جانتے ہیں تم بہت بہادر ہو! تم لوگوں نے اپنی عقیدت اور خدمت سے ہمیں کافی زیر بار کر دیا ہے۔''

''ایسی بات نہ کہیے! آپ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں!''

اور وہ پادری کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، اس کی خوبیاں بیان کرتے اور اس کی کرامات کے گن گاتے رہے۔ وہ ان کی باتیں سنتا رہا اور جو واقعات گذرے تھے ان پر غور کرتا رہا۔ آخر کار اس نے تعجب کے ساتھ کہا، ''جو کچھ ان دنوں میں ہمارے ساتھ ہوا وہ یقیناً حیرت انگیز تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ساری کرامات صرف ہماری دعاؤں کے اثر سے ہوئی ہوں؟''

''کیا آپ کو شک ہے؟''

''ہم رسول تو ہیں نہیں کہ نو دنوں میں یہ سب کچھ کر سکیں۔ دراصل یہ تم لوگ ہو جنھوں نے ہم سے یہ کرامات کروالیں۔''

وہ سب ایک ساتھ بول پڑے، ''ہم نے؟ کیا مطلب؟''

''ہاں، تم لوگ ہی حقیقی وسیلہ تھے۔''

''یہ آپ سے کس نے کہا؟'' وہ بڑبڑائے اور آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

''یہ تمھارا اعتقاد ہی تھا'' پادری نے یقین کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ ''اعتقاد نے تم سے یہ سب کروالیا۔ تم اس قوت سے واقف نہیں ہو جو ایمان والوں کے نفس میں چھپی ہوتی ہے۔ اعتقاد ایک قوت ہے میرے بیٹو۔ اعتقاد ایک قوت ہے! کرامات تو تمھارے اپنے دل کی گہرائیوں میں بالکل اسی طرح چھپی ہوتی ہیں جس طرح چٹان کے نیچے پانی۔ صرف ایمان و اعتقاد کے زور سے ہی یہ سوتے پھوٹ نکلتے ہیں۔''

اس نے اسی انداز کی گفتگو جاری رکھی اور اس کے پیچھے چلنے والے اپنے سر ہلاتے رہے۔ اس کا جوش بڑھتا گیا اور وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ لوگ ایک ایک کر کے رفتہ رفتہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے موضع کی حدود میں داخل ہونے کے بعد ہی وہ زمین پر واپس آیا اور اپنے محافظوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جب اس نے گردن گھمائی تو خود کو تنہا پا کر حیرت کے مارے اس کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اس کی حیرت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کیوں کہ سامنے اسے اپنا کنبہ نظر آ گیا۔ اس کے پادری بھائی، اس کے بڑے، اس کی طرف لپکے، اسے لپٹانے لگے، اس کے ہاتھوں کو چومنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل نکل کر گالوں پر بہہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پادری کو گلے لگاتے ہوئے کہا، ''آخر آپ صحیح سلامت پہنچ گئے! انھوں نے اپنا عہد پورا کر دیا۔ انھوں نے آپ کو لوٹا دیا، اب رقم وہ بھلے ہی اپنے پاس رکھیں۔ آپ ہمارے لیے ہر رقم سے زیادہ قیمتی ہیں فادر!''

پادری نے رقم کا ذکر سنا تو چونک کر پوچھا، ''کیسی رقم؟''

''وہ رقم جو ہم نے اس گروہ کو ادا کی۔''

''کون سا گروہ؟''

''وہ جس نے آپ کو اغوا کر لیا تھا۔ اول اول تو وہ ایک ہزار پونڈ سے کم لینے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ کے دام تو آپ کے ہم وزن سونے کے برابر ہیں۔ ہم نے ان کی منت سماجت کی کہ آدھی رقم لے لو۔ آخر کار وہ راضی ہو گئے تو ہم نے کلیسا کے فنڈ میں سے پانچ سو پونڈ تاوان ادا کر دیا۔''

''پانچ سو پونڈ!'' پادری چیخا۔ ''آپ نے ہمارا تاوان دیا؟ انھوں نے آپ کو بتایا کہ ہمیں اغوا کر لیا گیا ہے؟''

''جی۔ آپ کی روپوشی کے تین دن بعد چند لوگ ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ ایک گروہ نے آپ کو اس وقت اغوا کیا جب آپ صبح صبح پام کو پانی دے رہے تھے۔ انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ رقم نہ ملی تو آپ کی جان کی خیر نہیں۔ اگر تاوان ادا کر دیا گیا تو آپ زندہ سلامت یہاں پہنچا دیے جائیں گے۔''

جو کچھ اس پر بیتی تھی اس کو دھیان میں لاتے ہوئے پادری نے ان کی باتوں پر غور کیا۔

''بے شک، سب عیاں ہو گیا!'' اس نے یوں کہا جیسے خود سے مخاطب ہو۔ ''وہ مردے، وہ بیمار اور وہ اپاہج جو میری دعاؤں سے اچھلنے کودنے لگے۔ کیا کمال مہارت تھی!''

اس کے بھائی بند اس کے قریب آ آ کر اس کے بدن اور لباس کا معائنہ کرنے لگے اور خوش ہو کر بولے، ''آپ کی سلامتی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں فادر! ہمیں امید ہے قید کے دوران انھوں نے آپ سے کوئی بدسلوکی نہیں کی ہوگی۔ وہ کس طرح پیش آئے؟''

حیرت میں ڈوبے ڈوبے اس نے جواب دیا:

''انھوں نے ہم سے کرامات کروائیں — ایسی کرامات جو کلیسا کو بہت مہنگی پڑیں!''

عبدالسلام العجیلی

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

خواب

محمد ولیس نے خواب میں خود کو نماز پڑھتے دیکھا۔ یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی، کہ وہ تو بیداری کی حالت میں بھی باقاعدگی سے عبادت کرتا تھا اور کوئی فرض نماز اس نے قضا نہیں کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ پہلی رکعت میں وہ سورۂ نصر بالجہر پڑھ رہا ہے، جس کے ختم ہوتے ہی دہشت کے عالم میں اس کی آنکھ کھل گئی۔

''صدق اللہ العلی العظیم،'' اس کے منہ سے نکلا۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ محمد ولیس کو یاد نہیں تھا کہ پورے خواب میں سے صرف یہی بات کیوں اس کے ذہن میں اٹک گئی۔ صبح ہوتے ہی وہ موضعے کے بزرگ شیخ محمد سعید کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ دوپہر ہوتے ہوتے اس نے شیخ کو ڈھونڈ نکالا اور اس کو اپنا خواب سنایا۔ شیخ نے پہلے سر جھکا لیا، اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور بہت دیر غور وفکر میں ڈوبے رہنے کے بعد اس نے سوال کیا:

''تمھیں یقین ہے کہ تم سورۂ نصر پڑھ رہے تھے؟''

''بالکل،'' محمد ولیس نے کہا۔ ''پوری کی پوری پڑھی تھی۔''

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جب اللہ کی مدد اور فتح آئے اور لوگوں کو تم دیکھو کہ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہوتے ہیں تو اپنے رب کی ثنا کرتے ہوئے اس کی تحمید کرو اور اس سے بخشش طلب کرو۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ صدق اللہ العلی العظیم۔'' شیخ محمد سعید نے کہا: ''محمد ولیس، اپنے رب کی حمد وثنا کرو اور اس سے استغفار کی درخواست کرو۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

''یا شیخ، میرا دل کہتا ہے یہ میرے لیے نیک شگون ہوگا۔ آپ اس خواب کی تعبیر میں کیا کہتے ہیں؟''

شیخ محمد سعید نے اپنی چوڑی اور گھنی داڑھی کو مٹھی میں تھام لیا اور انگلیوں سے بالوں میں خلال کرنے

لگا۔ وہ اپنے تبحر کو خواب کی تعبیر جیسی معمولی بات کے لیے استعمال کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ آخر کار وہ بولا:

''محمد ویس، اللہ سے توبہ استغفار کرو۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ خواب میں خود کو یہ سورت پڑھتے ہوئے دیکھنے کا مطلب ہے کہ بس، اب انجام قریب ہے۔''

محمد ویس جو ویسے ہی بولا یا بولا یا سا رہتا تھا، یہ سنتے ہی سر سے پیر تک لرز گیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں شیخ؟''

''تمھارے روبرو یہ بات کہتے ہوئے کلیجا منھ کو آتا ہے،'' شیخ بولا ''مگر حوصلہ رکھو، اللہ کی رحمت جلد ہی تمھارے شاملِ حال ہوگی۔ اور موت تو سب ہی کو آنی ہے۔ محمد ویس، کوئی شخص یہ خواب دیکھنے کے بعد چالیس دن سے زیادہ نہیں جیا۔''

یہ فیصلہ سنا کر شیخ تو ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے چل دیا اور محمد ویس مارے دہشت کے گم سم بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ اس کے پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت بھی نہ رہی۔

خشک گلے سے وہ منمنایا، ''چالیس دن! اللہ ہمت دے۔''

جس بستی میں محمد ویس اور شیخ محمد سعید رہتے تھے، بہت مختصر سی تھی، اس لیے شام ہوتے ہوتے ہر فرد کو محمد ویس کے خواب اور شیخ محمد سعید کی تعبیر کا علم ہوگیا۔ وہ موضع ایسا تھا جہاں خوابوں کی تعبیر پر اعتبار کیا جاتا تھا، اور اگلی شام تک ہر فرد و بشر کو یقین ہو چکا تھا کہ محمد ویس چالیس دن میں ختم ہو جائے گا۔ پہلے فرداً فرداً اور پھر ٹولیوں میں لوگ باگ محمد ویس کے پاس آنے لگے، جس کے باعث ان لوگوں کی خاطر جو اس کی عیادت یا پیش از مرگ تعزیت کے لیے آرہے تھے، اس کو اپنے گھر ہی پر رہنا پڑا۔ محمد ویس کے خاندان کی عورتیں ٹوہ لینے کے لیے آتیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا جائزہ لیتیں۔ اس کو تندرست اور توانا مگر خیالوں میں گم دیکھ کر وہ بین کرنے لگتیں اور اللہ سے فریاد کرتیں کہ موت کے فرشتے کو روک لے جو اس کو لے جانے پر تلا ہوا تھا حالانکہ وہ ابھی ہٹا کٹا تھا۔ گو محمد ویس کو کوئی غم یا تردد نہیں تھا، لیکن حفظ ما تقدم کے طور پر جو تدبیریں ہو رہی تھیں اور اس سلسلے میں جو نازک سوالات اس سے کیے جا رہے تھے انھوں نے اس کو اندوہ اور پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دس دن تو اس نے جیسے تیسے معمول کے مطابق گذار لیے، گھر سے ہاٹ تک روزانہ آتا جاتا رہا، تاہم جلد ہی اس کے اعصاب بول گئے اور قوت برداشت جواب دے گئی۔ اب لوگوں نے دن میں بھی اس کے پاس آنا شروع کر دیا تھا، جبکہ پہلے وہ صرف شام ہی کو گھر پر ملتا تھا۔ خواب دِکھنے کے بیس دن بعد محمد ویس کے گھر کی عورتوں نے اس کا بستر جھاڑنا چھوڑ دیا کیوں کہ اب وہ صبح شام اسی پر پڑا رہتا تھا۔ جب میعاد کے تیس دن نکل گئے تو تمام کھانے جو اس کو مرغوب تھے اور جو اس کے

گھر والے بنا بنا کر پیش کیا کرتے تھے، اب بے چھوئے اس کی چاروں طرف رکھے رہتے۔ اس نے داڑھی چھوڑ دی اور ایک سفید سا لبادہ پہنے پہنے ہر وقت عبادات میں مشغول رہنے لگا۔ اس پر ہمہ وقت رقت طاری رہتی، نہ موت کے خوف سے اور نہ زندگی کے ختم ہونے کے غم میں، بلکہ اُن سزاؤں کی ہیبت سے جو قبر سے آگے اس کے انتظار میں تھیں۔ اسے خوف اس بات کا تھا کہ اس نے کاروبار کے دوران اللہ کی بڑی جھوٹی قسمیں کھائی تھیں اور ہاٹ میں آس پاس کے دیہاتیوں کو بڑے دھوکے دیے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ ان خطاؤں کو معاف نہ کرے۔ جوں جوں دن گذرتے گئے اور چالیسواں دن قریب آتا گیا، اس کے خالی پیٹ پر جمی ہوئی چربی ان پچھلے گناہوں کی توبہ استغفار میں گھلتی چلی گئی۔ اس کی بستی اور آس پاس کے بستیوں کے لوگ اب اس کے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالے کا ذکر کرنے لگے اور ایسے پُر اسرار کلمات کا چرچا ہونے لگا جو نماز پڑھتے ہوئے اس کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ چالیس میں سے جب اڑتیس دن گذر چکے تو انتالیسویں دن میں وہاں پہنچا۔

آپ پوچھیں گے کہ میں کون؟

جس موضع میں محمد ویس مویشیوں کا دلال تھا اور شیخ محمد سعید ولی اللہ سمجھا جاتا تھا، میں وہاں کے اسکول میں مدرس تھا۔ میں گرمیوں کی تعطیلات دمشق میں گذارتا تھا جہاں سے میری واپسی محمد ویس کے لیے شیخ محمد سعید کے مقرر کیے ہوئے چالیس دنوں میں سے انتالیسویں دن ہوئی۔ میں محمد ویس سے بھی اسی طرح واقف ہوں جیسے بستی کے دوسرے لوگوں سے؛ تو جب اسکول کے بوڑھے چوکیدار عطاء اللہ نے مجھے اس کا قصہ سنایا تو میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اس کی حالت پر اپنا سر پیٹ لوں یا قہقہے لگاؤں۔ اس لیے میں عطاء اللہ کو ساتھ لے کر اس کی عیادت کرنے ـــــ یا آنے والی موت پر تعزیت کرنے ـــــ گیا۔ وہ احاطہ جو محمد ویس کے خریدے ہوئے مویشیوں سے بھرا ہوتا تھا، اس وقت ان تمام لوگوں سے بھرا ہوا تھا جو اس کے قریب آتی ہوئی متوقع موت کے انتظار میں جمع ہو گئے تھے۔ ایک کونے میں مرد جمع تھے تو دوسرے گوشے میں عورتیں، اور تیسری طرف وہ بھیڑ بکریاں بندھی ہوئی تھیں جو محمد ویس کے دوست احباب اس کی زندگی ہی میں اس لیے لے آئے تھے کہ اس کی الوداعی رات کو ذبح کی جائیں۔ جس کمرے میں محمد ویس ملک الموت کا انتظار کر رہا تھا، وہاں داخل ہونے پر میں نے اسے دیکھا ـــــ ملک الموت کو نہیں، محمد ویس کو۔ وہ اپنے بستر کے ایک کونے پر ٹکا عبادت میں مشغول تھا، جبکہ دوسرے کونے میں شیخ محمد سعید بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ جس محمد ویس کو میں جانتا تھا اس کی بالکل مختلف صورت دیکھ کر مجھے دھکا لگا۔ اس کا گول، گلگوں چہرہ اب ستواں اور پیلا ہو گیا تھا اور داڑھی نے اسے اور بھی لمبوترا بنا دیا تھا۔ اس کے ڈھیلے

ڈھالے سفید لباس نے اس کے چہرے کی زردی کو اَور نمایاں کر دیا تھا۔ نماز پڑھتے ہوے وہ اپنے سجدوں کو اس امید میں طویل کر دیتا کہ موت آئے تو سجدے میں آئے۔ اِس ولی اللہ میں اور اُس محمد ویس میں زمین آسمان کا فرق تھا جس کو میں اپنی کھڑکی میں سے قسمیں کھا کھا کر یہ کہتے سنا کرتا تھا کہ اگر اس نے ابھی ابھی خریدے ہوے جانور پر تین لیرے کا گھاٹا نہ اٹھایا ہو تو سمجھو اپنی بیوی کو طلاق دی۔ میں محمد ویس سے ملنے تو اپنے شوق اور تجسس میں گیا تھا لیکن اس کی حالت میں یہ فرق دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور اس بات کا قائل ہو گیا کہ وہ یقیناً وقتِ معین پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اور جب میں نے شیخ محمد سعید کو کنکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوے پایا تو میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

میری اس شیخ سے، جس کی فطرت سادگی، حماقت اور مکاری کا مجموعہ تھی، کافی عرصے سے مخاصمت چلی آ رہی تھی۔ میں اس کی عطائیت اور دغا سے، جن کے زور پر اس نے جاہل دیہاتیوں کے ذہنوں کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا، ہمیشہ لڑا کرتا تھا اور وہ بھی ان کو میرے خلاف ورغلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ مجھ پر الزام لگاتا کہ میں بچوں کے ذہنوں کو ملحدانہ خیالات سے مسموم کرتا ہوں اور انھیں اللہ رسول کا باغی بناتا ہوں۔ میری مخالفت میں اس کا جوش یہ جاننے کے باوجود کم نہیں ہوتا تھا کہ میں رسول کے پرنواسے حضرت زین العابدین کی اولاد میں سے ہوں، بلکہ وہ اسی کو میری مذمت کا جواز بنالیتا تھا۔ ''اس شخص کو دیکھو، حضرت زین العابدین کی اولاد ہو کر کہتا پھرتا ہے کہ زمین گھومتی ہے۔'' پھر وہ لوگوں سے کہتا، ''بھلا بتاؤ، تم میں سے کسی نے کبھی اپنے گھر کے مشرقی رخ کے دروازے کو اچانک مغرب کی طرف گھومتے دیکھا؟''

جیسا کہ میں نے بتایا، شیخ محمد سعید کو دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا تھا اور میں چیخ پڑنے کو تھا کہ وہ قاتل ہے، وہ محمد ویس کے ذہن میں وہ زہر بھر رہا ہے جو اس کو چالیس دن میں مار ڈالے گا۔ تاہم میں نے ضبط سے کام لیا۔ اس طرح بگڑ کر میں شیخ کے خلاف کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ وہ ہمیشہ کی طرح اسی زمین کی گردش والی دلیل سے ثابت کر دیتا کہ کس دیہاتی نے اپنا مشرقی رخ والا دروازہ مغرب کی جانب گھومتے دیکھا ہے؛ پس ثابت ہوا کہ زمین نہیں گھومتی۔ میرے خلاف کینہ رکھنے پر اللہ اس پر رحم کرے، اور محمد ویس اگر کل صبح تک شیخ محمد سعید کے زیرِ اثر رہے تو اللہ اس پر بھی رحم کرے۔ غم اور غصے کے مارے دل پر ایک بوجھ لیے میں اسکول لوٹ آیا۔

میرے کہنے کے مطابق چوکیدار عطاء اللہ نے مجھے منھ اندھیرے اٹھا دیا۔ میں اپنے ساتھ دمشق سے تین چتی دار ناشپاتیاں لایا تھا جو میں نے رات کو ہوا کے رخ پر رکھے مٹکے کے نیچے رکھ دی تھیں۔ ان میں

سے ایک ناشپاتی اٹھا کر میں لپکتا ہوا محمد ویس کے گھر پہنچا۔ سوائے ان بھیڑ بکریوں کے جو اپنے مالک کی موت کے نتیجے میں خود اپنی موت کی منتظر کھڑی تھیں، احاطے میں کوئی نہیں تھا۔ زنان خانہ روشن تھا اور رونے کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ محمد ویس کا کمرہ بند تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ وہ موت کے انتظار میں عبادت کرتے کرتے تھک کر سویا پڑا ہے۔ کئی بار میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، پھر دھکا دے کر دروازہ کھولتے ہوئے چلا کر کہا:

''محمد ویس، اللہ کی حمد وثنا کرو!''

وہ نیند سے چونک پڑا اور چیخا، ''کیا ہوا؟''

''میں ہوں، استاد نا جی۔ ڈرو نہیں، محمد ویس، اور میری بات سنو۔''

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور بہہ بہہ کر اس کے رخساروں سے ٹپک رہے تھے اور وہ سہا ہوا گم سم بیٹھا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں میری بات سننے سے پہلے ہی اس کا دم نہ نکل جائے، میں نے کہا:

''میں تمھارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ میرے جد امجد حضرت زین العابدین نے مجھے بیدار کر کے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ آپ پر اللہ کی رحمت ہو، آپ نے مجھے حکم دیا: محمد ویس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اللہ نے اس کو آزمائش میں ڈالا تھا اور جان لیا کہ وہ توبہ کرنے والا بندہ ہے۔ اس کو یہ پھل دینا، یہ بہشت کے میووں میں سے ہے، اور حکم دینا کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے دو رکعت نماز تمھارے ساتھ ادا کرے اور پہلی رکعت میں سورۂ نصر پڑھے۔ اللہ اس کی عمر اتنی دراز کرے گا کہ وہ نہ صرف اپنے بچوں کی، بلکہ بچوں کے بچوں کی خوشیاں بھی دیکھے گا۔''

محمد ویس نے تھوک نگلا۔ یوں دکھائی دیا جیسے میری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بس میرے ہاتھ میں دبی ہوئی ناشپاتی کو گھورتا رہا۔ (مجھے یقین تھا کہ بستی میں کسی نے بھی چتی دار ناشپاتی نہیں دیکھی تھی۔) میں نے ناشپاتی چھیل کر اس کو کھلائی اور بیج سمیت نگل جانے کو کہا۔ پھر میں اسے کھینچ کر کمرے کے کونے میں لے گیا۔

''محمد ویس، سورج نکلنے سے پہلے نماز کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''مگر استاد نا جی، میں وضو سے نہیں ہوں۔''

مجھے یاد آیا کہ میں نے بھی وضو نہیں کیا تھا، مگر اس خوف سے کہ کہیں میرے مشورے کا اثر زائل نہ ہو جائے، میں نے سمجھایا:

''تیمم کرلو محمد ویس، اس کی اجازت ہے۔ مارو ہاتھ زمین پر۔''

محمد ویس کے ساتھ کھڑے ہوکر میں نے بھی نماز پڑھی۔ ہم نے دو رکعت نماز ادا کی اور پہلی رکعت میں اس نے سورۂ نصر پڑھی۔ پھر میں لوٹ کر اسکول آ گیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر پوری بستی کو محمد ویس کی نئی بشارت کا علم ہوگیا۔ وہ تمام لوگ جو کل محمد ویس کے احاطے میں جمع تھے آج اسکول کے احاطے میں جمع ہو گئے۔ اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کہ آیا واقعی میرے جدامجد حضرت زین العابدین خود میرے پاس محمد ویس کی بریت لے کر آئے تھے، وہ سب ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ اس وقت مجھے لگا کہ آج میں نے شیخ محمد سعید پر واضح فتح حاصل کر لی، کیونکہ نہ تو محمد ویس مرا اور نہ اس کی بھیڑ بکریاں ذبح ہوئیں بلکہ وہ سب حضرت زین العابدین کی اولاد، ولی اللہ استاد ناجی کی، یعنی میری نذر کر دی گئیں۔

مگر کیا یہ واقعی میری فتح تھی؟ سچ بات یہ ہے کہ مجھے اس کا یقین نہیں۔ اس فتح کی حقیقت پر شک کا سبب یہ ہے کہ میں شیخ محمد سعید کے مقتدیوں میں سے ایک بھی کم نہ کر سکا، بلکہ الٹا میں نے ان میں ایک کا اضافہ ہی کر دیا، مدرس کا، یعنی خود اپنا۔ اپنے جدامجد کے ناموس کو قائم رکھنے کی خاطر، جن کے نام سے میں نے اپنا خواب گھڑا تھا، اب میں بھی شیخ محمد سعید کے پیچھے نماز پڑھنے پر مجبور ہوں، تیمم کر کے نہیں، باقاعدہ وضو کر کے۔

زکریا تامر

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

دسویں دن کے شیر

پنجرے میں بند شیر سے جنگل بہت دور دراز کے فاصلے پر رہ گئے تھے مگر وہ ان کو بھول نہیں پایا تھا۔ پنجرے کے چاروں طرف جمع لوگوں کو وہ غصے سے گھور رہا تھا اور وہ اس سے خوف کھائے بغیر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ان لوگوں میں سے ایک پر سکون لیکن پر تحکم آواز والا شخص باقی لوگوں سے کہتا ہے، ''اگر تم واقعی چاہتے ہو کہ میرا پیشہ، یعنی سدھانے کا پیشہ، اختیار کرو تو کسی بھی وقت تم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمھارا پہلا نشانہ مدمقابل کا پیٹ ہو۔ اور تم دیکھ لوگے کہ یہ پیشہ بیک وقت مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔

''اس شیر کو دیکھو۔ یہ ایک خوفناک اور خودسر شیر ہے۔ اس کو اپنی آزادی، اپنی طاقت اور اپنی بے جگری پر بڑا ناز ہے۔ مگر یہ بدل جائے گا اور معصوم بچے کی مانند بڑا شریف، نرم خو اور فرماں بردار بن جائے گا۔ جس کے پاس کھانا ہے اور جس کے پاس کھانے کو نہیں، ان دونوں کے مابین کیا ہوتا ہے، اب دیکھنا اور سیکھنا۔''

ان لوگوں نے فوراً ہی جواب دیا کہ وہ دل لگا کر سدھانے کا کام سیکھیں گے اور سدھانے والا خوش ہو کر مسکرایا اور شیر سے مخاطب ہو کر طنزیہ انداز میں پوچھنے لگا ''اور ہمارا پیارا مہمان کس حال میں ہے؟''

شیر بولا، ''کھانا لاؤ۔ اب میرے کھانے کا وقت ہے۔''

بناوٹی حیرت سے سدھانے والا بولا ''تم مجھ پر حکم چلا رہے ہو جب کہ تم میرے قیدی ہو؟ خوب، دلچسپ شیر ہو تم۔ اب تم کو جان لینا چاہیے کہ کہ یہاں صرف مجھے حکم چلانے کا حق ہے۔''

''شیر کو کوئی حکم نہیں دیتا،'' شیر نے جواب دیا۔

''مگر اب تم شیر کہاں ہو،'' سدھانے والے نے کہا۔ ''جنگل میں رہے ہو گے، پر اب تم تو پنجرے میں ہو۔ اب تم غلام ہو جو صرف حکم مانتے ہیں اور جو میں کہوں وہ کرتے ہیں۔''

''میں کسی کا غلام نہیں بنوں گا،'' شیر نے طیش میں آ کر کہا۔

''تم میرا حکم ماننے پر مجبور ہو۔ کھانا تو میرے پاس ہے،'' سدھانے والے نے کہا۔

شیر بولا: ''نہیں چاہیے مجھے تمھارا کھانا۔''

''تمھاری مرضی، تو رہو بھوکے،'' سدھانے والے نے کہا۔ ''میں تمھاری مرضی کے خلاف کچھ کرنے پر مجبور نہیں کروں گا۔'' اور اپنے شاگردوں سے بولا، ''دیکھنا کیسا بدلتا ہے۔ اکڑ میں تنا ہوا سر بھوک نہیں مٹا سکتا۔''

شیر بھوکا رہا اور ان دنوں کی ہُڑک میں اداس اداس رہا جب وہ آزادی سے آندھی طوفان کے مانند اپنے شکار کے لیے جدھر جی چاہتا جھپٹ سکتا تھا۔

دوسرے دن سدھانے والے اور اس کے شاگرد شیر کے پنجرے کے گرد جمع ہوئے تو سدھانے والے نے کہا، ''بھوک نہیں لگ رہی؟ بے شک تمھاری بھوک اب تمھارے لیے تکلیف اور اذیت کا سبب ہے۔ کہہ دو کہ تم بھوکے ہو اور جو سا گوشت تم کہو گے تم کو مل جائے گا۔''

شیر کچھ نہ بولا تو سدھانے والے نے کہا، ''بے وقوف مت بنو۔ جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ بس مان لو کہ تم بھوکے ہو، اور فوراً ہی پیٹ بھر کر کھاؤ۔''

شیر نے کہا، ''میں بھوکا ہوں۔''

سدھانے والا ہنسا اور اس نے اپنے شاگردوں کو بتایا، ''دیکھو، اب یہ ایسے دام میں آ گیا کہ نکل نہیں سکتا۔''

اس نے حکم دیا اور شیر کو بہت سا گوشت کھانے کو دیا گیا۔

تیسرے دن سدھانے والے نے آ کر شیر سے کہا، ''آج بھی کھانا چاہتے ہو تو جو میں کہوں وہ کرو۔''

''میں تمھارا حکم نہیں مانوں گا،'' شیر نے جواب دیا۔

''اتنی جلد بازی مت کرو۔ میں جو چاہتا ہوں وہ بہت ہی معمولی سی بات ہے۔ تم اس وقت پنجرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے ہو۔ جب میں کہوں کہ رک جاؤ تو بس تم رک جانا۔''

یہ تو بہت معمولی سی درخواست ہے، شیر نے دل میں کہا۔ ایسی بھی نہیں کہ میں اس پر اڑ جاؤں اور بھوکا مروں۔

بہت درشت اور تحکمانہ لہجے میں سدھانے والا چلایا، ''رک جاؤ!''

شیر فوراً ہی منجمد ہو گیا اور سدھانے والے نے خوش ہو کر کہا، ''شاباش!''

شیر بھی خوش تھا۔ اس نے ندیدوں کی طرح کھایا۔ اس اثنا میں سدھانے والے نے اپنے شاگردوں سے کہا، ''کچھ دنوں کی بات ہے، یہ کاغذی شیر بن جائے گا۔''

چوتھے دن شیر نے سدھانے والے سے کہا، ''بھوک لگ رہی ہے، مجھ سے رک جاؤ کہو۔''

سدھانے والا اپنے شاگردوں سے بولا، ''اب یہ میرے حکم پسند کرنے لگا ہے۔'' پھر اس نے شیر سے کہا، ''آج تم کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤ گے جب تک تم بلی کی طرح میاؤں میاؤں نہیں کرتے۔''

شیر نے غصے کو قابو میں رکھا اور دل میں کہا: بلی کی نقل کر کے تو میں اپنا ہی دل بہلاؤں گا۔

اس نے فوراً ہی بلی کی نقل میں میاؤں میاؤں کیا مگر سدھانے والے نے تیوری چڑھالی اور بگڑ کر بولا، ''تمھاری نقل بالکل اچھی نہیں۔ تمھارے خیال میں بلی کی آواز کیا دہاڑنے سے ملتی جلتی ہوتی ہے؟''

چنانچہ شیر نے پھر سے بلی کی نقل کی، مگر سدھانے والے نے ناپسندیدگی کا اظہار جاری رکھا اور حقارت سے بولا، ''چپ ہو جاؤ۔ تمھاری نقل اب بھی بالکل ردّی ہے۔ آج تمھیں مشق کا موقع دیا جاتا ہے۔ کل آ کر امتحان لوں گا۔ اگر تم کامیاب ہوئے تو کھانا ملے گا ورنہ بھوکے رہنا۔''

سدھانے والا پنجرے کے پاس سے اپنے شاگردوں کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ وہ سب آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ شیر نے دہاڑ کر جنگلوں کو یاد کیا مگر وہ بہت دور تھے۔

پانچویں دن سدھانے والے نے شیر سے کہا، ''چلو اگر آج تم نے ٹھیک ٹھیک میاؤں میاؤں کر لیا تو تازہ گوشت کا بہت بڑا پارچہ ملے گا۔''

شیر نے بلی کی نقل کی اور سدھانے والے نے خوشی کے اظہار میں تالیاں بجائیں اور بولا، ''تم عظیم ہو! تم نے تو بالکل اس طرح میاؤں میاؤں کیا جیسے بلیاں جاڑوں میں کیا کرتی ہیں۔'' اور اس نے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کی طرف اچھال دیا۔

چھٹے دن جوں ہی سدھانے والا شیر کے پنجرے کے سامنے پہنچا، شیر نے بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنا شروع کر دیا۔ مگر سدھانے والا بالکل چپ رہا اور اپنی تیوریاں چڑھائے رکھیں۔

''دیکھا میں نے میاؤں میاؤں کیا،'' شیر نے کہا۔

''گدھے کے رینکنے کی نقل کرو،'' سدھانے والا بولا۔

''میں، جس سے جنگل کے سارے جانور خوف زدہ رہتے ہیں، شیر ہو کر گدھے کی نقل کروں؟'' شیر نے برہمی سے کہا۔ ''ایسا کرنے کے بجائے مر جانا بہتر ہے۔''

سدھانے والا کچھ کہے سنے بغیر پنجرے کے پاس سے ٹل گیا۔

ساتویں دن وہ مسکراتا ہوا شیر کے پنجرے کے قریب آیا اور شیر سے بولا، ''کیوں بھئی، کھانا نہیں چاہیے؟''

''کیوں نہیں؟ چاہیے کھانا،'' شیر نے جواب دیا۔

سدھانے والے نے کہا: ''جو گوشت تمھیں ملے گا اس کی کچھ قیمت ہے۔ گدھے کی طرح رینکو گے تو کھانا ملے گا۔''

شیر نے جنگل کو دھیان میں لانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا تو آنکھیں بند کر کے رینکنے لگا۔

''تمھارا رینکنا بالکل برا ہے،'' سدھانے والے نے بتایا، ''مگر خیر، تم پر رحم کھا کر میں تمھیں ایک ٹکڑا گوشت کا دے دیتا ہوں۔''

آٹھویں دن سدھانے والے نے شیر سے کہا، ''میں تقریر کرنے جا رہا ہوں۔ جب وہ ختم ہو تو تم تالیاں بجانا۔''

پھر سدھانے والے نے تقریر کی، ''ہم وطنو، ہم نے پہلے بھی متعدد مواقع پر ان معاملات پر جو ہمارے مستقبل سے متعلق ہیں، اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔ ہماری مخالف قوتیں جتنی سازشیں چاہیں کر لیں، مگر ہم اپنے اس پُرعزم اور دوٹوک موقف سے سرمو انحراف نہیں کریں گے۔ یقین محکم ہی سے ہم فتح یاب ہوں گے۔''

''میں تمھاری بات نہیں سمجھا،'' شیر نے کہا۔

''تمھارا کام بس یہ ہے کہ جو کہا جائے اس کی تعریف کرو اور تالیاں بجاؤ،'' سدھانے والے نے کہا۔

''معاف کرنا،'' شیر بولا، ''میں تو جاہل اور ناخواندہ ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا وہ مجھے عجیب سا لگا۔ اگر تمھاری خواہش یہی ہے تو میں ضرور تالیاں بجاؤں گا۔'' شیر نے تالیاں بجائیں اور سدھانے والے نے کہا: ''مجھے نہ منافق پسند ہیں نہ منافقت۔ سزا میں آج تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔''

نویں دن سدھانے والا گھاس کا ایک گٹھا لے کر آیا اور شیر کے سامنے ڈال کر بولا، ''لو کھاؤ!''

''کیا؟ یہ کھاؤں؟'' شیر بولا۔ ''میں تو درندہ ہوں۔''

سدھانے والے نے کہا، ''آج کے بعد سے تم گھاس کے سوا کچھ نہیں کھاؤ گے۔''

بھوک جب برداشت سے باہر ہو گئی تو شیر نے گھاس ہی کھانے کی کوشش کی، مگر اس کا مزہ اس کو برا لگا تو وہ مارے حقارت کے الگ ہٹ گیا۔ تاہم وہ بار بار پلٹ کر آیا اور رفتہ رفتہ اس کو مزہ اچھا لگنے لگا۔

دسویں دن نہ سدھانے والا تھا نہ اس کے شاگرد، نہ شیر تھا نہ اس کا پنجرہ۔ شیر شہری بن گیا اور پنجرہ شہر۔

محمد برّادا

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

قسطوں میں حیات

ہم دیر سے جاگے اور بستر میں پڑے پڑے جماہیاں لیتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہڈیوں کا جوڑ جوڑ الگ ہوجائے گا۔ یہ نظر آرہا تھا کہ آج کا دن بھی پچھلے گذرے ہوئے دنوں ہی کی طرح گذرے گا۔ ہم نے اپنا سر چوبی سرہانے پر ٹکا دیا۔ ہماری نظر دھندلی ہورہی تھی اور بلاشبہ ہمارا چہرہ بھی پیلا پڑا ہوا تھا۔ ہم ڈاکٹر سے اس سلسلے میں رجوع کر چکے تھے۔ اس سے اپنی شکایت کہی تھی جس پر اس نے سیانوں کی طرح سر ہلا کر کہا تھا:

''تم اکیلے نہیں ہو۔ تمھاری طرح کے وہ تمام افراد جو غور وفکر میں مبتلا رہتے ہیں اور خواب دیکھتے رہتے ہیں اور حال سے مطمئن نہیں ہوتے، اسی مرض کا شکار ہوتے ہیں۔''

ہمیں یاد آیا ایسا ہی جواب کسی ڈاکٹر نے— غالبًا ہمارے ہی ڈاکٹر نے— ہمارے ایک دوست کو بھی دیا تھا جو اس کے پاس بدہضمی اور سینے کی جلن کی شکایت لے کر گیا تھا۔

''کوئی علاج بھی ہے ڈاکٹر؟''

''میں تم کو چند گولیاں دے دیتا ہوں جن سے تمھیں افاقہ ہوگا۔ لیکن زیادہ خوش فہمی میں مت پڑنا۔ ہر صبح جیسے ہی آنکھ کھلے، ذہن پر زور دے کر کوئی ایسا دلچسپ قصہ یاد کرنا جس سے تم باچھیں پھاڑ کر مسکرا سکو، اور پھر بستر سے کودنا اور بلند آواز سے گانا۔ ایسے موقعے پر بے سری آواز بھی چلے گی۔''

ہم نے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کے ارادے سے اپنی یادداشت کے کونے کھدروں میں کسی ایسے قصے کو تلاش کیا جو ہمیں ایک دم لوٹ پوٹ ہوجانے پر مجبور کردے۔ ہماری ایک ولایتی پڑوسن اکثر و بیشتر خوش وقتی کے لیے ٹیکسی پکڑ لیتی تھی، حالانکہ خود اس کے پاس کار تھی۔ سیر سپاٹے کے بعد جب

ٹیکسی بلڈنگ کے دروازے پر رکتی تو وہ یہ ظاہر کرتی کہ پیسے تو گھر ہی پر رہ گئے۔ پھر وہ اتر کر پیسے لینے بلڈنگ میں چلی جاتی اور اوپر جا کر غائب ہوجاتی، اور وہ بے چارہ ٹیکسی والا ہارن بجاتا رہتا۔ بلڈنگ والے جھانک جھانک کر دیکھتے کہ اسے کیا ہوگیا۔ عورت کا گھر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ ٹاپتا رہ جاتا اور بک جھک کر چل دیتا۔ اور وہ عورت اپنے کمرے میں ہنس ہنس کر دوہری ہوجاتی۔ ہی ہی ہی! ہاہاہاہا! اس قصے کا یاد آنا تھا کہ ہم خوب ہی ہنسے اور دل ہی دل میں اپنی اس ہوشیار پڑوسن کے ممنون ہوے۔ پھر ہم اپنے بستر سے کودے اور گاتے ہوے اپنی طویل تعطیل کا ایک نیا دن شروع کیا۔

اپنے بھرے پرے کتب خانے میں ہم دیر تک بے مقصد ٹہلتے رہے۔ ہم نے دیکھا کہ اس میں بیشتر کتابیں وہ ہیں جنھیں ہم نے بعد کے لیے اٹھا رکھا تھا کہ جب فرصت ملے گی تو ان کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ہمارا ہاتھ ایک سرخ جلد کی طرف بڑھ گیا جس کا مصنف چالیس برس قبل مراکش کے مدینۃ الاحمر میں رہتا تھا۔ وہ کتاب محمد ابن عبداللہ المعقط کی ''سفرنامہ مراکش عرف افعال شنیعہ کا عصری عکس، المعروف بہ تارک سنت کے خلاف تیغ بے نیام'' تھی۔

— پھر شیخ عبدالہادی نے ارشاد کیا، ''جس نے سوال کیا اور جس سے سوال کیا گیا، ہر دو فرد دسویں صدی کے لوگوں میں سے تھے۔ اب ذرا ہمارے اس زمانے کو قیاس کرو، جو مثل ایک طویل شب مظلمہ کے ہے، کہ بات کتنی نہ بڑھ چکی ہوگی! سرداران قوم کو لو تو انھوں نے رعیت کو ظلم کے سوا کیا دیا؟ گوشت انھوں نے نوچ لیا اور خون پی گئے۔ ہڈیوں کا گودا تک وہ چوس گئے اور دماغ چٹ کر گئے اور رعیت کے لیے نہ دنیا چھوڑی نہ دین۔ متاع دنیا کو لو تو انھوں نے سب کچھ سمیٹ لیا، کچھ نہ چھوڑا، اور دین کی پوچھو تو ان کا منھ اس سے موڑا۔ یہ سب ہمارے مشاہدے کی باتیں ہیں، فقط باتیں ہی باتیں نہیں...''

ابوزید نے سوال کیا، ''اللہ آپ کو توفیق دے، کیا ایسے دیار میں قیام کرنا جائز ہے جہاں کوئی منکرات کی نہی کرنے پر قادر نہ ہو؟''

ذہن کو مطالعے سے کوئی سکون نہیں ملتا۔ قدیم جدید نظر آتا ہے اور جدید قدیم، مگر دماغ اس کے ناممکن ہونے پر احتجاج کرتا ہے؛ وہ یہ مان کر ہی نہیں دیتا کہ ''سورج نور سے عاری ہے۔'' ہم نے خود سے کہا کہ شاید اس کا سبب بے زاری، تعلقات کی طوالت، گہرے رموز کا افشا، التباسات کی اصلیت کا کھل جانا، خوابوں کا بکھر جانا، آئندہ سے لگاؤ اور حال سے بے نیازی ہو۔ ہم کو چاہیے کہ نفس کو صبر کا خوگر بنائیں اور بار بار دوہرائے جانے والے معمولات کے ساتھ لمحۂ موجود کو بالتفصیل گذاریں۔

کھانے پر ہمارے مہمان ہمارے ایک عزیز تھے جو ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ انھوں نے اوائل عمر ہی

میں قرآن حفظ کرلیا تھا، اس کے ایک ایک لفظ سے واقف تھے اور آخر کو موذن ہو گئے تھے۔ ایک برس قبل جب ان کی اہلیہ نے وفات پائی تو انھوں نے اپنی ایک اَور عزیزہ کو عقد کے لیے منتخب کرلیا، کہ موذن کو مجرد رہنے کی اجازت نہیں، مگر انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ یہ فریضہ وہ حج سے واپسی کے بعد ادا کریں۔ ان کی غیر موجودگی میں خدائی فوجداروں نے مداخلت کی اور اس خاتون کا نکاح کسی اور سے کروادیا۔ چنانچہ وہ اب بھی رشتے کی تلاش میں تھے۔

''الحمداللہ کہ تم خیر سے ہو۔ بندے کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور کیا حال ہیں؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ ٹھیک ٹھاک۔ ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اور صاحب زادے کس حال میں ہیں؟ کام میں دل لگاتے ہیں؟''

''انھیں سے پوچھیے، خود بتائیں گے۔ ہمیں تو کام چور دکھائی پڑتے ہیں۔''

''بڑے شرم کی بات ہے بیٹا! کاش تم اپنے چچا عبدالرحمٰن کے نقشِ قدم پر چلتے۔''

ان کے الفاظ نے گویا ہمارے ذہن میں کسی بھولی بسری یاد کو بیدار کردیا۔ ہم نے پوچھا:

''وہی جو غرق ہو کر مرے تھے؟''

''ہاں، اور شہید بھی کہلائے تھے۔ جان لو کہ حدیث شریف کی رو سے تین قسم کے مردے شہید کا درجہ رکھتے ہیں: وہ جو آگ میں جل کر مرے، وہ جو پانی میں غرق ہوے، اور وہ جو کسی دیوار کے نیچے دب گئے۔''

اب ان کا روئے سخن صاحب زادے کی طرف ہوگیا۔ وہ ہر نوع اور ہر قسم کی ہدایتیں اور نصیحتیں سننے کا عادی تھا، اس لیے اس نے ذرا بھی ناگواری ظاہر نہیں کی۔

''تمھارا چچا عبدالرحمٰن ابھی اٹھارہ برس کا تھا کہ جملہ علوم میں طاق ہو چکا تھا...''

مسکراتے ہوے صاحب زادے نے قطع کلام کیا:

''میں تو ابھی سترہ برس کا بھی نہیں ہوا۔''

ہم نے مناسب طور پر اسے سرزنش کی:

''تمھارا کھوپڑا گدھے کے سر سے بھی زیادہ خالی ہے۔ جو ہم کہیں اسے گرہ میں باندھ رکھو۔ مستقبل تمھارا ہے۔ ہماری نصیحتوں پر عمل نہیں کروگے تو آپ بھگتوگے۔ تمھارا کیا خیال ہے، روزی کمانا کچھ آسان کام ہے؟ کچھ کے سروں پر ٹیکا ہوتا ہے تو دوسروں کے سروں پر کام کا سر بند۔''

حاجی صاحب نے اپنی بات جاری رکھی:

''عبدالرحمٰن — اللہ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے — جملہ علوم میں طاق تھا۔ اس کی خطاطی ازحد دیدہ زیب تھی۔ محکمۂ مالیات میں ملازم تھا اور کم عمری ہی سے جبہ اور عمامہ پہنتا تھا۔ مشاق پیراک اور

ماہر شہ سوار تھا۔ ایک مرتبہ ایک فقیہ، جو سُوس سے ہماری ملاقات کو آئے تھے، اس سے مل کر اس کی علمیت او ذہانت سے بہت متاثر ہوے۔ انھوں نے اس خوف سے کہ کہیں اس کو جن وانس کی نظر بد نہ لگ جائے، ایک تعویذ، جو حرز البحر اور دافع بلیات کہلاتا ہے، لکھ کر دیا کہ اپنے جبے پر پہنے رہے تاکہ بلیات سے محفوظ رہے۔''

گفتگو میں اپنی دلچسپی ظاہر کرنے کے لیے، گو اوپری ہی سہی، ہم نے کہا:

''اور اس تعویذ کے ہوتے ہوے وہ غرق ہو گئے؟''

''مشیت الٰہی! وہ رباط سے سالے آرہا تھا۔ وادیِ ابورقرق اس نے کشتی سے عبور کی تھی۔ پھر اس نے عمامہ اتار کر وضو کیا، ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر وہاں سے روانہ ہو کر ابھی بیس قدم گیا ہوگا کہ اس کا پیرنے کو جی چاہا۔ بس وہ اسی مقام کو لوٹا، اپنا لباس اتارا اور پیرنے لگا...''

حسب معمول مسکراتے ہوے صاحب زادے نے قطع کلام کیا:

''کیا اس زمانے میں لوگ ننگے ہی پیرتے تھے؟''

گو ہم کو یہ سوال معقول معلوم ہوا مگر یہ محل کسی اَور ردعمل کا متقاضی تھا۔ چنانچہ ہم نے صاحب زادے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور بے بسی کے اظہار میں کف افسوس ملا اور پورا زور لگا دیا کہ کہیں ہماری ہنسی نہ چھوٹ جائے۔

''نہیں، وہ لنگر باندھتے تھے۔ اُس دن اتفاق سے تعویذ دوسرے جبے میں رہ گیا تھا اور پانی میں اس کی مشاقی ذرا کام نہ آئی اور سمندر اب تک اس کو دبائے بیٹھا ہے۔''

یوں عبدالرحمٰن تو اپنی جان سے گیا، رہ گئے دونوں جہان کے علم، تو اس میں سراسر نقصان میں ہم رہے۔

ابھی کھانا ختم نہیں ہوا تھا مگر باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ ہم اپنے مہمان کو آرام سے نوالہ چباتے دیکھتے رہے۔ سوچتے رہے کہ اب کس موضوع گفتگو میں ان کو لگائیں۔ ہم کو چند واقعات اور اِدھر اُدھر کی باتیں یاد آئیں جو وہ اس سے پہلے ہمیں کئی مواقع پر سنا چکے تھے۔ بس یاد دلانے کی دیر تھی کہ وہ شروع ہو جاتے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے تھے کہ: اگلے وقتوں کے لوگ جب یہ نعرہ لگاتے تھے کہ ''عزت اور دولت سب مولاے عبدالعزیز کی'' تو واللہ دل سے لگاتے تھے۔ ان کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا؛ وہ سلطان مولاے عبدالعزیز اور آس پاس کے قبائل کی جنگ وجدال کے واقعات سلسلہ وار سنانا شروع کر دیتے یہاں تک کہ فرانسیسیوں کے ورود تک پہنچ جاتے۔ تاہم یہ سوچتے ہوے کہ یہ گفتگو اکتا دے گی، ہم نے مناسب سمجھا کہ خود انھیں کے بارے میں بات چھیڑی جائے۔ اذان دینے اور نماز پڑھنے کے علاوہ باقی وقت کیوں کر گذرتا ہے؟ حرمینِ شریفین سے واپسی کے بعد حشیش انھوں نے ترک کر دی تھی اور نئی اہلیہ کا بھی دور دور پتا نہیں تھا۔ آخر پھر وقت کس طرح کٹتا ہے؟ کیا وہ خود کو چلتی پھرتی لاش تصور کرتے ہیں؟ بظاہر اپنے اردگرد کی دنیا سے ان کا

تعلق بہت محدود تھا۔ وہ بس ادھر ادھر کی باتیں سن سنا کر اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ سنا دیا کرتے تھے، اور بات ختم یوں کرتے تھے کہ اللہ نے اختیار یوں تو سب کو دے رکھا ہے مگر اصل اختیار اُسی کا ہے۔

صاحب زادہ کھانے پر ندیدوں کی طرح گرتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت خالی الذہن ہو، مگر وہ آس پاس ہونے والی باتوں پر توجہ دیتا ہے، میکانیکی انداز ہی میں سہی۔ وہ سگریٹ کا مزہ، پڑوس کی لڑکیوں کا تعاقب اور فٹ بال کا چسکا بھی دریافت کر چکا ہے۔ تھوڑے سے استغراق کے بعد وہ گرما کی تعطیلات میں یوروپ کے سفر کی خواہش کا اظہار بھی کرتا ہے، چاہے اس کو وہاں پاپیادہ ہی کیوں نہ جانا پڑے، (جس سے اس کے سفر کے اخراجات میں اضافہ ہی ہوگا)۔

اور ہم؟ ہم بزرگوار اور صاحب زادے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہم ان کے دل میں آنے والے خیالات کا اندازہ لگا رہے ہیں، اردگرد کی دنیا سے ان کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد؟ قیلولہ۔ اور پھر؟ گھومیں پھریں گے، تازہ ہوا کھائیں گے۔ اور پھر؟ ہم اپنی رفیقہ کو ٹیلیفون کریں گے۔ کہیں ملیں گے، گپ لگائیں گے۔ ہماری حرارت بڑھے گی، جبلتیں کھل کھیلیں گی۔ پھر وہی بےزاری کا دور دورہ ہوگا۔ دونوں اپنی اپنی راہ لیں گے۔ پھر ہم اپنے دوستوں کے پاس جائیں گے۔ دنیا جہان کی باتیں کریں گے۔ کبھی مدح کریں گے کبھی ذم، اور یوں اپنے دل کا غبار نکالیں گے۔ مگر جب اپنی بےبسی کی انتہا کا اندازہ ہوگا تو سارا جوش بیٹھ جائے گا۔ ہم پھر سڑکوں پر نکل جائیں گے۔ عورتوں کے مدوّر اور بھرے بھرے جسموں کی جنبشیں دیکھ کر ہوس پھر سر اٹھائے گی۔ ہم اکثر اپنے متاہل احباب سے پوچھا کرتے ہیں، ''تو گویا تمھاری اہلیہ اپنی صنف کی قائم مقام ہوتی ہے؟'' ہم کو جواب یہ ملتا ہے، ''ہرگز نہیں، بیوی سے محبت رکھنے کے باوجود بیوی والوں سے زیادہ کوئی دوسری عورت کا خواہاں نہیں ہوتا۔'' ہم اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، عقل کے مطابق توجیہہ کرتے ہیں۔ سبب اس کا سراسر اختلاطِ مرد و زن، پُرکشش اشتہارات، میک اپ، اونچی ایڑی کی جوتی اور... اَور کیا ہے؟

ہم نے اس کو یہ بتایا تو اس نے سختی سے ٹوکا:

''سب بکواس۔ محبت کی مدد سے ہم ہوس کو زیر کر سکتے ہیں۔''

''اور محبت ہے کہاں؟''

''اچھا، تو تم بھی از قسم قنوطی ہو۔ مجھی کو لو'' اس کی کہانی بھی عام قسم کی نکلی۔ وہ اسے کسی بوڑھے سے بیاہنا چاہتے تھے تو اس نے خودکشی کی دھمکی دی، اور ان دونوں نے تا مرگ ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے وعدے وعید کیے وغیرہ وغیرہ۔

وہ ہماری بات سمجھا ہی نہیں؛ اس کے سامنے فرائڈ کا قول دوہرانے کا کیا فائدہ: ''میں خود کو اس خیال

کا خوگر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہر وصل میں چار افراد شریک ہوتے ہیں۔"

ہم غلو سے کام لیتے ہیں اور وہ لمحہ ہم کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ صرف بوالہوسی نہیں جو دہلاتی اور اکساتی ہے۔ ترغیب تو جرم میں، خودکشی میں، شراب میں اور انقلاب میں بھی ہوتی ہے، مگر یہ دوسری قسمیں ہمیں اتنا نہیں اکساتیں، کیوں کہ ان سے مانوسیت کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی۔ اور لکھنا؟

میں چپ تھا اور وہ جواب دینے پر مائل نہ تھے؛ بس تسبیح کے دانے گن رہے تھے۔ عبدالباسط نے عرض کیا: "میں ہمیشہ سے جانتا آیا ہوں کہ جناب کے مقال میں وہ تاثیر ہے کہ آپ کے روبرو بڑے بڑے لسان گنگ رہ جاتے ہیں اور ان کے دماغ لاجواب... آپ اپنے دل آویز ارشادات سے صبح شام ہمارے حوصلے کچھ یوں بلند کرتے ہیں کہ ان ارشادات کے خوش آئند نقوش ہمارے نفوس پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ ہم نے تو جناب کو مدام اسی حالت میں پایا۔ پھر اب کیا ہوا؟"

شام کو ہمیں پھر وہی احساس ہوا کہ ہڈیاں بکھری جا رہی ہیں، اور ایک دلگیر اداسی بھی طاری ہو گئی۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے ہم نے سوچا کہ ڈاکٹر کا وہی معروف نسخہ آزمایا جائے، مگر ہم کو تذبذب ہوا کہ ڈاکٹر نے وقت کا تعین کر دیا تھا: شام نہیں، صبح۔ تو کوچہ کوچہ آوارہ گردی کریں گے اور عوام الناس کے چہروں کو تاڑیں گے، شاید کوئی علاج سوجھ جائے۔ ہم کافی دیر گردش میں رہے۔ کیفے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ بیئر کی بوتلیں چشم زدن میں خالی ہو رہی ہیں۔ قہقہے گونج رہے ہیں۔ ہر دم چلتی ہوئی رس نکالنے کی مشینیں کھڑکھڑا رہی ہیں۔ اس کے باوجود ہماری اداسی ہے کہ اَڑی کھڑی ہے، جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کاریں تیز رفتاری سے گذرتی ہیں۔ بسیں ست اور ٹھسا ٹھس بھری ہوئی ہیں۔ سنیماؤں پر قد آور ہیرو اشتہار بنے کھڑے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہمارے چاروں طرف ہر شخص بھاگا چلا جا رہا ہے۔ جی چاہا ان کو روکنے کے لیے چلائیں، "تم بھاگے جا رہے ہو!" مگر یہ خیال احمقانہ اور بے جواز سا لگا۔ ہم نے دل سے پوچھا، "کسی شے کو ثبات بھی ہے؟" پھر ہم اس حیات کی کہانی قلمبند کرنے کے لیے جو ہم قسطوں میں جیتے ہیں، گھر لوٹ آئے۔

میفع عبدالرحمٰن

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

میرے اور انیسہ کے بیچ

''اس کی تو ماں بھی جوان ہے۔ تیس سے اوپر کی نہیں۔''

یہ بات میری والدہ میرے والد سے کہہ رہی تھیں مگر ان کی نظر چھت پر ٹکی تھیں۔ ''بیٹی اگر چودہ برس کی ہے تو ماں کی عمر اس کی شادی کے وقت کیا رہی ہوگی؟ وہ بھی اس وقت بالغ نہیں ہوئی ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟''

والد نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن انھوں نے چھت کی طرف نگاہیں اٹھائیں جہاں والدہ کی نظریں جمی تھیں، اور انھیں نیچے اتار لائے۔ پھر سختی سے ان سے نظریں ملائیں۔ والدہ سمجھ گئیں اور اپنی کوشش کی ناکامی پر مایوس نظر آنے لگیں۔ لیکن والد نے کوشش کی کہ ان کی مایوسی کا بادل چھٹ جائے۔

''اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پاس پیسہ ہے،'' انھوں نے جلدی سے کہا، ''قط☆ کا کھیت ہے اور مویشی بھی ہیں۔''

مجھے معلوم تھا والد مجھے اپنی طاقت سے مرعوب کرنا چاہ رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی پتا تھا کہ میری خالہ پہاڑیوں کی جانب جا چکی ہیں (مجھ سے میرے اپنے پیسوں میں سے پانچ دینار لے کر) انیسہ سے میری بات پکی کرنے۔

کچی موسمی ملازمت میں چھ برس (یعنی اپنی عمر کا ایک تہائی) گذارنے کے بعد، جب کہ مجھے کم ترین اجرت ملتی تھی اور اگر محکمۂ زراعت کے اکاؤنٹس کے شعبے میں ذرا سی گڑبڑ ہو جائے تو میری شامت آ جاتی تھی، اب کہیں جا کر میری زرعی مزدور کی نوکری پکی ہوئی تھی۔ گزشتہ چھ مہینوں میں میں کچھ رقم پس انداز کر

☆ قط ایک بوٹی ہے جسے یمن میں تمباکو کی طرح چبایا جاتا ہے۔ قط چبانے کی محفلیں اپنے آداب اور قرینے کے لیے مشہور ہیں جہاں بعض صورتوں میں شعر و شاعری اور موسیقی کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

پایا تھا۔ کتنی رقم؟ اس کا مجھے خفیف سا ہی اندازہ تھا کیونکہ یہ معاملہ جس خزانچی کے ہاتھ میں ہے وہ میری والدہ ہیں۔

والد کا کہنا ہے کہ ان کے پاس پیسہ ہے، اور سچ یہ ہے کہ وہ بڑ نہیں ہانک رہے لیکن ان کا اشارہ کسی اور طرف ہے جو میں اور میری والدہ قدرتی طور پر سمجھتے ہیں۔ اسی لیے میں بچت کر رہا ہوں کہ کچھ خود مختار ہو سکوں۔ اگر کامیاب ہو گیا تو والد صاحب سے درخواست کر سکوں گا کہ اب وہ ہم پر حکم چلانے کی گراں ذمے داری سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن مزاروں کے سائے میں ہمارے گاؤں والے آرام کرتے اور قط چباتے ہیں وہاں میرے اس مشورے پر شاید سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا۔

پھر بھی میں نے محنت کر کے بچت کی تھی تاکہ والد صاحب سے آزادی حاصل کر سکوں۔ اس بچت میں سے پانچ دینار میں نے انیسہ سے اپنی بات پکی کرانے کے لیے نکالے تھے۔

''انیسہ!'' اس کے باپ نے اس سے کہا، ''ایک اچھا نوجوان تمھارا رشتہ مانگ رہا ہے۔''

''کیا ماں اسے جانتی ہے؟''

''وہی ہے جو تم سے سگریٹ خریدنے آیا تھا، جمعے کے دن، جب میں مسجد گیا ہوا تھا۔''

''مجھے تو یاد نہیں۔ کیا جہاف کا ہے؟''

''نہیں نہیں الازارق کا ہے۔ اچھے خاندان کا۔ کہتے ہیں باعزت پیسے والا گھرانہ ہے۔''

جب سے میری خالہ نے انیسہ کی بات چھیڑی تھی دن بہت سست رفتاری سے گذر رہے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں بڑے دباؤ میں آ گیا ہوں۔ ایک طرف انیسہ کا انتظار تھا اور دوسری طرف دوسری لڑکیوں، دف نواز کی اور خاکروب کی بیٹیوں، کے بارے میں پراگندہ خیالات ذہن میں چکر لگاتے رہتے تھے — ساعدہ، امینہ اور قبول، ایک سے بڑھ کر ایک کم رُو اور قابلِ حصول۔

''یہ رہے پچاس دینار،'' میں نے بڑے احترام سے والد صاحب کی داڑھی چھو کر کہا۔ ''میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

پہلے انھوں نے مجھے جھٹک کر دور کر دیا۔ پھر پیسے لے کر یوں گویا ہوئے جیسے کوئی راز فاش کر رہے ہوں۔ ''جانتے ہو، شادی میں بہت رقم خرچ ہوتی ہے۔ کسی دف نواز کی بیٹی سے تو تمھاری شادی ہو نہیں رہی۔''

انھوں نے ایک گائے اور ایک بچھڑے کو فروخت کیا۔ سو دینار ادھار لیے اور میرے چچاؤں اور دعاؤں کے ساتھ جہاف کی پہاڑیوں کی طرف چلے۔ وہاں وہ میرے خالو اور خالہ سے ملے جنھوں نے پہلے

انیسہ کی بات چھیڑی تھی۔ مگر انیسہ کی ماں نے معذرت کرلی کہ وہ اتنی جلدی انیسہ کی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ انیسہ ابھی نابالغ ہے۔ ابھی تو اس کی چودھویں سالگرہ بھی نہیں ہوئی۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ انیسہ کی ماں نے میری خالہ سے یہ بات پہلے بھی کہی تھی لیکن خالہ نے نہ کبھی اس کا ذکر کیا اور نہ میرے پانچ دینار لوٹائے۔

قصہ یوں شروع ہوا تھا: ایک دن معمول کے مطابق خالہ ہمارے گھر مہمان آئی تھیں۔ کیونکہ میں گھر پہ موجود تھا اس لیے مجھے بھی اپنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ ان کے پاس بیٹھنا پڑا۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں، پھر انھوں نے شادی بیاہ، خصوصاً ان کے اپنے گاؤں میں ہونے والی شادیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب اگلی بات کیا کہی جائے گی۔ اس مقام پر خالہ شادیوں کے بارے میں ہنسی مذاق شروع کر دیتی تھیں اور اس مذاق کا ہدف ہمارا خاندان بھی بن جاتا تھا۔ اگر مذاق کا رخ میری کسی بہن کی طرف ہوتا تو وہ چاہے یا نہ چاہے کچھ ہی دنوں میں دلہن بن جاتی تھی۔ میری تین بہنوں کی اسی طرح شادیاں کر ڈالی گئی تھیں۔ میں کسی بھی دوسرے شخص کی جوڑ توڑ کے ذریعے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے ایسا ظاہر کرتا جیسے مجھے شادی سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ والدہ اور خالہ اسے سچ سمجھ بیٹھی تھیں کیونکہ یہ بالغ مردوں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ شادی کے خواب تو میں دن رات دیکھتا تھا — ممکن ہو تو گاؤں کی تمام لڑکیوں کے ساتھ شادی کے خواب!

اس دن بھی جب خالہ نے اس موضوع پر ہلکا پھلکا مذاق شروع کیا تو میں اٹھنے لگا۔ لیکن وہ مجھ سے زیادہ مستعد نکلیں۔ انھوں نے میری گردن دبوچ لی۔

''تو تم اب بڑے ہو گئے ہو اور اترانے لگے ہو، کیوں؟'' انھوں نے مذاق ہی مذاق میں ڈانٹ پلائی۔ ''تم ہمارے ہاں کبھی آتے کیوں نہیں؟ کیا جہاف تمھیں اتنا دور لگتا ہے؟''

صاف ظاہر تھا کہ انھوں نے میری شادی کا معاملہ طے کرلیا ہے اور اب میری خیر نہیں۔ میں نے اتنے دن نہ آنے کی معافی مانگی، جس کے بعد جلد آنے کا وعدہ کرنا ہوتا ہے، سو وہ بھی کیا۔ مطلب یہی بنا کہ میں ان کے ہاتھوں اپنا بیاہ کروانے پر رضامند ہو رہا ہوں تاکہ میرے دماغ پر روز افزوں سوار اس مسئلے کا خاتمہ ہو سکے۔ اپنی حماقت میں میں خود کو خالہ کی ہمدردیوں سے بالاتر سمجھ بیٹھا تھا۔ میں کنوارا رہنے سے تنگ آ چکا تھا اور اپنے آپ سے، اور اس خوش فہمی سے کہ میں اپنی دلہن خود ڈھونڈ سکوں گا — بالکل تنگ۔ اور اس تمام عرصے میں خالہ نہایت قابلِ رشک چابک دستی سے میری شادی کی تیاریاں بھی کر چکی تھیں۔ میرا راضی ہونا تھا کہ انھوں نے میری گردن پر شادی کا جوا رکھنے کا منصوبہ بنالیا۔

''تم شادی کب کرو گے؟'' انھوں نے پوچھا۔

اس پر میں کنواری لڑکیوں کی طرح شرمایا اور سوال کے جواب میں عملاً ان کے گھر جا پہنچا۔ یہ خودفریبی محض فضول تھی کہ میں اپنی شادی کا خود ہی کوئی راستہ اختیار کرسکتا ہوں، لہٰذا لاتعلقی اور عزتِ نفس کا ڈھونگ بھی بے سود تھا۔ میں ایسا کون انوکھا تھا کہ گاؤں کے صدیوں پرانے رواج کے خلاف کچھ کر پاتا۔ اس طرح میں نے اس جوئے کو قبول کرنے پر خود کو آمادہ کرلیا جو خالہ مجھ پر رکھنے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ وہ چھیڑخانی کر رہی تھیں، مجھے بلا رہی تھیں، میرے آنے کا رشتہ شادی سے جوڑ رہی تھیں۔ اس طرح خالہ نے یہ بات یقینی بنادی کہ میری شادی کی سمت جانے والے اس طویل راستے پر پہلا قدم وہی اٹھائیں گی۔

خالہ نے مجھ سے کہا، ''ایک لڑکی اس راستے سے ہر روز مدرسے جاتی ہے۔ تم اس درخت کے نیچے بیٹھ جاؤ۔ جب وہ گذرے تو دیکھ لینا۔''

ساڑھے چھ بجے تھے۔ میں چائے وائے چھوڑ کر باہر گیا اور گھنٹا بھر درخت سے لگا انتظار کرتا رہا۔ خالہ کواڑ کے پیچھے سے اشارے کررہی تھیں کہ لڑکی کہاں سے آرہی ہے۔ لیکن مجھ پر نظر پڑتے ہی لڑکی خالہ کے گھر کے عقب کی طرف ایسے سرپٹ بھاگی جیسے اس نے سڑک پر کوئی پاگل دیکھ لیا ہو۔ میں درخت کے نیچے اپنا مورچہ چھوڑ کر اس کی سمت خود چل کھڑا ہوا۔ لیکن اس کو دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ خاصی بدصورت نکلی۔ کاش میں نے چائے نہ چھوڑی ہوتی۔ کاش اتنا انتظار نہ کیا ہوتا... کاش...

گاؤں بھر میں بہرحال یہ خبر پھیل گئی کہ اس لڑکی سے، جسے دیکھنا بھی مجھے گوارا نہ تھا، میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اِس گاؤں سے خبر اُس گاؤں تک پہنچی اور اڑتے اڑتے الازارق کی پہاڑیوں میں میرے گاؤں تک پہنچ گئی۔ مگر میں مایوس نہیں ہوا۔ اس بار میں خود اپنی مرضی سے خالہ کے گھر گیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں، اور یہ بھی کہ اس سلسلے میں خالہ میری مدد کریں۔

اس بار خالہ نے مجھے فی الفور چھت پر بلایا۔

''نظر آرہی ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

مجھے تو کچھ صاف نظر نہیں آرہا تھا مگر میں ان کا مدعا سمجھ گیا۔ میں نے کہا، ''کیا وہ؟''

''پسند ہے؟'' ان کا سوال۔

''ٹھیک سے نظر نہیں آرہی،'' میں نے مجبوراً بتایا۔

لیکن اب میں واقعی سنجیدہ ہو چکا تھا۔ خالہ کمال کی تھیں۔ میرے مسئلے جیسی معمولی چیزوں کا حل چٹکیوں میں نکال سکتی تھیں۔ ان کا دماغ نئی ترکیبوں کا خزانہ تھا۔ انھوں نے نہایت سیدھا سادا طریقہ بتایا۔ ''لڑکی کے باپ کی دکان سے سیر بھر شکر خریدو،'' خالہ نے کہا۔ ''دکان پر ضرور وہی ہوگی۔ باپ تو اس وقت

جمعہ پڑھنے مسجد گیا ہوا ہوگا۔ ماں کنویں پر پانی بھرنے گئی ہوگی جہاں اسے یقیناً دیر لگ جائے گی۔ ان کے گھر میں لڑکی اور اس کی چھوٹی بہن کے سوا اور کوئی نہیں۔''

میں دکان پر پہنچ گیا۔ وہاں میں نے خالہ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرتے ہوئے لڑکی کے باپ کا نام لے کر آواز دی۔ کئی بار پکارنے کے بعد وہ سچ مچ انیسہ ہی تھی جو باہر نکلی۔ میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ فدا ہوگیا میں اس پر۔ بس جی چاہ رہا تھا کہ یہیں، اسی وقت، اسی دکان پر اسے حاصل کرلوں۔ سیر بھر شکر کا خیال میرے دماغ سے بالکل محو ہوگیا۔ اس کے بدلے میں نے اس سے پانچ سگریٹ مانگے۔ انیسہ نے مجھ سے پیسے لے کر سگریٹ مجھے تھما دیے۔ ساتھ ہی میرا دل بھی چرا لیا۔ اس سے جدا ہونے کا خیال روح فرسا تھا۔ میں نے کچھ دیر مزید رکنا چاہا۔

''پندرہ فلس کا ایک سگریٹ!'' میں ہکلایا۔ ''یہ بہت مہنگا ہے... یہاں پورا ڈبا کتنے کا ملتا ہے؟''

خالہ اس سے میری بات پکی کرنے کی کوشش کر چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ انیسہ نے میری کوشش کو چھیڑ سمجھ کر سختی سے جواب دیا:

''پیسے واپس دوں یا سگریٹ لو گے؟ ہمارے یہاں پورا ڈبا نہیں بکتا۔''

اس کے بعد، جیسا کہ خالہ نے کہا تھا، ان کے پہلے قدم کے بعد دوسرا قدم اٹھانے کے لیے مجھے بلا جھجک آمادہ ہونا چاہیے تھا۔ اس مقام پر میں نے اپنی بچت سے پچاس دینار نکال کر والد صاحب کے قدموں پر رکھے اور ان سے درخواست کی کہ اس لڑکی انیسہ سے میری شادی کا انتظام کر دیں۔

نکاح نامے کی حتمی شرائط کا فیصلہ ہونے میں بہت وقت لگا۔ یہ سمجھیے کہ ہمارے گھر سے لڑکی کے گھر تک جتنا فاصلہ تھا اس سے دگنا۔ اس عمل میں دونوں جانب سے جابرانہ دباؤ اور بالادستی قائم کرنے کی سیاست کا اتنا دخل تھا کہ بسا اوقات یہ داؤں پیچ شادی سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کرتے محسوس ہوتے تھے۔ ہماری ان تمام کاوشوں کے باوجود انیسہ کا باپ کتراتا رہا، اس بات کو بنیاد بنا کر کہ اس کی بیٹی ابھی بہت کم سن ہے اور بالغ نہیں ہوئی ہے، وہ ہاں کرنے سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کا مقابلہ میرے والد نے اس منطق سے کیا جس کی رو سے بالغ ہونا یا نہ ہونا اعتنا کے قابل نہ تھا۔ انیسہ کے باپ نے لڑکی کی ماں کی مخالفت کا بہانہ آزمایا لیکن والد صاحب نے اس کمزور بہانے کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس پر واضح کیا کہ بیوی کو شوہر پر اپنی رضا تھوپنے کا چنداں حق نہیں اور یہ کہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں، شادی کا فیصلہ صرف باپ کی مرضی سے ہوتا ہے۔

لڑکی تو ابھی بالغ بھی نہ ہوئی تھی۔ تب آخر والد نے میری طرف سے اس قدر سر توڑ کوشش کیوں کی؟ شادی کے بعد یہ کھلا کہ اس کا سبب باورچی خانے، کنویں اور مویشیوں کے باڑے میں انیسہ کا متوقع

طور پر کارآمد ہونا تھا۔ جہاں تک بچوں کی پیدائش کی بات تھی تو میں اس وقت اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے اور انیسہ کے درمیان اس وقت کچھ اور ہی معاملہ تھا جو مستقبل میں پیدا ہونے والے بچوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم تھا؛ اس معاملے کے لیے بچوں کا ہونا ضروری نہ تھا اور اس کا پیش آنا ہر صورت میں لازمی تھا۔ دوسری صورت میں میں دف نواز کی بیٹی کی ترغیب کا شکار ہونے والا تھا۔

اب لڑکی کے باپ نے ادھر سے پسپائی اختیار کر کے ایک دوسری سمت میں پیش قدمی شروع کی۔

''لڑکی کے مہر میں دی جانے والی رقم زیادہ ہوگی،'' اس نے کہا۔ ''جو رقم آپ کی ہے وہ تو اس دودھ کی قیمت کے برابر بھی نہیں جو وہ پی چکی ہے۔''

کچھ عرصے کے لیے میں انیسہ اور اس گائے کے درمیان لڑکھڑاتا رہا جسے والد صاحب فروخت کر چکے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ آخر گائے بھی قیمتی تھی۔ اور گائے فقط دودھ پیتی نہ تھی، دودھ دیتی بھی تھی۔ والد نے لڑکی کے باپ کی اس نئی چال کا توڑ سوچا۔

''تم جو رقم مانگ رہے ہو وہ بہت زیادہ ہے،'' انھوں نے کہا۔ ''دوسو دینار! اس قدر زیادہ!'' وہ جھنجھلائے۔

میں انیسہ اور گائے کے درمیان فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کا وہ پیکر جس نے میرا دل موہ لیا تھا، میرے دماغ سے محو ہوتا جا رہا تھا۔ مگر والد نے شدید مزاحمت کرتے ہوئے کہا، ''تمھاری مانگی ہوئی رقم خلاف قانون ہے۔'' اس بات سے میرے دل میں انیسہ کی پہلے والی تصویر پھر ابھری اور وہ دوسرا عکس غائب ہوا جسے گائے نے مسخ کر دیا تھا۔

انیسہ کے باپ کا چہرہ سیاہ پڑ گیا، لیکن غصے کو دباتے ہوئے اس نے کہا، ''اگر میں اپنی بیٹی آپ کے بیٹے سے بیاہ دوں تو مجھے قانوناً کتنی رقم لینے کا حق ہے؟'' اس کا سوال طنز میں بجھی ہوئی آواز میں کیا گیا تھا۔ اس کے لہجے سے مجھے اپنی ٹانگوں کی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مگر میرے والد نے تیزی سے وار کیا۔

''ہم مفت میں تو بیٹی نہیں مانگ رہے ہیں۔ سو دینار مناسب رقم ہے اور قانون کے مطابق بھی ہے۔''

''سو دینار؟ خوب! چلو ہم راضی ہیں۔ مگر آپ دو برس بعد آیئے گا۔ لڑکی تب تک قانوناً بالغ ہو جائے گی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایسا لگا کہ وہ مہمانوں کے مجمعے کو چھوڑ کر چلا جائے گا جو میرے خالو کے گھر میں بھرے ہوئے تھے۔ حالانکہ بے چارے خالو کسی کو بھی اپنے گھر مہمان نہیں بلایا کرتے تھے۔ میرے والد میری شادی کرنے کے لیے اپنے مویشی فروخت کر چکے تھے جن پر ان کو اس قدر ناز تھا اور جن کی وجہ سے ان کو ہم پر حکومت کرنے کی طاقت ملی تھی۔ انیسہ کے باپ کی ضد کا کیا مطلب تھا؟ کیا وہ انیسہ پر ناز کرتا

تھا؟ یہ بات تو قابل قبول تھی۔لیکن کیا وہ اپنی بیٹی کو میرے والد پر برتری حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا؟

اس تمام بحث وتمحیص کے دوران مہمان کبھی انیسہ کے باپ اور کبھی میرے والد کی طرفداری کرتے رہے تھے۔ وہ کس کی ہاں میں ہاں ملائیں گے اس کا انحصار اس پر تھا کہ وہ کون سے گاؤں سے آئے ہیں اور کس خاندان سے ہیں — ہماری طرف والے یا ان کی طرف والے۔ والد صاحب کے رشتے دار ان کی حمایت کر رہے تھے، خواہ وہ ہمارے گاؤں کے ہوں یا نہ ہوں؛ اور ہمارے گاؤں والے بھی ان کے ساتھ تھے خواہ وہ ہمارے رشتے دار نہ بھی ہوں۔انیسہ کے باپ کے خاندان والوں اور گاؤں والوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اس موقعے پر جہاف کے رہنے والے ایک مہمان نے معاملے کو سنبھالا۔

''لین دین کی بات کیجیے۔ آخر کتنے پر راضی ہو سکتے ہو؟'' اس نے لڑکی کے باپ سے سوال کیا۔

''دو سو دینار،'' انیسہ کے باپ نے پورے زور سے کہا۔

''یہ آخری بات ہے؟''

''دھیلا بھی کم نہیں کروں گا۔''

اب یہ صاحب میرے والد سے مخاطب ہوے۔

''اور تم... کتنا دو گے؟ کتنا دے سکتے ہو؟''

''قانون کے مطابق،'' میرے والد نے جواب دیا۔

''قانون کو بیچ میں کیوں گھسیٹتے ہو؟'' ان صاحب نے کہا۔ ''قانون ایک چیز ہے اور بیٹا دوسری چیز ہے۔ جھٹ پٹ فیصلہ کر لو۔ قانون یا شادی کی جنت، قانون یا لڑکی۔''

''مگر قانون خود جنت ہے،'' والد صاجب نے کہا۔ ''قانون سب کے لیے یکساں ہے، میرے لیے بھی اور لڑکی کے لیے بھی۔'' اس مقام پر میں بھی بحث میں کود پڑا۔ لیکن مجھے سب لوگوں نے فوراً چپ کرا دیا، پھونک مار کر یوں اڑا دیا جیسے میری حیثیت کسی تنکے سے بھی کمتر ہو۔ میں شرمندگی سے سکڑ گیا۔ میں نے سوچا چپ چاپ تماشا دیکھتے رہنے میں ہی عافیت ہے۔

ایک طویل بحث کے بعد، جو دونوں طرفین کے مابین اور عمومی طور پر تمام حاضرین کے درمیان ہوئی، آخر کار انیسہ کا باپ رقم میں کچھ کمی کرنے پر آمادہ ہوا۔ ''میں مہر میں پچیس دینار کم کر دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کو سونے کی انگوٹھی، ہار اور بندے بھی دے،'' اس نے کہا۔ میرے والد احتجاجاً چیخ پڑے۔ میں خود انگشت بدنداں تھا۔ یہ سونے کے زیوات کی نئی پخ کہاں سے آ گئی! میری سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ گڈمڈ ہوا جا رہا تھا۔ انیسہ کا باپ انیسہ کو سونے کے ساتھ خلط ملط کیے دے رہا تھا۔ میرے والد

مجھے سونے سے گڈمڈ کررہے تھے۔ دولھا والے مہر کو قانون کے ساتھ گڈمڈ کررہے تھے، جب کہ دلہن والے لڑکی کے باپ کی حرص کو ازدواجی زندگی کی مسرت کے ساتھ آٹے کی طرح گوندھ کر خلط ملط کر چکے تھے۔ اس پورے عمل میں میں خود اپنے والد کے ساتھ گڈمڈ ہو چکا تھا، انیسہ اپنے باپ کے ساتھ بری طرح خلط ملط ہو چکی تھی اور شادی ہر قسم کی چالبازی اور حکمت عملی کے ساتھ ناقابلِ بیان طور پر گڈمڈ ہو چکی تھی۔ انیسہ کی شادی کس سے ہونے والی تھی؟ ایسا لگ رہا تھا کہ والد صاحب سے ہونے والی تھی۔ اور انیسہ کس کے لیے اولاد جنے گی؟ میرے والد کے لیے۔ یہ سب اس عمومی خلط ملط کا حصہ تھا جو کہ اب وجود میں آ چکا تھا۔ کبھی یہ بھی لگتا تھا کہ میرے والد انیسہ کے باپ سے شادی کررہے ہیں اور ان میں سے ایک دوسرے فریق کے لیے اولاد پیدا کرے گا۔ اور اب انیسہ کے باپ کے آخری مطالبے اور سونے کے زیورات کی شرط نے معاملے کو ایک بار پھر کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔

''اچھا چلو، دونوں رُو رعایت کریں۔ ایک بات میں مانوں گا اور ایک لڑکی والے مان لیں،'' میرے والد نے آخری پینترا بدلا۔ لڑکی کے باپ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایک قدم پیچھے ہٹایا اور پھر بالآخر بے دلی سے اس بات پر راضی ہوگیا کہ دونوں فریق تھوڑی تھوڑی رعایت کریں۔

اب والدہ کی باری آئی۔ اس پورے گڈمڈ اور خلط ملط معاملے میں آخر انھیں بھی کچھ کردار ادا کرنا تھا۔ انھوں نے اپنی پسند کے مطابق دلہن کے لیے دو جوڑے بنائے — دوپٹے، قمیصیں اور لمبی جرابیں۔ انھوں نے مجھ سے سپاٹ لہجے میں کہا، ''جرابیں قیمتی ہونی چاہییں کیونکہ لوگوں کی نظریں سب سے پہلے انھیں پر پڑتی ہیں۔''

اب میرا خلفشار عروج پر تھا۔ ایک طرف سونا تھا، گائے تھی اور انیسہ تھی اور دوسری طرف لوگوں کی نظریں تھیں اور پیسہ تھا... پیسہ... مہنگی قیمتیں... گائے اور گائے کے تھن... اور مہنگی قیمتیں... سونا اور سونے کی گارنٹی شدہ قدر... مہنگی قیمتیں... گائے، جرابیں، آنکھیں، قدم، تھن، لوگوں کی رائے... والدہ کی رائے... قط کے رس میں گندھا گندھایا ان سب کا ایک ملیدہ سا بن چکا تھا۔ لوگ مزاروں کے خنک سائے میں بیٹھے قط چاب رہے تھے، الازارق اور الجہاف کی پہاڑیوں میں — اور یہ ملیدہ ان کے جبڑوں میں گھوم گھوم کر ایک منھ سے دوسرے منھ میں منتقل ہو رہا تھا۔

شادی کی سہ پہر کے لیے ہم نے قط کے کھیت کی پوری دو قطاریں مختص کر دی تھیں۔ اس پر بیس دینار لاگت آئی تھی۔ اتفاق سے شادی کا دن عین وہی تھا جو قط کی کٹائی کا دن تھا تا کہ قط کی تازگی میں کوئی

شک نہ رہے۔ لیکن اس دن اتنے بن بلائے مہمان آپہنچے کہ ہمارا خرچہ پینتیس دینار تک پہنچ گیا۔ یہ رقم انیسہ کی سمت جانے والے راستے پر آخری قدم تھی، لیکن اس سے پہلے ان گنت قدم تھے جو اب میری تھکن اور گھبراہٹ کے بگولے میں عنقا ہو چکے تھے۔ جب سے انیسہ کا ذکر چھڑا تھا تب سے اب تک چھ مہینے میں نے ایک طرف انیسہ کے لیے تیاریوں میں اور دوسری طرف ان سب باتوں سے دور بھاگ کر دف نواز اور خاکروب کی بیٹیوں میں پناہ ڈھونڈ لینے کی پُرزور خواہش کے درمیان جھولتے ہوئے گذارے تھے۔ اس کے باوجود شادی والے دن میں نے دف نواز سے اس کے دف کے سوا کچھ بھی نہیں چرایا۔ میں نے اپنی دونوں بہنوں کو جگایا اور دف پر شادمانی کی ایسی تھاپ دی کہ جس پر وہ رقص کر سکیں۔ میری مسرت ایک بلند سبز شجر کی مانند تھی جو میرے دل میں ایستادہ تھا اور پھول برسا رہا تھا۔ میرا دل ایک کھیت کی مانند تھا مسرت نے جس میں بوائی اور سنچائی کی تھی۔ اور اس کھیت کے اطراف میں پہاڑیاں تھیں، جو میری رگیں تھیں— دھڑکتی ہوئی، گرم لہو سے لبریز، میری شادمانی کی تال پر پھڑکتی ہوئی، ایسے بلند آواز نغمے گاتی ہوئی جن سے پورا گاؤں جاگ اٹھے بلکہ ساتھ والا گاؤں بھی بیدار ہو جائے۔ مجھے جذبات سے لبریز طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی عورت تان لگا رہی تھی، کوئی بچہ رو رہا تھا، کہیں کوئی کتا بھونکا تھا، کسی مرغ نے بانگ دی تھی اور یہ سب آوازیں کسی نہ کسی طرح میرے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں۔

ولیمے کے لیے ہم نے ایک گائے اور دو دنبے ذبح کیے۔ یہ اور فروخت کی جانے والی گائے ملا کر اب ہمارے پاس صرف دو گائیں اور ایک دودھ پیتا بچھڑا بچا تھا۔ بھیڑیں اور دنبے ابھی ہمارے پاس کافی تھے۔ ایک بکری بھی ذبح کی گئی تھی جو میرے ایک دوست نے اس تحفے کے بدلے میں دی تھی جو ہم نے اس کی شادی پر دیا تھا۔ مہمانوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا... اور مجھ پر ایک دہشت ناک گھبراہٹ طاری ہو گئی جس سے میرا پورا بدن بوجھل ہو گیا۔ قدم گھسٹنے لگے۔ اتنے مہمان کہاں سے آپہنچے؟ انھیں بلایا کس نے تھا؟ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے کچھ علم نہ تھا کہ شادی سے پہلے میں نے والدہ کے پاس جو رقم رکھوائی تھی وہ کتنی تھی۔ شاید مہمانوں کی آئی ہوئی لہروں پر لہریں والدہ کی مدعو کی ہوئی تھیں... شاید!

اتنے سارے مہمانوں کی آمد سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوئی، مگر پھر اسی وجہ سے رفتہ رفتہ مجھے اطمینان سا محسوس ہونے لگا۔ وہ کیسے؟ کچھ مرد رشتہ داروں نے اچانک ارادہ کیا کہ اب دلہن کو اس کے گھر سے لے آیا جائے۔ پہلے تو بہت خوشی محسوس ہوئی۔ لیکن مہمانوں کے ساتھ اب کہیں جا کر میں ذرا آرام سے بیٹھا قط چاب رہا تھا، دلہن کے آنے کے خیال سے پھر بوکھلا سا گیا۔ میں ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ مجھے ٹھیک سے قط چبانا بھی نہیں آتا تھا۔ بس یہی خیال آئے جا رہا تھا کہ اگر ٹھیک سے کافی مقدار میں قط چبا لوں تو شاید ذہن سے گھبراہٹ اور اس قدر رقم خرچ کر ڈالنے کا احساس مٹ جائے۔ مہمان ہمارے گاؤں کے دو

وسیع گھروں میں بٹھائے گئے تھے جن میں متعدد کمرے تھے۔ مجھے ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے سب کے درمیان مستقل گھومتے رہنا تھا (اور اب میں اس پر خود کو مطمئن محسوس کرنے لگا تھا)۔ پھر بھی دلہن کو اس کے گھر سے لے آنے کے ارادے پر مجھے مسرت ہوئی۔ میری آرزو کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جس طویل اور کرب انگیز راستے پر چل چل کر میں آخر کار انیسہ تک پہنچا تھا، اب اس کے اختتام پر خود کو اس کے حوالے کر دوں۔ یہ مسرت اور شادی والے دن کے شدید تناؤ سے چھٹکارے کی خواہش یکجا ہو گئیں۔ میں نے سوچا: اس قدر پریشانی کے بعد کتنا پرمسرت لمحہ ہوگا وہ! لیکن اچانک رشتہ داروں نے فیصلہ کیا کہ بارات لے جانے کے لیے چار بجے تک انتظار کریں گے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آجائے اور چاہتا تھا کہ نہ آئے — مگر کر کچھ بھی نہیں سکتا تھا، سوائے انتظار کے، اس وقت تک جب کہ وہ واقعی لے آئی گئی۔

جب وہ پہنچی تو رواج کے مطابق ایڑی سے چوٹی تک کپڑوں میں ملفوف تھی۔ مجھے کیا خاک خوشی ہو سکتی تھی۔ کپڑوں نے اسے بالکل ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے چاروں طرف عورتوں کے سروں اور چھاتیوں کا ترغیب آور مجمع لگا تھا۔ وہ تہہ در تہہ اتنے ملبوسات میں پنہاں تھی کہ مجھے بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس نے دراصل پہنا کیا ہے۔ میں نے سوچا، کیا اس نے میری والدہ کا خریدا ہوا جوڑا پہنا ہے؟ کچھ بھی ہو، اس لمحے مجھے انیسہ اور اس گائے میں جسے ہم نے فروخت کر دیا تھا، غضب کا فرق محسوس ہو رہا تھا۔

انیسہ کی ماں حجلۂ عروسی میں اگر سلگانے کے لیے مجھے پکار رہی تھی۔ مجھے خوب علم تھا کہ یہ صرف وہ انیسہ پر اپنے ناز کا اظہار کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے گاؤں کی عورتوں کو یہ موقع دینے کے لیے کر رہی ہے کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ لیں۔ اس چال سے میرا رہا سہا سکون بھی رخصت ہو گیا۔ اگردان میں اگر سلگانے کے لیے انیسہ کے کمرے میں بھری ہوئی عورتوں کی ٹانگوں، گرم وگداز ٹانگوں، کے درمیان راستہ بناتے ہوئے میں شرمندگی سے تقریباً چکرا کر گرنے والا تھا۔ سارے بدن میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ عورتوں کی نگاہیں، معنی خیز نگاہیں، میرے جذبات کو اس طرح بھڑکا رہی تھیں کہ میں ان سے مغلوب ہوا جا رہا تھا۔

مگر میں نے کسی بھی دوسری عورت پر نظر نہ ڈالی، خواہ وہ مجھے کپڑوں سمیت نگل جانے والی نگاہوں سے ہی کیوں نہ گھور رہی ہو۔ میں صرف انیسہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرا ذہن اس میں پیوست اور جذب ہو گیا تھا۔ گھر کی دہلیز پر صدقے کی ذبح کی ہوئی بکری کو پھلانگ کر میں اور انیسہ گھر میں داخل ہوئے۔ شادی کے لیے ذبح کیا جانے والا یہ آخری مویشی تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ دنیا کی سب سے بڑی پریشانی کا بار ہلکا ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی ایک دوسری گھبراہٹ کا آغاز ہو گیا، اور یہ انیسہ کے ساتھ میری نئی زندگی کا بھی آغاز تھا، اس لڑکی کے ساتھ جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے ان گنت مویشی فروخت اور ذبح کیے تھے، بے تحاشا قحط خریدا تھا، بے حد وحساب رقم خرچ کی تھی اور اس سے بھی بدتر دشواریوں کا سامنا

کرتا رہا تھا۔ اس گھبراہٹ کے سامنے ساری مسرت رفو چکر ہو گئی کیونکہ اب میرے سامنے ایک سفید چادر تھی جس پر صبح کے وقت خون کے داغ ہونے ضروری تھے جو کہ انیسہ کی بکارت کی شہادت دے سکیں۔ دھوم دھام کی شادی اچانک مذبوحہ مویشیوں کے خون، ہڈیوں اور گوشت کے ملغوبے میں بدل گئی۔ خود میں اپنے آپ کی جگہ صرف ایک مذکر میں تبدیل ہو کر رہ گیا— ایک نوجوان دولھا جو اپنی دلہن پر سے تہہ در تہہ ملبوسات کے اترنے کا منتظر تھا۔ انیسہ سیاہ حجاب اور کپڑوں کی گٹھری میں بدل گئی۔ کمرہ سمٹ کر مویشیوں کے کھروں اور ہمارے خرچ کیے ہوئے چاندی کے سکوں میں تبدیل ہو گیا۔ خودالازارق کا گاؤں کسی مزار کی شکل اختیار کر گیا جس پر جنگلی گھاس پھوس اور کانٹے دار جھاڑیاں اگ رہی تھیں۔

اس کمرے میں، جسے والدہ نے انیسہ کے لیے تیار کیا تھا، جب ہم دونوں تنہا ہوئے تو انیسہ نے نقاب اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس کا اصرار تھا کہ پہلے مہر ادا کیا جائے۔

''کل صبح تمھارے کنوارپن کی نشانی دکھانی پڑے گی۔'' میں نے دھیمی آواز میں اسے یاد دلایا۔

وہ رونے لگی۔ اسے چپ کرانے کے لیے میں نے ادائیگی کا وعدہ کیا اور اس نے رونا بند کر دیا۔ میں سمجھا وہ مان گئی ہے، اس لیے میں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی جسے اس نے فوراً زور سے چھڑا لیا۔ ایک لمحے کے بعد اس نے پچاس دینار کی ادائیگی کا مطالبہ دہرایا۔ مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کس قدر اجنبی ہیں۔ میں نے بہت نرمی اس سے بات کرنے کی کوشش کی تا کہ اس کا حجاب خود اتار سکوں، مگر وہ بری طرح گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ مت بھولو،'' میں نے پھر یاد دلایا، ''کل صبح تمھارے کنوارپن کی نشانی دکھانی پڑے گی۔'' مجھے اس کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا لیکن اس وقت تک خود اپنے حال پر بھی افسوس ہونے لگا تھا۔

وہ دوبارہ رونے لگی، اب کی بار زیادہ اونچی آواز سے، اور پچاس دینار کی ادائیگی کا تقاضا کرنے لگی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اس طرح تو وہ اس رقم سے دگنی وصول کر لے گی جو اس کے باپ نے اپنے اصل مطالبے کو کم کر کے طے کی تھی اور جس کی شرط پوری کرنے کے لیے سونے کے زیوات الگ سے دیے جا چکے تھے۔ میں نے ظاہر کیا جیسے مجھے غصہ آ گیا ہے، اور اس کے چہرے سے زبردستی حجاب ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور میں بھونچکا رہ گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ رقم ادا کرنی ہی پڑے گی، یہ تسلیم شدہ امر ہے، لیکن لگتا تھا اس سے پہلے مجھے اپنی دلہن سے نقاب کشائی کے لیے کچھ سودا بازی کرنی ہو گی۔

لہٰذا سودا بازی کی گئی۔ بالآخر پچیس دینار پر معاملہ طے ہوا۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم نکالی اور انیسہ کو تھما دی۔ انیسہ نے نقاب ہٹا دیا۔ اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ اچانک مجھے اس پر بے حد رحم آیا۔ دل کی گہرائیوں میں اس کی محبت کی جڑوں نے کروٹ سی لے کر میرے دل کو بھر دیا۔

لیکن وہ خوف سے سمٹی جارہی تھی۔

"کل صبح تمھارے کنوار پن کی نشانی دکھانی پڑے گی،" میں نے نرمی سے دہرایا۔

اس نے خوف بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی جنگلی بھیڑیا ہوں جو اسے زندہ نگل جانے والا ہو۔ اس کی نظروں کے سامنے مجھے اس سے کچھ بھی مطالبہ کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ شادی سے پہلے کے زمانے سے بھی بڑھ کر ناقابلِ حصول نظر آرہی تھی۔ لیکن خیر، یہ کیفیت زیادہ عرصے نہیں رہی۔ آخر میں نے خود کو اس کے پہلو میں پایا۔ وہ رو رہی تھی، التجائیں کررہی تھی اور جان توڑ مزاحمت کررہی تھی۔

بعد میں مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ کپڑوں کی وہ تہیں کیوں کراتریں۔ مجھے یاد رہی تو بس اپنی کوششوں کی ہولناک ناکامی — رضامندی کے لمحے سے پو پھٹنے تک کے محدود وقت میں شادی کی اختتامی رسم ادا کرنے کی یکے بعد دیگرے تین کوششیں، اور سب ناکام۔ اس ناکامی نے مجھے کچل کر رکھ دیا۔ صبح ہونے تک میں اس قدر تھک چکا تھا کہ سو گیا۔ اور پھر مجھے ڈراؤنے خواب دکھائی دیے — گھبراہٹ، تھکن اور ناکامی کے خواب... اور گاؤں کے مزاروں کے خنک سایوں کے خواب... آہ انیسہ!

حنان الشیخ

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

چھتوں پر دھوپ

میں ایسے لپکی جیسے پیاسا گھوڑا پانی پر لپکے۔ مگر میں پیاسی نہیں تھی۔ میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے انگریز لڑکے اور اس کے دوست پر سارا پانی پھینک دیا، اور میرے دل میں، میرے سر میں اور میری رانوں کے درمیان آگ بھڑکتی رہی۔

میرے ذہن میں تصویریں گھومے جارہی تھیں۔ کسی پاگل گھوڑے کی طرح میں اپنی گردن اونچی کیے، سر جھٹک جھٹک کران سے اپنی مزاحمت کررہی تھی، لیکن ہر نئی تصویر، ہر یاد مجھے غصے سے اَور بھی پاگل کیے دے رہی تھی۔

جیسے سعد زمین پر لٹا دیا گیا تھا۔ خاموش، گونگا سعد جس کی گونجیلی آواز اس کے شکم کی گہرائیوں سے نکلتی تھی۔ یہ آواز اب اس کی بیوی نے چھین لی تھی۔ اب وہ اس آواز سے اس کے لیے بین کررہی تھی، اور اس کی بیٹیاں اور خالائیں اور بہنیں، سب سر پر خاک ڈالے چھاتی کوٹ رہی تھیں۔

اور انگریز کبوتر نپا کھچا خس خس کے دانے کھائے چلا جارہا تھا۔ دانوں میں پوری چونچ اور سر گھسا کر، اور میں مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی، ''تمھیں پیکٹ سے کھانا اچھا لگتا ہے؟ تم انگریز کبوتر ہونا، اسی لیے۔ تمھیں پیکٹ سے چیزیں کھانے کی عادت ہے۔''

اناج کے گودام میں عائشہ، زور دے کر بولتی ہوئی۔ اس کی سونے کی بالیاں جھول رہی تھیں اور کلائی پر چوڑیاں ہلے جارہی تھیں، اور وہ مصر تھی کہ میں اپنے وطن میں رہوں، اپنے گھر میں۔ لیکن میں صرف اس بات پر حیران کہ اس کے جوتے اس کے ہینڈ بیگ سے کتنی اچھی طرح میچ کررہے تھے۔

اور پھر میں عائشہ کے ساتھ اس کے گھر میں، جہاں سب ساز و سامان مراکشی تھا اور جس کی خوشبو

سے پتا ہی نہیں چل سکتا تھا کہ میں لندن میں ہوں۔ میں کسٹم آفیسر کے چنگل سے بچ کر نکل آئی ہوں جو میرا پاسپورٹ الٹے پلٹے جا رہا تھا۔

اور وہ خط، لفافے پر انگریزی میں میرا نام، مراکشی ٹکٹ، خاندان بھر کی فرمائشیں: بہن کی شادی کے لباس کے لیے سفید جالی کی نقاب، بھائی کے لیے موزے، ماں کے لیے چینی کی قاب...

اور اس انگریز لڑکے کو اپنے نصف لنچ کی پیش کش، اور پھر اس کے مسکرانے پر میرا اس قدر تشکر محسوس کرنا، کیونکہ اسے زعفران اور زیرے میں بسے مرغی کے گوشت کا ذائقہ پسند آیا اور وہ مسکرایا— پہلی مرتبہ۔ اس کی پسندیدگی میرے لیے اہم تھی۔ بس کنڈکٹر سے لے کر پاکستانی دکان دار تک کی، کیونکہ وہ دکان کا مالک تھا اور انگریزی بولتا تھا۔ زیرِ زمین ٹرین کے راستوں میں بھٹکتی ہوئی میں، رخساروں پر آنسو بہتے ہوے، مشینوں کے نام بوجھنے کی کوشش کرتی ہوئی، دل ہی دل میں انھیں یوں دہراتی ہوئی جیسے وہ جادو کے اشارے ہوں۔

میں انگریز لڑکے اور اس کے دوست پر پانی پھینک رہی تھی اور وہ دونوں چیخ رہے تھے، ''ارے یہ تو پاگل ہے! یا عیسیٰ مسیح! یہ تو بالکل پاگل...''

میں ایک بپھرا ہوا بیل بن گئی تھی اور ہر چیز سرخ ہو گئی تھی۔ میری چیخ پر وہ چونک پڑا تھا اور میں نے اس پر اور اپنے آپ پر خون کا گہرا رنگ دیکھا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا، چلاتا ہوا: ''تم کنواری تھیں! ابھی تک کنواری! تم آخر کس قسم کی ہو؟''

اپنا کنوارپن اس کی نذر کرنے پر مجھے کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ مجھے تو اپنی اس کمزوری پر غصہ آ رہا تھا کہ اس لڑکے سے ہم بستر کیوں ہوئی، بس اس لیے کہ وہ انگریز تھا، اس عظیم قوم کا حصہ جس کی کبھی آدھی دنیا پر حکمرانی تھی۔ نہ ہی میں محض ایک خیال سے چمٹے رہنے پر خود کو ملزم ٹھہرا رہی تھی جس کی وجہ سے مجھے اپنے وطن سے ناتا توڑنا پڑا تھا، خاندان کے کسی فرد کی رفاقت کے بغیر تن تنہا لندن کا سفر کرنا پڑا تھا، اپنے پردۂ بکارت کے سالم نہ رہنے پر، اپنے منھ پر طمانچے مار مار کر ماتم کرنے کے بجاے میں سوچ رہی تھی۔ ''میرا کنوارپن ختم کرنے پر اسے فخر کیوں نہیں محسوس ہو رہا؟ کیا اس لیے کہ یہ انگریز ہے؟ یا اسے خوف ہے کہ اب میں اسے شادی کے لیے مجبور کروں گی؟''

میں نے اسے بتانے کی کوشش کی کہ میں اس پر الزام نہیں رکھ رہی ہوں کہ اس نے میری عصمت لوٹ لی۔ مگر وہ میری بات سن ہی نہیں رہا تھا، اپنی ہی کہے جا رہا تھا، بھونچکا ہو کر، ''تم پچیس تیس برس کی تو ہو گی؟ اور ابھی تک کنواری؟ جیزس کرائسٹ! میں نہیں سمجھا... میں بالکل نہیں سمجھا!''

وہ غسل خانے بھی نہیں گیا، کمرے ہی میں رہا۔ آنکھوں کے گوشے سے میں نے اسے اپنا بدن

ٹشو پیپر سے پونچھتے دیکھا جسے اس نے، خون کے دھبوں کے باوجود، لاپروائی سے فرش پر پھینک دیا۔ اس نے پتلون چڑھائی اور تیزی سے بڑھ کر موسیقی کی آواز بلند کر دی۔ وہ گیت کی تال پر سر ہلا رہا تھا۔ پھر میرے پاس سینے کے بل لیٹ گیا، اس بات سے بالکل بے خبر کہ مجھے تکلیف دہ شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وطن سے اور شادی کے ناگزیر وقوعے سے میرا بندھن اس لمحے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے یاد آیا، لندن آنے سے پہلے آخری بار جب میں چھت پر گئی تھی اور ایک چادر پر خس خس کے دانے دھوپ میں سکھانے کے لیے ڈالے تھے۔ نیچے گاؤں نظر آ رہا تھا۔ درختوں کی چوٹیاں، مینار، گاؤں کا احاطہ کرنے والی قدیم دیوار۔ میرے دماغ میں اس کے سوا کوئی خیال نہیں تھا کہ میں لندن، اس کی بلند و بالا روشنیوں سے جھلملاتی عمارتوں کے درمیان جا بیٹھوں۔

مجھے عائشہ کی وہ دوست یاد آئی جس نے لندن میں عائشہ کے گھر سے فرار ہونے میں میری مدد کی تھی۔ اس نے عائشہ کے ایک بچے کو گود میں اٹھایا تھا۔ میں سوٹ کیس اٹھائے دوسرے بچے کو گھسیٹ رہی تھی۔ اس کی انگریز پڑوسن نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ لیکن دونوں بچوں کو ہم نے پھر بھی وہیں چھوڑ دیا تھا۔ چلتے چلتے دونوں کے گالوں پر زور زور سے چٹکیاں بھری تھیں تاکہ وہ رونے لگیں اور پڑوسن کو ان کے لیے مجبوراً باہر نکلنا پڑے۔

میں لندن کی سردی میں جرابوں کے بغیر، کوٹ کے بغیر، سویٹر کے بغیر چلی جا رہی تھی۔ مارکس اینڈ اسپنسرز میں سیکڑوں لباس تھے، اور سویٹر اور شب خوابی کے گاؤن۔ میں نے کیش ڈیسک پر بیٹھی عورت کو رقم ادا کی تھی اور اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی مسکرائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے بہت خوب صورت کوٹ کا انتخاب کیا ہے۔ میں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اسے میرا ذوق پسند آیا تھا۔ میں نے اسے بالکل درست رقم دی تھی، اس سرخ کوٹ کی رقم جو میں نے اب تک نہیں پہنا تھا۔

ویکیوم کلینر پر میں اشتیاق سے جھکی ہوئی — یہ ایک طلسمی جھاڑو تھی جس پر سوار میں ایک دوسری دنیا کی طرف اڑی جا رہی تھی، غربت سے مال و دولت کی طرف! صفائی کے آلات یہاں کتنی ڈھیر ساری قسموں کے تھے، کتنی الگ الگ خوشبوؤں اور رنگوں والے، بالکل ان جگہوں کی طرح جو مجھے صاف کرنی تھیں۔ عائشہ کی سونے کی چین جو میں اس کے گھر سے اپنے سامان میں چھپا کر لے آئی تھی، ابھی میرے ہاتھ میں تھی اور ابھی دوسرے ہی لمحے آکسفورڈ اسٹریٹ میں سنار کی دکان میں غائب ہو چکی تھی۔

میرے غصے کی سرخی اس نارنگی کے رس کی طرح ابل رہی تھی جو میرے گاؤں کے بازار میں ایک شخص مشین سے نکالتا تھا۔ وہ میری آنکھوں کے درمیان بہہ رہا تھا اور مجھے ہر چیز خون کی طرح سرخ نظر آ رہی تھی۔ حالانکہ چند لمحے پیشتر میرے ذہن میں ایک خوشگوار تصور آیا تھا، انگریز لڑکے کی بہن کا تصور۔ وہ

مہذب تھی۔اس نے مجھے شکریے کے کارڈ کے ساتھ ایک چھوٹا سا چاکلیٹ کا ڈبا دیا تھا۔اس نے میرے گال پر بوسہ دیا تھا اور مجھ سے ہاتھ ملایا تھا، جب وہ اتوار کے دن میرے گھر کھانے پر آئی تھی۔ وہ اپنے بھائی اور اس کے دوستوں سے مختلف تھی جو میرے گھر مہمان آتے رہے تھے، جو میرے صاف ستھرے کمرے میں، صاف ستھرے بستر کو بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے، جو وہاں وڈیو اور کیسٹ ریکارڈر دیکھ کر بہت خوش ہوے تھے، جو میرا اتنا عمدہ کھانا کھاتے تھے، اونچی آواز میں موسیقی سنتے تھے اور اپنے ساتھ لائی شراب نگلتے رہتے تھے۔ وہ سب کہتے تھے کہ وہ میرے وطن جانا چاہتے ہیں۔میں سرہلاتی اور انھیں یقین دلاتی کہ ان کی ایک پینی بھی خرچ نہیں ہوگی۔ میں تصور کرسکتی تھی کہ کس طرح گاؤں کے لوگ ان کے گرد بھیڑ لگا لیں گے اور ان کے رنگ برنگے، چھوٹے چھوٹے یا لمبے بالوں کو حیرت سے دیکھیں گے۔میں مسکراتی تھی اور ان کی پلیٹوں میں مزید کھانا ڈالتی تھی، ان کی پیالیوں کو پودینے کی خوشبو والی چائے سے بھرتی چلی جاتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے پسند کریں، چاہے خود ان میں سے کتنی ہی خراب بو کیوں نہ آتی ہو۔ ان کے رنگ برنگے بالوں کی کلغیوں کی اور شراب کی ملی جلی بدبو...

پھر میں نے میزبانی کے طور بدل دیے تھے۔ جب ان کی موسیقی کی آواز اور بھی اونچی ہو جاتی، جب وہ آپس میں ہنستے رہتے اور مجھے اپنے مذاق کا مطلب سمجھانے کی زحمت نہ کرتے تو میں انھیں سرد مہری سے دیکھتی۔ پہلے جب تک میں ٹھیک سے سمجھ نہ جاؤں وہ مجھے ہر لفظ دہرا کر سمجھایا کرتے تھے۔انگریز لڑکا صفائی کے وہ تمام آلات اپنے دوستوں کو دکھاتا تھا جو میں نے جمع کر رکھے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے صفائی کا خبط ہے۔ایک بار میں نے اس کے سب کپڑے دھوئے تھے اور اسے دن بھر اندر رہنا پڑا تھا۔

میں ان سے چڑنے لگی تھی۔ میں نے باہر ہال میں سونا شروع کر دیا تھا۔ میں بستر سے ایک تکیہ اور کمبل گھسیٹ لے جاتی اور کمرے کو ان کے حوالے کر دیتی، اس امید میں کہ وہ میرا غصہ سمجھ جائیں گے اور صبح تک نہیں ٹھہرا کریں گے۔ مجھے پھلانگ کر چلنے پر مجبور کرنے اور کمرے میں راکھ سے بھری ایش ٹرے اور خالی بوتلیں اِدھر اُدھر بکھری چھوڑنے سے باز آ جائیں گے۔کبھی کبھی تو وہ اتنے نشے میں ہوتے کہ جہاں جگہ ملتی وہیں پڑ کر، بغیر تکیہ یا اوڑھنے کی چادر لیے، سو جاتے۔کام سے واپس آ کر میں انھیں عربی میں خوب ڈانٹ پلاتی۔ میں کہتی کہ ان کی وجہ سے میرا کمرہ اب اطالوی کے سؤروں کے باڑے جیسا ہو گیا ہے۔گاؤں میں ہم بچے جب اس کے پاس سے گذرتے تو زمین پر تھوک دیتے تھے۔ کیا بچے کیا بڑے، سبھی اسے مغلظات سنایا کرتے تھے، حالانکہ ہمیں باہری احاطے کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔میں یہ کیوں کر رہی تھی؟ ان کے اوپر پانی کیوں پھینک رہی تھی؟ جب کہ وہ چیخ چلا رہے تھے۔شاید آس پاس کے کمروں میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا جہاں سب الگ الگ طرح کے لوگ رہتے تھے۔ان کے شور سے میری

نیند حرام رہتی تھی۔ چیخ پکار، گلاس ٹوٹنے کے چھناکے، اور کبھی کبھی ''پولیس'' کا لفظ ادھر ادھر گونجتا ہوا۔

شروع زمانے کی ان راتوں میں میں اس کے ساتھ کتنی خوش تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ انگریز لڑکا مجھے ان آوازوں سے بچا لے گا — اور اب یہ سب کچھ میرے اپنے کمرے میں ہو رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کی طرح چیخنے کی کوشش کی مگر میری چیخ اٹک اٹک کر نکل پائی۔ میں انگریزی میں ٹھیک سے بول نہیں سکتی تھی۔ تب میں پاگل گھوڑے یا بپھرے بیل کی طرح چکر کاٹنے لگی۔ کبھی پیچھے ہٹتی، کبھی آگے بڑھتی، لپکتی، حملہ کرتی ہوئی۔ کیا وہ چیخ رہے تھے؟ نہیں، وہ تو ہنس رہے تھے۔ سچ مچ ہنس رہے تھے!

میں باہر ہال میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کم بخت میوزک کی وجہ سے مجھے کمرے میں آنا پڑا۔ ایک ہی سُر بار بار تڑاتڑ دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے ان سے پیچھا چھڑانا پڑے گا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا، اس انگریز لڑکے سے۔ میں اس سے صاف کہہ دوں گی کہ وہ اکیلا یہاں ٹھہرے ورنہ رفو چکر ہو جائے۔ ٹھیک ہے، اس کا کوئی گھر نہیں لیکن یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں فوراً اندر جاؤں گی اور اس میوزک کا کیسٹ مشین سے نکال کر پھینک دوں گی۔ ساری رات یہ میوزک میرے کان پھاڑتا رہا اور اب صبح ہو رہی تھی۔ ان کو تو کوئی احساس ہی نہیں، نہ ضمیر ہے۔

میں بپھرے بیل کی طرح کمرے میں گھسی۔ کمرہ دھویں، میوزک کے شور اور چرس کی بو سے بھرا ہوا تھا۔ میں سمجھی وہ میوزک بند کرنا بھول کر سو گیا ہے۔ مجھے اس پر محبت آ گئی۔ میں نے سوچا مجھے اس سے سیدھی بات کرنی چاہیے۔ انگریز اس رویے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ شاید اسے میرے غصے اور سرد مہری کی وجہ معلوم نہیں ہے۔ اچانک میں بت بنی کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ اس کے ساتھ ایک مرد لپٹا ہوا تھا۔ دونوں بالکل ننگے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں لیٹے تھے۔ ان دونوں کے غیر ختنہ شدہ عضو صاف صاف دیکھ کر میری تو تھرتھری چھوٹ گئی۔ زندگی میں پہلی بار مردانہ عضو اس طرح صاف دیکھا تھا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے لیے میں رانوں کے درمیان بھی بالکل خشک ہو گئی۔ پھر میں ان کی طرف لپکی۔ دونوں بوکھلا کر چونکے، لیکن ستر پوشی کی پھر بھی کوئی کوشش نہیں کی۔

پھر جیسے حیرت سے نکل کر دونوں نے مسرت بھرے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ میں پانی پھینک رہی تھی اور وہ اس طرح غرغرا رہے تھے جیسے بچے پانی میں کھیل رہے ہوں۔

کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟ جو کچھ مجھے نظر آ رہا تھا اس کا اُلٹ ہونا چاہیے تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر شرم سے زمین میں گڑ جاتے۔ لازم تھا کہ وہ اپنا آپ ڈھانپ کر گڑگڑاتے، سو طرح کے بہانے کرتے اور جھوٹ بولتے۔ یہ انگریز لڑکا اس طرح پکڑے جانے کے بعد اب زندہ کیسے رہ سکتا تھا!

وہ دونوں یسوع مسیح کو پکار پکار کر ہنسے جا رہے تھے۔ پھر وہ اپنے بدن خشک کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ انگریز لڑکے نے میرے چہرے کی طرف اشارہ کیا اور پھر ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ میرا چہرہ اُس پاگل ریچھ جیسا لگ رہا ہوگا جو ہمارے گاؤں کی گلیوں میں اپنے بنجارے مالک کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔

اس ہنسی نے مجھے غیظ وغضب سے دیوانہ کر دیا۔ اب میں انتقام لینا چاہتی تھی۔ لیکن کیسے؟ اس کے پاس تھا کیا جو میں اس سے چھین لیتی، اس کے سامنے توڑ ڈالتی، پھاڑ دیتی، پیروں تلے روندتی، کہ میرے غصے کی آگ بجھتی؟ اس کی کل متاع تو بس وہ کپڑے تھے جو اس نے پہن رکھے تھے، یا کچھ کیسٹ، جن کی قیمت یوں بھی تھوڑی بہت میں نے ہی ادا کی تھی۔ میں نے ان گنت بار وحشت میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ پھر میں نے شب خوابی کے لباس کے اوپر اپنا کوٹ پہن لیا، گرم پاجامے کے اوپر گرم موزے چڑھائے اور اس کے دوست کی بات سنے بغیر دروازے کی سمت دوڑ گئی۔ باہر نکل کر میں نے دروازہ دھڑ سے بند کیا اور چابی گھما کر تالا لگا دیا جیسے میں ارتکابِ جرم اور اس کے عینی شاہدوں کو وہاں محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ میں زیرِلب انگریزی میں ایک ہی فقرہ دہرائے جا رہی تھی: ''ذرا دیکھتے جاؤ اب میں کیا کرتی ہوں!'' پھر میں عربی بولنے لگی: ''تم لوگ پچھتاؤ گے۔ سب کو معلوم ہو جائے گا۔ مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔ ہفتہ بھر سے میرے پاس ہو لیکن کیا خاک! جیسے کوئی لڑکی ہو۔ یا پھر مخنث! اور میں اتنی بے وقوف۔ دل دل میں تعریف کرتی رہتی تھی کہ کیسا مہذب ہے۔ بس میری کمر میں بانہیں ڈالے گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ میں نے تو خود سے یہاں تک کہا تھا: انگریز ہے پھر بھی ہر بات سمجھتا ہے، لیکن اندر اندر یہ بھی چاہتی تھی کہ تم میرے ساتھ حد سے گذر جاؤ۔ لندن اتنی دور ہے... اور اب میں کبھی واپس نہیں جا سکوں گی۔ اب مجھے ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ مجھے ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ لیکن آخر کیسے معلوم ہوتا مجھے؟ اگر تمھارے سرین بڑے بھاری بھرکم ہوتے تب شاید کچھ اندازہ لگا لیتی۔ لیکن تم تو بالکل سوکھے سڑے ہو۔ تمھارا پچھایا تو ایک مٹھی جتنا ہے۔ میں پاگل ہوں۔ تمھاری گوری چمڑی اور سوکھے بدن اور بھورے بالوں نے ان باتوں کو اپنی اوٹ میں چھپا لیا جن کو وطن میں سوچنے سے بھی پھریری آ جاتی۔

میں نے اس کی بہن کو ایک پبلک بوتھ سے فون کیا۔ میری آواز سن کر اس نے روکھے لہجے میں کہا، ''کیا بات ہے؟''

''تمھارا بھائی...'' میں نے کہنا شروع کیا۔

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''کیا اس وقت تم نے مجھے بستر سے اس لیے اٹھایا ہے کہ میرے بھائی کے بارے میں بات کرو؟''

''بے حد ضروری بات ہے،'' میں نے کہا۔

اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے فوراً پوچھا، ''وہ ٹھیک تو ہے؟''

میں نے اس کو بتایا ہی کیوں؟ کیا اس لیے کہ وہ بھی مجھ پر چیخے چلائے، یہ کہے کہ میں پاگل ہوں، کہ میں اس کے بھائی کے ذاتی معاملوں میں نہ پڑوں جب کہ اس بات کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ بات ختم کرتے کرتے آخری وار یہ بھی کہ آئندہ ایسے وقت اسے ہرگز فون نہ کروں۔ پھر شاید غصے کے مارے وہ پوری طرح جاگ گئی اور بولی، ''مجھے علم ہے اُس دن کھانا تم نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا لیکن میرے بھائی کی جنسی پسند ناپسند نہ تمھارا مسئلہ ہو سکتی ہے نہ میرا۔''

''کتیا!'' میں فون پر چلائی تھی۔ پھر یہ یاد کر کے کہ کتوں کو تو اس ملک میں بہت پسند کیا جاتا ہے، میں انگریزی میں چیخی تھی، ''رنڈی! رنڈی!'' غصے سے کانپتی ہوئی میں چل پڑی تھی۔ میں چلی جا رہی تھی، اپنے خوابوں کے لندن میں جہاں فلک بوس عمارتیں تھیں اور تمام لوگ نہایت نفیس بیش قیمت لباس پہنتے تھے۔ میں اندھیرے میں چل رہی تھی جہاں کہیں کہیں پیڑ لگائے گئے تھے، جہاں کنسل ہاؤسز کی قطاریں تھیں جن کی ایک بھی کھڑکی روشن نہ تھی اور جو سب بالکل ایک جیسی شکل کے تھے۔ دودھ کی خالی بوتلوں کے ڈھیر جن سے بچے کھچے دودھ کی سڑاند آ رہی تھی۔ ان کے پاس سے گذرتے ہوے میں ایک بار پھر یہ تعجب کر رہی تھی کہ دودھ کی کمپنیاں لوگوں پر اتنا بھروسا کرتی ہیں کہ بوتلوں کو یوں ہی سڑک پر پڑا رہنے دیتی ہیں۔

فٹ پاتھ پر چیتھڑوں کے ایک ڈھیر سے شراب میں ڈوبی سانس کی بو کے ساتھ ایک آواز ابھری جو شراب خریدنے کے لیے پیسوں کی التجا کر رہی تھی۔ پہلے جب بھی لوگ مجھے سڑک پر روک کر بات کرنے کی کوشش کرتے تو میں مسکرایا کرتی تھی۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ لندن میں بھی بھک منگے ہوتے ہیں۔ میں انھیں پیسے دے دیا کرتی تھی۔ مجھے بہت فخر محسوس ہوتا تھا کہ میں کم از کم ایک انگریز سے تو زیادہ امیر ہوں، چاہے وہ فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

میں چلی جا رہی تھی اور کوئی شے میری رانوں کے درمیان سوراخ کر رہی تھی۔ مجھے عائشہ کے الفاظ یاد آئے، جب اناج کے گودام میں اس نے کہا تھا کہ میں لندن نہ جاؤں۔ ''اکیلی؟ نہ خالہ، نہ شوہر، نہ ماں، کوئی بھی ساتھ نہ ہو! لوگ کہیں گے بدچلن ہو گئی۔ خواہ تم طاہرہ ہی کیوں نہ ہو، سب آوارہ سمجھیں گے۔''

''کیا کہتی ہو!'' میں نے گھبرا کر کہا تھا، ''میں تمھارے پاس ٹھہروں گی۔''

عائشہ کا ہر سال وطن آنا میرے شوق کو مہمیز کر رہا تھا۔ میرے روح میں سفر کے اشتیاق کا بیج پڑ گیا تھا۔ پھر وہ بلند و بالا ہو گیا اور میری آنکھوں اور زبان تک آ پہنچا۔ میں اسے اناج کے گودام میں گھسیٹ لے گئی اور اس سے التجا کی کہ مجھے بھی لندن لے چلے۔ جب وہ آخری بار آئی تھی تو اس کے طلائی آویزوں اور

چوڑیوں سے میری نظر ہی نہ ہٹتی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ اس کے بغیر میرا خاندان مجھے نہ جانے دے گا۔ میرا اشتیاق صرف اس کی اونچی ایڑی کے سینڈل اور میچنگ بیگ ہی کے باعث فزوں تر نہ ہوا تھا۔ خس خس کے دانوں اور دوسرے اناج کی بو جو فضا میں بسی ہوئی تھی، مجھے بار بار یاد دلاتی تھی کہ میری حالت کیا ہے۔ اب میں صرف انگلستان کی مہک سونگھنا چاہتی تھی جو عائشہ کے سراپے سے پھوٹ رہی تھی۔ میں نے اسے مجبور کیا کہ میری بات سنے اور میرے احساسات سمجھے۔ پھر میں نے اپنے کانوں سے چھوٹی چھوٹی سونے کی بالیاں اتاریں، اور تمام رقم جو میں برسوں سے اپنے بھائی کی جیب سے چراتی رہی تھی، اپنے لباس کی سلوٹوں سے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ کر اس کی مٹھی زبردستی بند کر دی۔ میں اسے خاندان والوں سے اپنے جھگڑوں کی مبالغہ آمیز داستان سناتی رہی۔ وہ برابر اصرار کر رہی تھی کہ میں لندن جانے کا خیال دل سے نکال دوں، کہ لندن میں کام بہت سخت ہوتا ہے اور جلاوطنی کی زندگی بہت دشوار ہوتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے میرے اپنے ساتھ جہاز میں سفر کرنے کا خیال ناگوار ہے؛ وہ نہیں چاہتی کہ میں بھی اس کی طرح ہر برس تحفوں سے لدی ہوئی واپس آیا کروں۔ بھلا انگلستان کے شاندار فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کا ہمارے گھر کی اکتا دینے والی صفائی سے کیا مقابلہ! یہاں تو بس چیتھڑے ہیں اور جھاڑو اور پانی کی بالٹی۔ اکڑوں بیٹھ کر فرش رگڑنا پڑتا ہے اور ڈھیروں کپڑے ہاتھ سے دھونے پڑتے ہیں۔

برٹش کسٹم پر بیٹھا ہوا آدمی تو اس مجسٹریٹ سے بھی زیادہ خشم ناک تھا جو دارالسلطنت سے ہمارے گاؤں مقدموں کی تفتیش کے لیے آیا کرتا تھا۔ جب وہ آتا تھا تو کم از کم کچھ دیر کے لیے اپنی آمد کا مقصد بالکل بھلا دیتا تھا۔ وہ گاؤں کے محتسب کے گھر چائے پیتا، پیٹ بھر کر کھانا کھاتا، ہنسی مذاق کرتا اور گرمی کی لمبی دوپہریں سو کر گذارتا۔ اونچی میز کرسی پر بیٹھے برٹش آفیسر نے مجھ سے کئی سوالات پوچھے تھے جو میری خاک سمجھ نہ آئے تھے۔ صرف دو لفظ تھے جنھیں میں بار بار دہرا رہی تھی: ''نو انگلش!'' پھر اس نے پوچھا، ''فرنچ آتی ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا، اور گویا میرے ایک فرنچ لفظ ''وی'' (ہاں) نے کھل جا سم سم کی طرح علی بابا کے غار کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ پرسکون ہو گیا اور اس نے میرے پاسپورٹ پر کھٹ سے مہر لگا دی۔ بلا ارادہ ہی اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ فرانسیسی کے الفاظ، چاہے کتنے ہی اٹک اٹک کر بولے جائیں، لندن کی ہر زندہ یا مردہ شے پر جادو کا سا اثر کرتے ہیں۔

دوسرے دن میں عائشہ کے گھر بیدار ہوئی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں لندن میں ہوں۔ اس کا فلیٹ بالکل وطن کے کسی فلیٹ جیسا لگ رہا تھا۔ وہی مہک، ویسے ہی رنگین دیوان اور غالیچے، کمرے کے وسط میں برنجی میز، عائشہ کے دونوں بچوں کی چیخ پکار ہوا میں سوراخ سا کرتی ہوئی۔ لیکن جوں ہی میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا، یکسانیت کا احساس غائب ہو گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنی لاعلمی کے باعث

میں کس طرح قید ہوں، اور عائشہ نے اسی کا فائدہ اٹھایا؛ کہ مجھے غسل خانے کا فلش استعمال کرنا نہیں آتا، میں نہیں جانتی کہ شاور کیسے چلاؤں، برقی تنور کیسے آن کروں، بجلی کی کیتلی سے چائے کیسے بناؤں، اور میں اس کے بڑے بچے یا اس کی پڑوسن کی کہی ہوئی کوئی بات نہیں سمجھ سکتی۔ میں تو ٹیلی فون پر کوئی جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ نت نئے بہانے تراش کر عائشہ نے مجھے گھر میں قید کر دیا۔ اس نے کام تلاش کرنے میں میری ذرا بھی مدد نہ کی۔

کھڑکی سے مجھے سامنے فلیٹوں کی قطار نظر آتی تھی۔ سیدھے خطوط پر بنے ہوئے وہ بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں جیسے لگتے تھے۔ ان کے دریچوں سے شور کی آواز تیرتی ہوئی آتی تھی۔ کبھی میری نگاہیں بھٹکتی ہوئی فلیٹوں کے ساتھ گھاس کے قطعے پر جم جاتیں جہاں زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ میں لندن کی سرخ بسوں کو اور گاڑیوں کو تیزی سے سامنے کی شاہراہ سے گذرتے ہوئے دیکھتی۔ تب ان پر نظریں جما کر میں عائشہ کو کوسے بغیر نہ رہ سکتی۔ خدا اسے غارت کرے؟ رسول پاک کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گی، کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ میں بھی ان راستوں پر چلوں، ان بسوں میں سفر کروں اور اپنا علیحدہ فلیٹ یا کوئی کمرہ ہی حاصل کرلوں۔ جب عائشہ کام سے واپس آ کر دروازے میں داخل ہوتی، بھاری بھاری پلاسٹک بیگ اٹھائے ہوئے— اس کے کوٹ سے عطر اور سگریٹ کی ملی جلی مہک آتی تھی— تب میں غصے سے کانپ اٹھتی تھی، میں بھی اس کی طرح شاپنگ بیگ اٹھانا چاہتی تھی، اس کا سا کوٹ پہننا چاہتی تھی!

ہر چیز میری دسترس سے پرے تھی۔ میں نے بالآخر ان کبوتروں سے دوستی کرلی تھی جو ہر جگہ تھے اور جن کی دھیمی دھیمی غٹرغوں سننے کی مجھے عادت ہوگئی تھی۔ انھیں بلانے کے لیے میں بچا ہوا کھانا کھڑکی کی منڈیر پر رکھ دیتی تھی اور جب ان میں سے کوئی ایک اڑ کر میرے نزدیک بیٹھ جاتا تو میں اس سے باتیں کرتی تھی۔ ''لو یہ خس خس کھاؤ۔ اسے بھاپ دی گئی ہے اور اس میں تیل ملایا گیا ہے۔ انگریز کبوتر! بتاؤ کیسا لگا؟''

یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ یہاں تیار شدہ خس خس پیکٹ میں مل سکتا تھا اور انگریز اپنے کھانوں میں اسے استعمال کرتے تھے۔ میں نے تو سوچا کہ وہ صرف شاہانہ طعام کھاتے ہوں گے، ہمارے کھانوں کو تو وہ بالکل حقیر گردانیں گے۔

عائشہ کے قید خانے سے میں اس طرح نکلی۔ ایک دن ایک عورت جو ہمارے ہی گاؤں کی تھی اپنی سلائی کی مشین لینے آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا، ''کیا تم یہاں خوش ہو؟'' میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ جواباً اس نے اور بھی زیادہ ٹھنڈی آہ بھری۔ میں نے اس سے خوب جھوٹی سچی باتیں کیں! حالانکہ عائشہ کے گھر سے نکلتے ہی وہ بالکل سچ معلوم ہونے لگیں۔ میں نے اسے بتایا کہ عائشہ کیسے میرے کھانے پینے پر کڑی نظر رکھتی ہے اور کس طرح مجھے اپنے یہاں رہنے کا خرچ پورا کرنے کے لیے اس کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال

کرنی پڑتی ہے۔ عورت میری ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ اس نے کہا،"ہاں، سب کہتے ہیں کہ عائشہ بالکل انگریز ہوگئی ہے۔ تم کو یہاں رکھ کر وہ کچھ نہیں تو تیس پونڈ ہفتے کی بچت کر رہی ہے۔ پہلے جب وہ کام پر جاتی تھی تو پڑوسن کو بچے رکھنے کی اجرت دیتی تھی۔"

ہم نے فی الفور عائشہ کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا۔ ہم اس میں کیڑے نکالنے اور برا بھلا کہنے لگے۔ اس عورت نے عائشہ کے بارے میں ایسی باتیں کیں جن پر مجھے بالکل یقین نہ آیا لیکن میں یوں سر ہلاتی رہی گویا اس کی تائید کر رہی ہوں۔ بلکہ میں نے خود یہ کہا کہ ہو نہ ہو، عائشہ کے کسی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ پھر اس کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے ہم اس کا سامان الٹ پلٹ کرنے لگے۔ ہم نے وہاں کی واحد الماری کا تالا توڑ ڈالا۔ اس میں نئے کپڑوں، جوتوں اور زیوروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ زیور عائشہ نے جوتوں کے سامنے والے حصوں میں چھپا رکھے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے سے کہا کہ ضرور عائشہ کا یار اسے پیسے دیتا ہوگا۔ اس نے مجھے گھر میں بچوں کے ساتھ اسی لیے قید کر رکھا ہے کہ خود اپنے عاشق کے ساتھ عیش کرتی پھرے اور اس کے خاوند کو کچھ پتا نہ چلے۔

ہماری ہذیانی باتیں دیواروں کے سوا کسی نے نہ سنی تھیں لیکن اچانک میں چور سی بن گئی۔ مجھے لگا کہ دونوں بچوں نے ہر بات سن لی ہے، بلکہ عائشہ کے کانوں میں ہر بات گونج رہی ہے، اور میں نے فی الفور اپنا سوٹ کیس تیار کر لیا۔ عورت سلائی کی مشین بھول بھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اس کے ساتھ چل دی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ اب عائشہ سے کبھی ملاقات نہ ہوگی اور اس کی الماری کا تالا توڑے جانے کی خبر پورے گاؤں میں نمک مرچ لگا کر سنائی جائے گی۔ شاید مجھ پر یہ الزام بھی لگے گا کہ میں نے عائشہ کے گھر کا ایک ایک تنکا چرا لیا۔

اس عورت کے مشورے پر میں نے فی گھنٹا اجرت کا کام تلاش کیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وقت ہی دولت ہوتا ہے۔ میں نے جی جان سے کام کرنا شروع کر دیا۔ میں دفتر، چائے خانوں، اسپتالوں، غرض جہاں موقع لگا وہاں کی صفائی میں جٹ گئی۔ پونڈوں کی بڑھتی ہوئی گڈیوں کا خیال ذہن میں آتا تو میں مشقت اور بھی تیز کر دیتی۔ مجھے نہ اپنی تھکن کی پروا تھی نہ اپنے اعضا کی پکار پر کان دھرتی تھی جو آرام کے لیے، پوری نیند کے لیے تڑپتے رہتے۔ صرف اس انگریز لڑکے سے ملاقات کے بعد میں نے یوں دیوانوں کی طرح کام کرنا ترک کیا تھا۔ یہی انگریز لڑکا جس پر میں چند لمحے پہلے پانی پھینک رہی تھی۔

کام ملنے پر میں نے اس عورت کا گھر چھوڑ کر اپنا علیحدہ کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ جب مجھے بتایا گیا کہ یہاں باورچی خانے اور غسل خانے میں دوسرے کرایہ داروں کے ساتھ ساجھے داری کرنی ہوگی تو میں یہ سوچے بنا نہ رہ سکی تھی کہ وطن میں لوگ اس بات پر کتنے حیران ہوں گے۔ وہ کتنا ہنسیں گے کہ ام التہذیب

انگلستان میں ایسی بات بھی ممکن ہے! یہ انگریز لڑکا ایک اسپتال میں ہفتے میں ایک دن کام کرتا تھا اور باقی دن غائب رہتا تھا۔ چائے اور کھانے کے وقفے کے دوران میں نے اسے کبھی ایک بسکٹ یا چاکلیٹ کے سوا کچھ کھاتے نہ دیکھا تھا۔ نہ وہ کبھی کسی سے بات کرتا تھا۔ وہ بس اپنا ہیڈفون کانوں میں لگا کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اس کے بال سنہرے تھے، آنکھیں کرنجی اور چہرہ دبلا پتلا تھا۔ شاید میرا دل اس پر مائل ہو گیا تھا، حالانکہ میں نے یہی یقین کرنا چاہا تھا کہ مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے کچھ کھانے کی پیش کش کروں۔ جب میں نے اس سے مخاطب ہو کر اسے مرغی کے گوشت کا ایک ٹکڑا پیش کیا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں اور پہلے اس نے انکار کر دیا۔ جب میں نے اصرار کیا تب اس نے ہاتھ بڑھایا، مگر یہ کہتے ہوئے: ''واقعی؟'' میں اس پر مسکرا دی تھی۔ انگریزوں کی کہی باتوں پر میں اب دھیان نہیں دیتی تھی۔ ''واقعی؟ آر یو شیور؟'' وہ ہر بات پر کہتے ہیں، چاہے آپ ان کو مدد کی پیش کش کریں کھانے کی دعوت دیں، چائے کی پیالی پیش کریں یا ان کا بس کا کرایہ ادا کر رہے ہوں۔

زیرے اور زعفران میں بسا گوشت کا ٹکڑا کھا کر، جو اسے ضرور پسند آیا ہوگا، اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کی ہوں۔ جب میں نے اسے بتایا تو یوں لگا جیسے اس پر جنت کا در وا ہو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر نرم تاثر آ گیا، آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں، ان کا رنگ زیتون کے تیل کی طرح گہرا سبز ہو گیا۔ اس نے مجھے بہت اشتیاق سے بتایا کہ وہ جانے کب سے مراکش جانا چاہتا ہے، بلکہ وہاں رہ پڑنا چاہتا ہے، اور یہ بھی کہ ہماری حشیش دنیا میں سب سے اچھی ہوتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ اس نے نہایت تردد سے دریافت کیا تھا۔ کیا یہ واقعی سستی ہوتی ہے؟ میں نے اس سے خوب جھوٹ بولا۔ اس کے دلچسپی لینے پر میں اس قدر خوش تھی۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھ سے کبھی بات بھی نہیں کرے گا۔ میں نے کہا کہ حشیش تو میں خود اگاتی تھی بلکہ میرا پورا خاندان یہی اگاتا ہے۔ حشیش تو مراکش میں ہر جگہ ایسے بکھری پڑتی ہوتی ہے جیسی لندن میں سبز گھاس اور دودھ کی خالی بوتلیں نظر آتی ہیں۔ اور یہ نہایت حیران کن قسم کی ہوتی ہے؛ میں کہیں اس کے دانے بھی پھینک دوں تو اس کے پودے ہوا میں شعلوں کی طرح لہرانے لگتے تھے۔

حشیش اور گرم دھوپ کے خواب سے مسحور ہو کر اس نے کہا تھا، ''اِس گدلے بھورے بادلوں والے آسمان اور اس منحوس ملک کے لیے تم نے اتنی اچھی دھوپ کو خیرباد کہہ دیا؟''

''میں دھوپ کا کیا کرتی؟'' میں نے جواب دیا تھا۔ ''کیا چھت سے جھاڑو دے کر صاف کرتی؟''

وطن میں کیا تھا، میں چشمِ تصور سے دیکھ سکتی تھی۔ وہاں کے شب و روز کی یکسانیت کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ غربت اور خالی پن۔ مجھے خاندان کے مردوں کی دھمکی بھری نظریں یاد آئیں، سڑک پر راہ گیروں کی گھورتی نگاہیں۔ میری ماں کا درشت اندازِ گفتگو اور میں نے اپنے آپ سے دہرایا:

''کیا کرتی میں دھوپ کا؟ کیا چھت سے جھاڑو دے کر صاف کرتی؟''

میں لندن میں خوش تھی۔ آزاد، اپنی اور اپنی جیب کی آپ مالک۔ وطن میں مجھے بدصورت سمجھا جاتا تھا، اور یہاں ایک ہفتے کے اندر ہی میرے کانوں نے انگریز لڑکے کے منہ سے اپنی جلد کی سیاہ رنگت اور گھنگھریالے بالوں کے قصیدے سنے تھے۔ میرے رخساروں نے اس کے مسرت بھرے بوسے کالمس محسوس کیا تھا، جب میں کھانا پکاتی تھی، جب کام سے واپس آتی تھی، یا جب ہم ساتھ بیٹھے ٹی وی دیکھتے تھے۔ اگر مجھے کام پر دیر ہو جاتی تو وہ مجھے اپنے انتظار میں راستے پر کھڑا ملتا تھا۔

ایک بار وہ مجھے پب لے گیا۔ میں لندن کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لے آنا چاہتی تھی۔ اس دن میں نے اسے ترغیب دی تھی کہ میرے ساتھ رہنے لگے۔ پب کے شور شرابے میں حالانکہ میں نے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا اور تمام وقت صرف پانی پیتی رہی تھی، پھر بھی میں لندن والوں کی طرح اس بھیڑ اور دھویں میں کھڑی تو تھی، نازاں، مسرور اور خود اعتماد...

اس رات میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھے چھیڑتے ہوئے اعلان کیا تھا: ''اتنا عمدہ بستر اور لحاف اور کیسٹ اور ٹی وی اور وڈیو... یقیناً تم بہت امیر ہو!'' پھر اس نے کہا تھا کہ اس کو یہی توقع تھی۔ اسپتال میں اس نے دیکھا تھا کہ میں اپنی علیحدہ پلیٹ اور مگ استعمال کرتی ہوں اور ساتھ بیٹھنے والے کی چائے کے پیسے بھی دے دیتی ہوں۔ میں نے خوشی سے سر ہلایا تھا۔ چلو اچھا ہے کہ اسے یہ خوش فہمیاں ہیں۔ لیکن مجھے حیرت تھی کہ اس لڑکے کو قسطوں پر چیزیں خریدنے کا راز بالکل معلوم نہیں۔ میرے بستر پر وہ اچھل کر لیٹ گیا تھا۔ پھر طرح طرح سے لیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا تھا، ''کتنا صاف بستر ہے! اور کتنا آرام دہ۔'' پھر اس نے کہا تھا، ''میں تو زندگی بھر ایسے بستر پر نہیں لیٹا۔''

کیا میں نے صحیح سنا تھا؟ یا ایک بار پھر مجھے سمجھنے میں غلطی ہو رہی تھی؟ ہم ایسے باتیں کرتے جیسے گیند کا کھیل ہوتا ہے۔ کبھی کبھار گیند گول میں چلی جاتی ہے، کبھی کھمبے کو چھو لیتی ہے، لیکن زیادہ تر ہوا میں اچھل کر رہ جاتی ہے۔ وہ کبھی ایسے بستر پر نہیں سویا! لیکن ان بستروں کے اشتہار ہر وقت ٹی وی پر آتے ہیں۔ لندن کے ہر بڑے اسٹور میں تو یہ رکھے ہوتے ہیں، دکانوں کے بڑے بڑے شیشوں کے پیچھے سجے ہوئے! میں تو سمجھتی تھی کہ بس میں سے مجھے جتنے گھر نظر آتے ہیں، سب کے اندر یہ بستر موجود ہوں گے۔

وہ میرے بستر پر آرام سے صبح تک سوتا رہا تھا۔

جن تنگ گلیوں اور محلوں میں میں آوارہ گردی کر رہی تھی وہاں لندن سوتا نہیں تھا۔ اور اگر سوتا تھا تو لمبے چوڑے برقی اشتہار جاگتے رہتے تھے۔ فلموں کے ٹاپ کنسرٹ کے، دودھ کے اشتہار، منشیات کے بارے میں، ایڈز کے بارے میں... ایڈز؟ میں اچانک چونک پڑی۔ یہ تو ایڈز سے مرجائے گا، مجھے اس کو

بتانا چاہیے۔ انگلی ہلا کر دھمکی دوں: ''تم ایڈز سے مرجاؤ گے!'' اس پر میرے دماغ نے چیخ ماری۔ ''میں بھی تو... میں ایڈز سے مرجاؤں گی! یا اللہ!''

پھر میں نے خود کو تسلی دی۔ ''میرے اندر دو دفعہ گیا ہے، لیکن چھوٹا تو باہر... '' مگر میں پھر خوف سے بے آواز چیخ پڑی۔ ''کیا پتا؟ ہوسکتا ہے جراثیم اس کے عضو سے باہر پھسل کر میرے اندر گھس گئے ہوں!'' بے اختیار میری نگاہیں اوپر اٹھ گئیں — یعنی جہاں خدا تھا — اور التجا کرنے لگیں کہ وہ میری حالت پر رحم کھائے۔ لیکن وہاں نہ چاند تھا نہ ستارے؛ سیاہ آسمان تھا اور بس۔ میں نے نظریں جھکالیں، دل ہی دل میں خدیجہ کی بات پر گویا صاد کیا۔ جب خدیجہ نے سنا کہ میں لندن جانا چاہتی ہوں تو اس نے کہا تھا، ''غیرملکیوں کا کوئی خدا نہیں ہوتا۔'' وہ میرا ارادہ کمزور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنی تصحیح کی تھی۔ ''خدا معاف کرے،'' اس نے پھر توبہ کی تھی۔ اس نے کہا تھا، ''میں کیا بک گئی! خدا تو واحد ہے اور حاضر و ناظر... میرا مطلب یہ تھا کہ مغرب میں لوگ خدا کے احکامات کی پروا نہیں کرتے۔'' یہ کہہ کر وہ فوراً اٹھی اور تکفیر کا ازالہ کرنے کے لیے دس بار کلّی کی تھی اور بیس رکعت نماز ادا کی تھی۔

میں اپنے کمرے میں واپس جانے کے لیے بے تاب تھی جیسے مجھے اس سے کچھ کہنا ہو؛ اس جگہ کو جہاں میں رہتی تھی، اپنے احساسات بتانے ہوں۔ میں نے قدم تیز کر دیے اور اپنے آپ سے سوال کیا: آخر میں کیوں یہاں رہ رہی ہوں؟ اور مجھے جواب کا علم نہ تھا۔ میں اپنے وطن واپس کیوں نہیں چلی جاتی؟ اس چادر سمیت جس پر میرے بکارت زائل ہونے کے داغ لگے ہوے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں دھویا تھا، ایک سوٹ کیس میں ٹھونس دیا تھا۔ ہوسکتا ہے کبھی مجھے یہ چادر رات کی تاریکی میں اپنے دولھا کے بستر پر بچھانی پڑے۔ میں کچھ رقم پس انداز کرلوں گی اور پھر شادی کے لیے کوئی آدمی ڈھونڈ نکالوں گی۔ مل ہی جائے گا، خصوصاً اگر میں اسے اپنے ساتھ لندن لانے کا وعدہ کروں۔ لیکن میں یہاں کیوں رہ رہی ہوں؟ کیا اس لیے کہ یہاں میں خاندان کے مردوں کی کھوجتی، تلاشیاں لیتی نگاہوں سے محفوظ ہوں؟ اور اپنی آمد و رفت کے بارے میں ان کے مسلسل سوالوں سے۔ اور ماں کی تفتیش سے: میں پیٹ کے بل کیوں سوئی؟ غسل خانے میں اتنی دیر سے کیا کر رہی تھی؟ اُس دور دراز وطن کے خدا کو ضرور یاد ہوگا کہ وہاں میں روز چار دفعہ نماز پڑھتی تھی۔ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا ہوگا۔ اب مجھے ایڈز سے اور شیطان سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ میں نے باہر کا دروازہ کھولا اور کمرے سے وردہ الجزائریہ کے نغمے کی آواز سنی۔ کمرے میں گئی تو میرے سامنے میرا اپنا دوسرا روپ کھڑا تھا جس کی آنکھیں سبز اور بال سنہرے تھے۔ انگریز لڑکے کے دوست نے میرے کپڑے پہن رکھے تھے، آنکھوں میں میرا کاجل لگا لیا تھا، میرے جھمکے پہن لیے تھے۔ وہ ایک عربی گیت کی تال پر سر ہلا رہا تھا۔

میں اپنے گورے روپ کے سامنے کھڑی تھی، اپنے پُر سکون رہنے پر خود حیران۔ انگریز لڑکے کے دوست کے بدن پر اپنے کپڑوں کا جائزہ لیتی ہوئی۔ سڑکوں پر اپنے گندمی روپ سے طویل گفتگو کے بعد اس گورے روپ کے روبرو آ جانے پر دماغ کی دھند جیسے چھٹ گئی۔ اب تمام تصویریں صاف صاف نظر آ رہی تھیں۔

مجھے سعد کی تصویر کو ذہن سے جھٹکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی، جب اس کو فرش پر لٹایا گیا تھا۔ نہ میں اس کی بھاری، تیز ہوا کی طرح گونجتی آواز کو بھلانا چاہتی تھی جو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ خاندان کی عورتوں نے چھاتی پیٹی تھی اور سر میں خاک ڈال کر منہ پر راکھ مل لی تھی۔ سعد نے اُس رات اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا تھا جب یہ خبر پھیل گئی تھی کہ وہ ایک خانہ بدوش لڑکے کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ پھر وہ بول نہیں سکا۔ اس نے اپنی آواز نگل لی تھی۔ لفظ اس کے حلق میں پھنس گئے تھے۔ اور اس کے بعد اس کی بہنوں اور بیٹیوں کی آوازیں... جب سعد کا خط لوگوں کے ہاتھ لگا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ بے گناہ ہے تو گاؤں بھر میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ سعد کے خاندان والے اس شاہد سے انتقام لینے پر تل گئے تھے جس نے یہ بات ایسے جنونی انداز میں ہر ایک کو بتائی تھی جیسے اس پر بھوت سوار ہو گیا ہو۔ اسے سعد کے مرنے جینے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ گاؤں بھر کو کسی طرح یہ یقین دلا دے کہ اس جلتی دوپہر جھونپڑی میں اس نے کیا دیکھا تھا۔ گاؤں والے دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو سعد کی نیک نامی بحال کرنا چاہتے تھے، اور دوسری طرف وہ جو سعد کے مرنے کے بعد بھی اس کا جرم ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ سعد کی روح کو چین نصیب نہیں ہوگا۔ وہ ہمیشہ ان طویل راتوں میں بھٹکتی رہے گی۔

میں نے یہ سب یاد کیا اور میں ہنسی۔ میرا گورا روپ میرے گاؤں کے لوگوں پر ہنسا۔ میں نے تصور کیا جیسے سعد انگریز لڑکے کے ساتھ لیٹا ہوا ہے، جیسے دونوں چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ انگریز لڑکے نے مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا، جیسے اسے میرے ہنسنے کا، میرے غصے میں لال بھبھوکا نہ ہونے کا یقین ہی نہ آ رہا ہو۔ میں ان دونوں کو دیکھ کر مسکرا دی۔ میں نے کہا کہ اس لڑکے پر میرے کپڑے بڑے سج رہے ہیں۔ اس نے پوچھا، ''تمھارے پاس کفتان ہے؟'' میں نے افسوس کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ میں کفتان اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ میرا خیال تھا وہ میرے روپہلی پٹی والے کفتان کو حقارت سے دیکھیں گے۔ اور پھر میں نے اس طرح کے لباس یہاں لندن میں اتنے مہنگے داموں فروخت ہوتے دیکھے! میں اب بھی ہنسے جا رہی تھی۔ میں نے تصور کیا جیسے لندن کی سڑکوں کے بھکاری میرے گاؤں میں بڑھی خدیجہ کے ساتھ بیٹھے ہیں، جیسے لندن کی لال بس کا کنڈکٹر گاؤں کے ڈاکیے حماد سے باتیں کر رہا ہے، جیسے انگریز لڑکے کا دوست خدیجہ کے پوتے سے کھیل رہا ہے، مارگریٹ — رنگین بالوں والی

مارگریٹ — گاؤں کی ایک دکان میں ایک نرم، رنگ دار جھاڑو بالکل اس کے بالوں جیسی تھی۔ خدیجہ کا پوتا ہر بار اس کی فرمائش کرتا تھا۔ وہ اسے کھلونا یا کوئی پرندہ سمجھتا تھا — مارگریٹ گاؤں کا حمام چلانے والی عورت کی بیٹی ثانیہ سے باتیں کر رہی ہے۔ میں نے دیکھا جیسے زمین سے ان گنت لوگ اگتے جا رہے ہیں اور آسمان سے رسیاں لٹکا رہے ہیں۔ وہ لال بسوں میں سوار ہو رہے ہیں اور الٹی سیدھی انگریزی بول رہے ہیں۔ اور انگریز عورتیں بچہ گاڑیاں چلاتی ہوئی گاؤں کی پگڈنڈیوں پر چلی جا رہی ہیں۔ انگریز بڑھیائیں کانپتے ہاتھوں سے اپنے چہروں پر پنکھے جھل رہی ہیں اور ساتھ ہی سروں پر اپنی رنگ برنگی اونی ٹوپیاں بھی پہنے ہوئے ہیں۔

ٹی وی سے ایک غلغلہ بلند ہوا۔ میں نے دیکھا، بجلی کمپنی کا اشتہار آ رہا تھا۔ بجلی کا چولھا، بجلی کا ہیٹر، بجلی کا بوائلر... مجھے بجلی کا پانی گرم کرنے والا بوائلر خریدنا ہے۔ پچھلا گیس والا بوائلر ہفتے بھر سے بودے رہا تھا۔ بوائلر ٹھیک کرنے والے نے کہا تھا کہ یہ پھٹ سکتا ہے۔ ہماری یاد دہانی کے لیے اس نے وہاں ایک وارننگ چسپاں کر دی تھی۔

میں نے مڑ کر انگریز لڑکے سے پوچھنا چاہا کہ وہ میرے یہاں کیوں رہتا ہے۔ میری رفاقت کو کیوں پسند کرتا ہے؟ ایک دفعہ اس نے کہا تھا کہ میں اس کی اتنی پروا کرتی ہوں جتنی کسی نے کبھی نہیں کی، اس کی ماں باپ تک نے نہیں، اور یہ کہ اس کی آرزو ہے کہ ایک دن وہ میرے وطن ضرور جائے۔ اس وقت میں نے اس کی بات پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ مجھے لوگوں کے منھ سے سچی بات سننے کی عادت نہیں تھی۔ سنی ہوئی باتوں کو جو مطلب میں خود پہناتی وہ میرے لیے زیادہ قابلِ یقین ہوتا تھا۔

لیکن اس کے بدلے دماغ میں دوسرا ہی خیال آیا۔ ایڈز! میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگوں کو ڈاکٹر سے معائنہ کروالینا چاہیے۔''

میں سوچ رہی تھی، اس چادر کو کھولتے پانی میں ڈالوں گی اور بازار سے کوئی کارگر جراثیم کش دوائی خریدوں گی۔ میں سر کے کا ڈُوش لے لوں گی تاکہ سب جراثیم مر جائیں۔

دونوں باورچی خانے میں چلے گئے اور میں نے کمرے میں ادھر ادھر بکھری پلیٹیں سمیٹنا شروع کیں۔ بچا ہوا کھانا میں نے کھڑکی کی منڈیر پر رکھ دیا۔ کبوتر فوراً اس کے گرد جمع ہو گئے، حالانکہ ابھی صبح کاذب تھی۔ مجھے معلوم تھا پڑوسی شکایت کرتے ہیں کہ اس طرح کبوتر کھڑکیوں کے بہت نزدیک آنے لگے ہیں لیکن مجھے پروا نہیں تھی۔ ''لو کھاؤ!'' میں نے نزدیک ترین کبوتر سے کہا، ''تم خوش قسمت ہو، میں تمھیں کھلا رہی ہوں۔ خود تم کو نہیں کھا رہی۔ جہاں سے میں آئی ہوں وہاں اگر ہمیں کبوتر نظر آئے تو ہم پتھر مارتے ہیں۔ اگر کبوتر گر جائے تو ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اسے ذبح کرتے ہیں اور کھا لیتے ہیں۔ اگر وہ بچ جائے اور

اڑتا رہے تو ہم راضی بہ رضا رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: آج فرشتے کی باری ہے۔تم خوبصورت نہیں ہو۔ سفید تو کیا، بھورے بھی نہیں ہو۔تم سیاہ اور سرمئی ہو،کسی موٹے سے چوہے کی طرح،لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں۔کیوں کہ تم انگریز ہو اور ہر روز میرا انتظار کرتے ہو۔"

حنان الشیخ

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

قالین

جب مریم میرے بالوں کو چھوٹی چھوٹی دو چوٹیوں میں گوندھ چکی تو اس نے انگلی منھ تک لے جا کر اس کے سرے کو زبان سے تر کیا، پھر اسے میری بھنوؤں پر پھیرتے ہوے آہستہ آواز میں کہنے لگی، ''آہ، تمھاری بھنویں کیا خوب ہیں، پورا گھران کے سائے میں لگتا ہے۔'' پھر وہ تیزی سے میری بہن کی طرف مڑی اور اس سے بولی، ''جا کر دیکھو، کیا تمھارے ابا اب تک نماز پڑھ رہے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ میں جان سکوں، میری بہن جا کر واپس آ چکی تھی اور سرگوشی میں کہہ رہی تھی، ''ہاں، اب تک پڑھ رہے ہیں۔'' اس نے ان کی نقل کرتے ہوے اپنے ہاتھ اٹھائے اور انھیں آسمان کی طرف بلند کیا۔ میں ہنسی نہیں جیسے ہمیشہ کرتی تھی۔ مریم بھی نہیں ہنسی۔ بجائے اس کے، اس نے کرسی پر سے اپنی اوڑھنی لی اور بالوں کو اس سے ڈھانپ کر جلدی سے اسے گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ پھر بہت احتیاط سے الماری کھول کر اس نے اپنا تھیلا نکالا، اسے بغل میں دبایا اور اپنا ایک ایک ہاتھ ہم دونوں کی طرف بڑھا دیا۔ ایک ہاتھ میں نے پکڑ لیا اور دوسرا بہن نے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں بھی اس کی طرح دبے پاؤں، سانس روک کر سامنے کے کھلے ہوے دروازے کی جانب چلنا ہے۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوے ہم نے مڑ کر دروازے کو دیکھا، پھر کھڑکی کو۔ آخری سیڑھی تک پہنچ کر ہم دوڑنے لگے اور اس وقت تک نہ رکے جب تک گلی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی اور ہم نے سڑک پار نہ کر لی اور مریم نے ٹیکسی نہ روک لی۔

ہمارے اس طرزِ عمل کا سبب خوف تھا، کیونکہ آج ہم امی کے طلاق لے کر ابا کے گھر سے چلے جانے کے بعد پہلی بار ان سے ملنے جا رہے تھے۔ ابا نے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ امی کو کبھی ہماری صورت نہیں دیکھنے دیں گے، کیونکہ طلاق کے چند ہی گھنٹوں بعد خبر پھیل گئی تھی کہ وہ اس شخص سے شادی کرنے والی ہیں جس

سے وہ، اپنے والدین کے مجبور کرنے پر ابا سے شادی کرنے سے پہلے، پیار کرتی تھیں۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، خوف سے یا دوڑنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ امی سے ہونے والی ملاقات کے اشتیاق اور گھبراہٹ کے احساس کی وجہ سے۔ میں نے خود پر اور اپنی شرم پر قابو پا رکھا تھا، پھر بھی میں جانتی تھی کہ خواہ کتنی ہی کوشش کروں، میں اپنی ماں کے سامنے بھی اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میرے اختیار سے باہر تھا کہ امی سے لپٹ جاؤں، انھیں بوسے دینے لگوں اور ان کا سر سینے سے بھینچ لوں، جبکہ بہن یہ سب بڑی بے ساختگی سے کر سکتی تھی۔ جس وقت مریم نے مجھ سے اور بہن سے سرگوشی میں کہا تھا کہ ہم اگلے روز امی سے ملنے جانے والے ہیں، تبھی سے میں اس مستقل اور شدید فکر میں غرق تھی۔ میں نے تصور کرنا شروع کر دیا تھا کہ میں وہی کروں گی جو بہن کرے گی؛ میں اس کے پیچھے کھڑی ہو جاؤں گی اور اس کی حرکات کی نقالی کرنے لگوں گی۔ مگر میں اپنے آپ کو جانتی ہوں: میں نے خود کو خود پر حرف بہ حرف نقش کر رکھا ہے۔ میں کتنا ہی خود کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں، کتنا ہی پہلے سے سوچ کر رکھوں، اصل صورت حال کا سامنا ہونے پر، فرش پر نظر گاڑے بے حرکت کھڑے ہوے، جبکہ میری پیشانی پر پڑے ہوے بل اَور گہرے ہو رہے ہوں گے، مجھے معلوم ہوگا کہ میں وہ سب کچھ بھول چکی ہوں جو میں نے طے کیا تھا۔ گو اس کے باوجود میں امید ترک نہیں کروں گی اور اپنے دہن سے ایک خفیف مسکراہٹ پیدا کرنے کی التجا ضرور کروں گی، جو، بہرحال، بے اثر ہی ثابت ہوگی۔

جب ٹیکسی ایک مکان کے دروازے کے سامنے رکی جہاں سرخ سنگی ستونوں پر دو شیر کھڑے تھے، تو میرا دل خوشی سے بھر گیا اور اندیشے میرے ذہن سے یک لخت محو ہو گئے۔ میں اس خیال پر مسرت سے مغلوب ہو گئی کہ امی ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہیں جہاں صدر دروازے پر دو شیر کھڑے ہیں۔ میں نے بہن کی آواز سنی جو شیر کے دہاڑنے کی نقل اتار رہی تھی، اور رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے پنجے پھیلا کر اشارے سے شیر کو گرفت میں لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا: یہ ہمیشہ پیچیدگی سے آزاد اور خوش طبع رہتی ہے۔ اس کی خوش دلی کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی، انتہائی نازک لمحوں میں بھی نہیں۔ وہ میرے سامنے تھی اور ہونے والی ملاقات کے بارے میں ذرہ بھر فکرمند نہیں تھی۔

لیکن جب امی نے دروازہ کھولا اور میری نظر ان پر پڑی تو میں نے خود کو بے صبر اور بے تاب پایا اور دوڑ کر بہن سے بھی پہلے ان سے لپٹ گئی۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور میرے بدن کے جوڑ اس آسائش سے اتنے دنوں تک محروم رہنے سے سُن ہو گئے تھے۔ میں نے ان کے بالوں کی مہک سونگھی جو ذرا بھی نہ بدلی تھی، اور مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ میں نے ان کی جدائی کو کس قدر محسوس کیا تھا اور، اس کے باوجود کہ ابا اور مریم ہمارا اتنا خیال رکھتے تھے، میں نے کس قدر چاہا تھا کہ وہ لوٹ آئیں اور ہمارے ساتھ رہنے

لگیں۔ امی کی اُس وقت کی مسکراہٹ میرے ذہن سے محو نہ ہوتی تھی جب، ان کی خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا لینے کی دھمکیوں کے بعد اور مولوی کی دخل اندازی پر، ابا انھیں طلاق دینے پر رضا مند ہو گئے تھے۔ میری تمام حسیں ان کی خوشبو کے اثر سے کُند ہو گئی تھیں جو میرے حافظے میں اچھی طرح محفوظ تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے ان کی جدائی کس قدر کھل رہی تھی، اس کے باوجود کہ جب وہ ہم دونوں کو بوسے دینے کے بعد، اپنے بھائی کے پیچھے تیز قدموں سے چلتی ہوئی، کار میں جا بیٹھی تھیں تو ہم دوبارہ گھر کے باہر گلی میں جا کر اپنے کھیل میں لگ گئے تھے۔ پھر جب رات آئی، اور ایک طویل عرصے بعد ہمیں امی کے ابا سے تکرار کرنے کی آواز سنائی نہ دی، تو ہمارے گھر پر امن اور سکون کی فضا چھا گئی جس میں صرف مریم کے رونے کے آواز مخل ہوتی تھی جو ابا کی رشتے دار تھی اور میری پیدائش کے وقت سے ہمارے ساتھ رہ رہی تھی۔

امی نے مسکراتے ہوئے مجھے خود سے جدا کیا تا کہ بہن کو لپٹا کر پیار کر سکیں، پھر وہ مریم سے بھی بغل گیر ہوئیں جو رونے لگی تھی۔ امی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور میں نے انھیں مریم کا شکریہ ادا کرتے سنا۔ انھوں نے آستین سے آنسو پونچھے اور مجھ پر اور بہن پر سر سے پاؤں تک نگاہ ڈالی اور کہا: ''اللہ انھیں اپنی امان میں رکھے، ودنوں کتنی جلدی بڑی ہو گئی ہیں۔'' انھوں نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور بہن نے ان کی کمر میں منھ چھپا لیا، اور جب ہمیں احساس ہوا کہ اس حالت میں چلنا ہمارے لیے دشوار ہے تو ہم سب ہنسنے لگے۔ اندر کے کمرے میں پہنچ کر مجھے یقین ہو گیا کہ امی کے نئے شوہر گھر میں موجود ہیں، کیوں کہ امی نے مسکرا کر کہا، ''محمود کو تم دونوں سے بہت محبت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ تمھارے ابا تمھیں میرے سپرد کر دیں تا کہ تم ان کے بچوں کی طرح ہمارے ساتھ رہ سکو۔'' بہن ہنسنے لگی اور جواب میں بولی، ''اس طرح ہمارے دو ابا ہو جائیں گے۔'' میں امی کے بازو پر ہاتھ رکھے ابھی تک گم شدگی کی کیفیت میں تھی، اور امی سے ملاقات کے لمحے میں اپنے بے ساختہ برتاؤ پر نازاں تھی؛ کس طرح میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی تھی، جو مجھے ناممکن معلوم ہوتا تھا، اور کیسے آنکھیں بند کر کے انھیں چومنے لگی تھی۔ مجھے بلا کوشش، بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ، اپنے آپ سے، شرم کے اس قید خانے سے، رہائی پا لینے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

امی کے شوہر گھر پر نہیں تھے۔ میری نظر فرش پر پڑی تو میں اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔ میں نے بے اعتباری کے عالم میں فرش پر بچھے ہوئے ایرانی قالین کو گھورا، پھر امی پر ایک طویل نظر ڈالی۔ میری نظر کی معنویت کو نہ سمجھتے ہوئے انھوں نے ایک الماری کھولی اور اس میں سے ایک کڑھی ہوئی قمیص نکال کر میری طرف اچھال دی۔ پھر وہ فرش عبور کر کے سنگھار میز کے پاس گئیں اور اس کی دراز میں سے ہاتھی دانت کی ایک کنگھی نکال کر، جس پر سرخ رنگ سے دل کی تصویر نقش کی ہوئی تھی، انھوں نے بہن کو دی۔ میں نے ایک بار پھر امی کی طرف دیکھا، اور اس بار انھوں نے میری نگاہ کو نازک تمنا کا اظہار سمجھا۔ اس لیے انھوں نے

مجھے بانہوں میں لے لیا اور بولیں، ''تم ہر روز آجایا کرو، تم جمعے کو پورے دن میرے گھر رہا کرو۔'' میں ساکت رہی۔ میری خواہش تھی کہ میں ان کے بازو اپنے گردن سے ہٹادوں اور اس گوری کلائی میں دانت گاڑ دوں۔ میں نے ملاقات کے لمحے کے مٹ جانے کی خواہش کی اور چاہا کہ وہ لمحے دوبارہ پیش آئیں تاکہ جب وہ دروازہ کھولیں تو میں وہی کروں جو مجھے کرنا چاہیے تھا — یعنی فرش پر نظر گاڑے بے حرکت کھڑی رہوں۔

اس ایرانی قالین کے رنگ اور خطوط میرے حافظے پر نقش تھے۔ میں اس پر لیٹ کر اپنا سبق یاد کیا کرتی تھی۔ میں اتنے قریب سے اس پر بنے ہوئے نقوش کو تکتی تھی کہ وہ مجھے سارے میں پھیلی ہوئی تربوز کی قاشیں معلوم ہونے لگتے تھے۔ مگر جب میں مسہری پر بیٹھ کر اسے دیکھتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ تربوز کی ہر قاش باریک دندانوں والی ایک کنگھی میں بدل گئی ہے۔ اس کے کناروں پر چاروں طرف بنے ہوئے پھولوں کے گچھے اُودے رنگ کے تھے۔ گرمیوں کے شروع میں امی اس پر اور دوسرے عام قالینوں پر کیڑے مار گولیاں ڈال دیتیں اور ان سب کو گول کر کے الماری کی چھت پر رکھ دیتیں۔ کمرہ خالی اور ویران نظر آنے لگتا، یہاں تک کہ خزاں آجاتی جب وہ قالینوں کو چھت پر لے جا کر پھیلا دیتیں۔ وہ کیڑے مار گولیاں چُنتیں جن میں سے اکثر گرمی اور نمی سے گھل چکی ہوتی تھیں، پھر چھوٹی جھاڑو سے ان کی صفائی کر کے وہ قالینوں کو چھت پر ہی چھوڑ دیتیں۔ شام کو وہ انھیں نیچے لا کر اپنی اپنی جگہ پر بچھا دیتیں۔ ان کے بچھنے سے کمرے میں دوبارہ جان پڑ جاتی اور میرا دل خوشی سے بھر جاتا۔ مگر یہ والا قالین کئی مہینے ہوئے، امی کی طلاق سے پہلے، گم ہو چکا تھا۔ اسے چھت پر دھوپ دینے کے لیے پھیلایا گیا تھا، اور سہ پہر کو امی چھت پر گئیں تو غائب تھا۔ انھوں نے ابا کو آواز دے کر بلایا تھا اور میں نے پہلی بار ابا کا چہرہ غصے سے سرخ دیکھا تھا۔ جب وہ دونوں چھت سے نیچے آئے تو امی طیش اور تعجب کے عالم میں تھیں۔ انھوں نے پڑوسیوں سے دریافت کیا جن میں سے ہر ایک نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے نہیں دیکھا۔ اچانک امی چلا کر بولیں، ''ایلیا!'' سب لوگ خاموش کھڑے رہ گئے: ابا، بہن اور پڑوسی ام فواد اور ابو سلمان، کسی کے منھ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ میں نے خود کو پکار کر کہتے ہوئے پایا: ''ایلیا؟ ایسی بات مت کہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔''

ایلیا ایک تقریباً نابینا شخص تھا جو محلے میں گھر گھر پھیری لگا کر بید کی کرسیوں کی مرمت کیا کرتا تھا۔ جب ہمارے گھر کی باری آتی تو میں اسکول سے واپسی پر اسے گھر کے باہر پتھر کی بنچ پر بیٹھا ہوا دیکھتی۔ اس کے سامنے بید کی لچھیوں کا ڈھیر پڑا ہوتا اور اس کے بال دھوپ میں چمک رہے ہوتے۔ وہ مہارت سے بید کے تار اٹھاتا اور وہ، مچھلیوں کی طرح تیرتے ہوئے، جال کے اندر پھسلتے جاتے۔ میں اسے بے حد مشاقی سے ان کی گول گول لچھیاں بناتے اور پھر ان کے سرے باہر نکالتے دیکھا کرتی، یہاں تک کہ وہ کرسی کی

گول نشست کو بُن کر پھر ویسا ہی درست کر دیتا جیسی وہ پہلے تھی۔ ہر چیز بالکل ہموار اور درست ہو جاتی: یوں لگتا جیسے اس کے ہاتھ مشین ہوں، اور میں اس کی انگلیوں کی پھرتی اور مہارت پر حیران رہ جاتی۔ جب وہ سر جھکائے مشغول بیٹھا ہوتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ اپنی آنکھوں سے کام لے رہا ہے۔ ایک بار مجھے شک ہوا کہ وہ اپنے سامنے دھندلی شکلوں سے کچھ زیادہ دیکھ سکتا ہے، اس لیے میں اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس کے لال گلابی چہرے پر نظر جما کر عینک کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھیں دیکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ ان آنکھوں میں ایک سفید لکیر تھی جو میرے دل میں چبھنے لگی اور میں جلدی سے بھاگ کر باورچی خانے میں چلی گئی جہاں مجھے میز پر ایک تھیلی میں کھجوریں پڑی ملیں اور میں نے ایک رکابی میں تھوڑی سی کھجوریں رکھ کر ایلیا کو دیں۔

میں نظر جمائے قالین کو گھورتی رہی اور سرخ چہرے اور سرخ بالوں والے ایلیا کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے اُبھر آئی۔ مجھے اس کے کسی کی مدد کے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہوئے، زینے کے ہتھے پر اس کا ہاتھ محسوس ہوا؛ پھر میں نے اسے کرسی پر بیٹھتے ہوئے محسوس کیا، اپنی اجرت طے کرتے ہوئے، پھر جیسے وہ کھانا کھا رہا ہو اور اسے خود بخود پتا چل جائے کہ رکابی خالی ہو گئی ہے، آبخورے سے پانی پیتے ہوئے جب پانی آسانی سے اس کے حلق میں اتر رہا ہو۔ ایک دو پہر کو، جب ابا کے سکھائے ہوئے طریقے سے، کہ کیسے کسی مسلمان کے گھر پر دستک دینے سے پہلے بلند آواز میں اللہ کا نام پکارنا چاہیے کہ مبادا امی بے پردہ ہوں، وہ ہمارے دروازے پر آیا تو امی تیزی سے بڑھیں اور اس سے قالین کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے جواب میں کچھ نہ کہا، بس ایک سسکی سی لی۔ واپس جاتے ہوئے اسے میز سے ٹھوکر لگی اور وہ پہلی مرتبہ الجھ کر گرا۔ میں اس کے پاس گئی اور ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ مجھے میرے ہاتھ کے لمس سے پہچان گیا ہو گا، کیوں کہ اس نے نیم سرگوشی میں مجھ سے کہا، ''کوئی بات نہیں، بچی۔'' پھر وہ جانے کے لیے مڑا۔ جب وہ جھک کر جوتے پہن رہا تھا تو مجھے خیال ہوا کہ میں نے اس کے رخساروں پر آنسو دیکھے ہیں۔ ابا نے اس سے یہ کہے بغیر اسے جانے نہ دیا کہ ''ایلیا! اگر تم سچ کہہ دو تو اللہ تمھیں معاف کر دے گا۔'' لیکن ایلیا جنگلے کا سہارا لیے چلتا گیا۔ ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیاں اترنے میں اس نے بہت وقت لگایا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ہم نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

علیفہ رفعت

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کلب میں ایک اور شام

وہ اضطراب کے عالم میں اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ پیش گوئی کرنے سے قاصر کہ اس کے واپس آنے کے بعد ان دونوں میں کیا معاملہ پیش آئے گا، وسیع و عریض چوبی دالان میں، جو دریا کے کنارے پر پھیلا ہوا تھا اور جس کے ستون کنارے کی زمین میں گڑے ہوئے تھے جن کے گرد گھاس پھوس اگ آئی تھی، وہ جھولا کرسی میں بیٹھی اپنے جسم کو آگے پیچھے حرکت دے رہی تھی۔ گویا اپنے اندیشوں کو جھٹکنے کے لیے، اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ باغ کے کٹہرے تک پھیلے ہوئے یوکلپٹس کے پیڑوں کے ہیولے اس کی نظر کے سامنے ہوا میں لہرا رہے تھے اور ان کی اونچی شاخوں پر بیٹھے ہوئے سفید پرندے ان کی باریک پتیوں کے درمیان بڑے بڑے سفید پھولوں جیسے لگ رہے تھے۔

مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے سے پتلا سا چاند طلوع ہوا اور اس کی مدھم روشنی میں جو، دریا پار، منفلوط کے مکانوں سے آتی ہوئی روشنی میں گھل مل گئی تھی، دریا کی دھیمی سانسیں لیتی ہوئی سطح جھلملانے لگی۔ شہر کے آخری سرے پر واقع کلب کے باغ میں پیڑوں پر لگے ہوئے رنگین قمقمے اردگرد کے تاریک پس منظر میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اسی عمارت میں کہیں اس کا شوہر اس وقت غالباً شطرنج کی بازی میں محو بیٹھا تھا۔

یہ صرف چند سال پہلے کی بات تھی جب اس نے اپنے باپ کے گھر میں اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا اور اس کی نظر سے نظر ملائی تھی جو اس کے حسن کو تول کر گویا دام لگانے سے پہلے اس کی ارزش کا اندازہ لگا رہی تھی۔ جب اس نے ان جاپانی پیالیوں میں جو اہم مہمانوں کی تواضع کے واسطے الماری میں مقفل رکھی جاتی تھیں، اسے قہوہ پیش کیا تو اس کی نگاہوں کو اپنے بدن پر محسوس کیا تھا۔ اس کی ماں نے یہ پیالیاں چاندی

کے کام والی کشتی میں بیحد نفیس کڑھائی کی پوشش بچھا کر اپنے ہاتھ سے سجائی تھیں۔ جب دونوں مرد قہوہ ختم کر چکے، تو اس کے باپ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور اسے بیٹھنے کو کہا تھا، اور وہ ان کے سامنے والے صوفے پر گھٹنوں کو اپنے لباس کے دامن سے ڈھانپ کر بیٹھ گئی تھی اور چور نظروں سے اس شخص کو دیکھتی رہی تھی جو شاید اسے اپنی بیوی کے طور پر منتخب کرنے والا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ دراز قد، جسم کا مضبوط اور کلین شیو تھا۔ اس کا انگلش ٹوِیڈ کا عمدہ سلا ہوا کوٹ، ریشمی قمیص اور طلائی کف لنک خاص طور پر اس کی نظر میں آئے۔ جب اس نے جواباً اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اپنے چہرے پر سرخی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ پھر وہ اس کے باپ کی طرف مڑا اور اپنا سنہری سگریٹ کیس نکال کر اسے سگریٹ پیش کیا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے جناب،'' یہ کہہ کر اس کے باپ نے احتراماً اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے ایک سگریٹ لے لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماچس تلاش کر پائے، عبود بے اپنا لائٹر نکال چکا تھا۔

''نہیں جناب، پہلے آپ،'' اس کا باپ شرمندہ ہوکر بولا۔ وہ بیک وقت اس شخص کے دنیاوی خود اعتمادی کے انداز سے مسحور اور اپنے باپ کے بے ڈھنگے پن پر محجوب تھی۔

اس کے باپ کا سگریٹ سلگانے کے بعد عبود بے نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی، ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور اپنے لیے سگریٹ نکالا۔ اسے اپنے ہونٹوں کے کونے میں دبا کر سلگانے سے پہلے اس نے سگریٹ کے سرے کو کیس کے ڈھکنے پر آہستہ سے دو ایک بار ٹھونکا، پھر منھ سے دھویں کے چھلے برآمد کیے جو کمرے کی ہوا میں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگے۔

''یہ ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے، میرے بیٹے،'' اس کا باپ مسکرا کر پہلے عبود بے کی اور پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، جس پر عبود بے نے بھی اس پر نظر ڈالی اور پوچھا:

''اور حسین دوشیزہ ابھی ثانوی اسکول میں ہے؟''

اس نے انکسار سے سر جھکا لیا تھا اور اس کے باپ نے جواب دیا تھا:

''آج کے بعد یہ گھر پر رہ کر خود کو آپ کے ساتھ پرمسرت زندگی گذارنے کے لیے تیار کرے گی، انشاءاللہ،'' اور وہ اپنے باپ کی آنکھ کے اشارے پر اٹھ کر باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی۔

''تمھاری خوش نصیبی ہے،'' اس کی ماں نے اسے بتایا تھا۔ ''ایسا بر کہاں ملتا ہے۔ کوئی بھی لڑکی اسے پا کر خوش ہوگی۔ عمر چالیس سال بھی نہیں ہے، اور آب پاشی کا انسپکٹر ہے۔ اچھی تنخواہ ہے اور جہاں تعیناتی ہوتی ہے وہاں رہنے کے لیے فرنیچر سمیت سرکاری مکان ملتا ہے؛ اس سے ہم مکان دینے کے خرچ سے بھی بچ جائیں گے — اور ہمارے جو حالات ہیں وہ تمھیں معلوم ہی ہیں — اور یہ اسکندریہ میں اس کے ذاتی

مکان کے علاوہ ہے جہاں تم چھٹیاں گذارا کرو گی۔"

سمیعہ کو اس بات پر تعجب تھا کہ ایسا شاندار بر اس کے دروازے پر کیسے چلا آیا۔ اسے کس نے بتایا کہ اپیل کورٹ کے ایک معمولی کلرک محمود برکات کے ہاں ایک خوب صورت اور خوب سیرت بیٹی ہے؟

پھر دن قاہرہ کی دکانوں کے چکر کاٹنے اور آنے والی پُرآسائش زندگی کے لیے لباسوں کے انتخاب میں گذرنے لگے۔ یہ سب اس طرح ممکن ہوا کہ اس کے باپ نے اپنی سرکاری پنشن میں سے کچھ رقم قرض لے لی۔ دوسری طرف عبود بے کبھی اس کے گھر تحفے کے بغیر نہ آیا۔ شادی سے چند روز پہلے، اس کی سالگرہ پر، وہ شارعِ قصرالنیل کی ایک مشہور دکان کے نام سے مزین مخملیں ڈبے میں اس کے لیے زمرد کی انگوٹھی لایا۔ عروس کی رات کو اس کی کلائی پر ہیرے کا دست بند باندھتے ہوئے اس نے یاد دہانی کرائی کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی ہے جسے ترقی کی راہ پر بہت آگے جانا ہے اور یہ کہ زندگی کی اہم ترین چیزوں میں سے ایک چیز دوسروں، خصوصاً ہم رتبہ اور اعلیٰ تر لوگوں کی رائے ہے۔ اگرچہ اس کا سن ابھی بہت کم ہے، پھر بھی اسے مناسب اور پروقار انداز اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

"لوگوں سے کہنا کہ تمھارا تعلق مشہور برکات خاندان سے ہے اور تمھارے والد جج تھے،" یہ کہہ کر اس نے قریب آ کر اس کے گالوں کو باپ کی سی شفقت اور ملائمت سے تھپتھپایا تھا، یہ اس کا مخصوص انداز تھا جسے وہ ان دونوں کی مشترک زندگی کے آنے والے دنوں میں بار بار دہرانے والا تھا۔

کل شام وہ بیئر کی بوتل کے اثر سے کچھ مدہوش سی کلب سے لوٹی تھی، جو اسے کسی کی سالگرہ کی خوشی میں پینی پڑی تھی۔ اس کا شوہر اس کی کیفیت کا اندازہ کر کے اسے جلد ہی گھر لے آیا تھا۔ اس نے کپڑے اتار کر نائٹ گاؤن پہن لیا تھا اور زیور سنگھار میز پر پڑے چھوڑ کر بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گئی تھی۔ اگلی صبح وہ دن چڑھے تک سوتی رہی تھی، پھر جاگنے پر اس نے معمول کے مطابق گھنٹی بجا کر اپنے لیے ناشتہ طلب کیا تھا۔ ناشتے کے بعد زیوروں کو لکڑی اور سیپی کے بنے ہوئے ڈبوں میں رکھتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی زمرد کی انگوٹھی غائب ہے۔

کیا انگوٹھی کلب میں اس کی انگلی سے گر پڑی؟ یا واپسی پر کار میں؟ نہیں، اسے رات کو سونے سے پہلے انگوٹھی اتارنا اچھی طرح یاد تھا؛ اسے یاد تھا کہ ہمیشہ کی طرح اسے انگوٹھی اتارنے میں دقت ہوئی تھی۔ اس نے بستر کی چادریں اتار دیں، گدے کو الٹ دیا، تکیہ غلافوں کو جھاڑا، گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل مسہری کے نیچے گھس کر دیکھا۔ پھر اسے سرہانے کی میز پر ناشتے کی کشتی دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس نوعمر ملازمہ کا خیال آیا جو اسے لے کر صبح کمرے میں داخل ہوئی تھی، اسے کشتی کے رکھے جانے کی جھنکار، پردوں کا کھولا جانا اور کشتی کا پھر اٹھا کر سرہانے کی میز پر رکھا جانا یاد آیا۔ کمرے میں اس ملازمہ کے سوا کوئی داخل

نہیں ہوا تھا۔ کیا اسے اس کو بلا کر پوچھ گچھ کرنی چاہیے؟

بالآخر، اسپرین کی دو گولیاں کھا کر، اس نے شوہر کے کام پر سے واپس آنے تک کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیسے ہی وہ دفتر سے لوٹا تھا اس نے سارا قصہ کہہ سنایا تھا، اور اس نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنے برابر میں بٹھالیا تھا:

''چلو اب سکون سے مجھے پورا واقعہ تفصیل سے سناؤ۔''

اس نے پوری بات، اس بار زیادہ تفصیل کے ساتھ، دہرائی تھی۔

''تم نے اسے تلاش کیا؟''

''ہر جگہ۔ خواب گاہ اور غسل خانے کے کونے کونے میں، ہر ممکن اور غیر ممکن جگہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کو سونے سے پہلے میں نے انگوٹھی اتاری تھی۔''

گذشتہ رات کا خیال آنے پر وہ مسکرا اٹھا، پھر بولا:

''جازیہ کے ناشتہ لانے کے بعد سے کوئی کمرے میں آیا؟''

''کوئی نہیں۔ میں نے جازیہ کو آج کمرے کی صفائی کرنے سے بھی منع کر دیا۔''

''تم نے اس سے ذکر تو نہیں کیا؟''

''نہیں۔ میں نے سوچا معاملہ آپ پر چھوڑ دوں۔''

''بہت اچھا کیا۔ اب جا کر اس سے کہو کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اسے کچھ بتانا مت، لیکن جب میں اس سے بات کروں تو یہیں موجود رہنا۔''

پانچ منٹ بعد نوعمر جازیہ، جسے انھوں نے حال ہی میں ملازم رکھا تھا، اپنی مالکن کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ سمیعہ گذر کر کمرے کے کونے میں چلی گئی اور جازیہ سینے پر ہاتھ باندھے، آنکھیں جھکائے عبود بے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''حضور؟''

''انگوٹھی کہاں ہے؟''

''کون سی انگوٹھی حضور؟''

''اداکاری مت کرو جیسے تمھیں پتا ہی نہیں۔ سبز نگینے والی انگوٹھی۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ انگوٹھی چپ چاپ واپس کر دو؛ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

''اگر میں نے دیکھی بھی ہو تو اللہ کرے میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اچانک اس کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ لڑکی تیورا کر پیچھے کو ہوئی، اس نے ہاتھ گال پر رکھ لیا، پھر اس نے دوبارہ سینے پر ہاتھ باندھ لیے، اور عبود بے کے سوالوں کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ آخر وہ بولا:

''تمھارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ ہیں، بتا دو کہ تم نے انگوٹھی کہاں چھپائی ہے، ورنہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ بہت برا ہوگا۔''

اس نے گھڑی دیکھنے کے لیے اپنی کلائی اٹھائی تو لڑکی ڈر کر پیچھے کو ہٹی، مگر اس کی خاموشی قائم رہی۔ جب وہ ٹیلیفون کی طرف بڑھا تو سمیعہ نے سر اٹھا کر دیکھا کہ لڑکی کے گال آنسوؤں سے تر ہیں۔ عبود بے نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا نمبر ملایا اور اسے مختصراً پوری بات بتائی۔

''ظاہر ہے میرے پاس ثبوت تو کوئی نہیں ہے لیکن صبح سے اَور کسی نے کمرے میں قدم نہیں رکھا، اس لیے ضرور اسی نے لی ہوگی۔ بہرحال میں نے معاملہ آپ کے دانشمند ہاتھوں کو سونپ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں آپ کے آدمیوں کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔''

ایک دن بعد، آج تیسرے پہر وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے زیوروں کو ڈبے میں ترتیب سے رکھ رہی تھی کہ ایک بندا اس کے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گر پڑا۔ جب وہ اسے اٹھانے کو جھکی تو اسے زمرد کی انگوٹھی سنگھار میز اور دیوار کے بیچ میں اٹکی ہوئی دکھائی دی۔ اُس لمحے سے اب تک وہ ایک اضطراب کے عالم میں بیٹھی اپنے شوہر کے کلب سے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک بار تو اسے یہ ترغیب بھی ہوئی کہ دریا کے کنارے جا کر انگوٹھی کو پانی میں اچھال دے تاکہ اس ناخوشگواری سے بچ سکے جو آنے والی تھی۔

مکان کے گرد گھوم کر گیراج میں آتی ہوئی گاڑی کے ٹائروں کی آواز سن کر اس نے انگوٹھی جلدی سے اپنی انگلی میں چڑھا لی۔ جیسے ہی وہ داخل ہوا، اس نے کھڑے ہو کر اسے انگوٹھی دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ جلدی جلدی، کہنے کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرتے ہوے اور پھر بھی جانتے ہوے کہ وہ بے ڈھنگے پن سے بات کر رہی ہے، اس نے اس غیر معمولی اتفاق کی وضاحت کی کہ کس طرح بندے کے فرش پر گرنے کی وجہ سے اسے انگوٹھی دکھائی دے گئی، اور کس طرح اسے خیال آیا تھا کہ کلب میں ٹیلیفون کر کے اسے خوشخبری سنائے مگر...

اس نے شوہر کی چڑھی ہوئی تیوری کو دیکھ کر اپنی بات بیچ ہی میں روک دی، اور جلدی سے کہا، ''مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ ہوا کیسے۔ اب کیا کریں گے؟''

اس نے گویا حیرت کے انداز میں کندھے اچکائے۔

''تم مجھ سے پوچھ رہی ہو، جانِ من؟ ظاہر ہے، کچھ بھی نہیں کریں گے۔''

''لیکن وہ اس بے چاری لڑکی کی پٹائی کر رہے ہوں گے۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا وہ اعتراف کرائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔''

کسی عجلت کے بغیر وہ یوں بیٹھ گیا جیسے معاملے کے اس نئے پہلو پر غور کر رہا ہو۔ اپنا سگریٹ کیس نکال کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کو اس کے ڈھکنے پر ٹھونکا، زبان پھر کر ہونٹ تر کیے، سگریٹ کو ہونٹوں میں دبایا اور سلگایا۔ دھویں کے چھلے ٹھہری ہوئی ہوا میں تیرنے لگے اور وہ اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا:

''بہر حال، اب وہ اور کتنی دیر اسے وہاں رکھ سکتے ہیں؟ اگر وہ اعتراف نہ کرے یا کوئی شہادت نہ ملے تو اسے اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ تو رکھا نہیں جا سکتا۔ تھوڑی دیر اور وہاں رہ لینے سے اسے موت نہیں آ جائے گی۔ اب تک سارا شہر جان چکا ہے کہ انگوٹھی ملازمہ نے چرائی ہے — یا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ جا کر سب لوگوں کو بتاؤں کہ بیگم صاحبہ بیئر کے دو گھونٹ پی کر ایسی مدہوش ہو گئی تھیں کہ انگوٹھی خود بخود ان کی انگلی سے اتر کر سنگھار میز کے پیچھے جا چھپی؟ کیا خیال ہے تمھارا؟''

''میں جانتی ہوں کہ بات ذرا شرمندگی کی ہے مگر...''

''ذرا شرمندگی کی؟ انتہائی مضحکہ خیز بات ہے۔ سنو، اب سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ تم یہ انگوٹھی مجھے دے دو اور میں جب اگلی بار قاہرہ جاؤں تو اسے بیچ کر اس کی جگہ کچھ اور لے آؤں۔ ورنہ سارے شہر میں ہمارا مذاق بن جائے گا۔''

عبودے نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور اس نے خود کو انگوٹھی اتار کر اس پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پایا۔ وہ احتیاط کر رہی تھی کہ ان کی نظریں نہ ملنے پائیں۔ ایک لمحے کو اس میں احتجاج کی لہر سی اٹھی، بلکہ اس نے کچھ لفظ بھی منھ سے نکالے:

''مگر میں کہتی ہوں ہمیں...''

انگوٹھی جیب میں رکھتے ہوئے وہ اس پر جھکا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے گال نرمی سے تھپتھپائے۔ وہ اس انداز کی عرصے سے عادی ہو چکی تھی، اس سے اسے تحفظ کے جاری رہنے کی تسلی ہوتی تھی، اسے احساس ہوتا تھا کہ اس آدمی نے جو اس کا شوہر ہے اور اس کے بچے کا باپ ہے، اس کی زندگی میں اس کے باپ کی جگہ لے لی ہے جو، گویا اپنی ذمے داری ایک موزوں شخص کو سونپنے کے اطمینان میں، شادی کے کچھ ہی دنوں بعد چل بسا تھا۔ یہ لمس اسے لفظوں سے کہیں زیادہ بلاغت سے یہ احساس دلاتا تھا کہ یہ شخص مرد ہے اور وہ عورت؛ اس شخص کا منصب ذمے داریاں اٹھانا اور فیصلے کرنا ہے، اور اس کا کام صرف خوب صورت،

مسرور اور بے فکر رہنا ہے۔ مگر اب، ان دونوں کی ساتھ گذاری ہوئی زندگی میں پہلی بار اسے یہ لمس اپنے چہرے پر ایک طمانچے کی طرح لگا۔

جوں ہی اس کے ہاتھ ہٹے، سمیعہ کا پورا بدن ایک بے اختیار لرزے کی زد میں آ گیا۔ اس خوف سے کہ کہیں اسے پتا نہ چل جائے، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی بڑی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے پیشانی آرام دہ، سرد سطح سے ٹکالی اور کئی سیکنڈ تک آنکھیں بند رکھیں۔ جب اس نے آنکھیں دوبارہ کھولیں تو دیکھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر پیڑوں پر لگی ہوئی قہوہ خانے کی بتیاں روشن ہو چکی ہیں اور ان کے نیچے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک ویٹر میزوں کے درمیان آ جا رہا ہے۔ ایک گذرتی ہوئی کشتی کے تاریک ہیولے نے ذرا دیر کے لیے قہوہ خانے کے منظر کو ڈھانپ لیا؛ اس کے سامنے والے حصے میں نصب لیمپ کی روشنی میں اس نے کشتی کو نیل کی سطح پر تیرتے نیلوفر کے بے جڑ کے پھولوں سے بنے ہوئے کئی جزیروں کو کاٹ کر آگے بڑھتے دیکھا جنھیں لہریں اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔

اچانک اسے اپنے برابر میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"جب تک میں گاڑی باہر نکالوں، کیوں نہ تم جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ؟ آج ہوا گرم ہے، رات کا کھانا کلب میں کھایا جائے۔"

"کیوں نہیں؟ جیسا آپ کہیں۔"

جب وہ کھڑکی کے پاس سے مڑی تو مسکرانے لگی تھی۔

بہا طاہر

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

ایک ہوشمند جوان آدمی کی نصیحت

جب وہ رادیو سنیما کے پاس سے شارعِ طلعت حرب کو پار کر رہا تھا، بوڑھا اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے چلا کر اسے پکارا، ''عادل بے!'' اس نے ایک کار کے اچانک روکے جانے پر ٹائروں کے سڑک پر چرچرانے کی تیز آواز سنی؛ پھر ڈرائیور زور زور سے بوڑھے کو برا بھلا کہنے لگا، جس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، اور لپک کر اپنے دوست کو پیادہ رو تک پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا اور اپنی پتلی، دبوچتی ہوئی انگلیوں سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں کچھ بولے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے؛ پھر عادل نے اپنے بازو پر سے اس کا ہاتھ جھٹک کر الگ کر دیا اور اس سے پوچھا، ''کیا چاہتے ہو تم؟''

بوڑھا بولا، ''یہ میں ہوں، عادل بے، میں۔ کیا میں آپ کو یاد نہیں؟ آپ مجھ سے ہر روز 'الاہرام' خریدا کرتے تھے اور ہر ہفتے 'الکواکب'۔ میں آپ کی گلی کے کونے پر کھڑا ہوتا تھا۔ میں خلیل ہوں۔ آپ کا عمو خلیل۔''

''ہاں،'' عادل نے کہا، ''اور تم... کیا تمھیں یاد نہیں؟ ہم اکثر ملتے رہے ہیں۔ ایک ہفتے پہلے بھی ہماری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمھیں کچھ نصیحت کی تھی۔ تمھیں یاد نہیں؟''

وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا، اور عمو خلیل اس کے پیچھے پیچھے، اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر، تاکہ بات کرتے ہوئے اس کا بازو چھو سکے۔ ''آہ! جنابِ عالی، مجھے یاد ہے۔ مگر شاید آپ کو معلوم نہیں — الحمدللہ، میں بدل چکا ہوں۔ آپ میری بات تو سنیے۔ میں بالکل بدل چکا ہوں۔ واللہ، واللہ، اب میرا افیون سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے اور اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ خدا اس بدبخت چیز کو جہنم نصیب کرے!''

عادل پھر رک گیا اور چمکتی ہوئی آنکھوں والا بوڑھا اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چھوٹے چھوٹے قطرے بہنے لگے جن کا اسے کوئی احساس نہ ہوا، اور وہ مستقل اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔

''یہ تو تم نے مجھے پچھلی بار بھی بتایا تھا،'' عادل بولا۔ ''تم نے کہا تھا کہ تم نے افیون چھوڑ دی ہے اور کام کرنا چاہتے ہو۔ پھر تم نے کام شروع کیوں نہیں کیا؟'' عمو خلیل نے سر جھکا لیا؛ اس کے چھدرے ہوتے ہوئے بالوں کے ساتھ، اور سیاہ گرد سے چمکتی ہوئی بھوری جیکٹ کے چوڑے کندھوں کے درمیان، اس کا سر بہت چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور کہا، ''حاج کی صحت کیسی ہے؟ اور آپ کے والد محترم؟ وہ خیریت سے ہیں؟''

عادل ذرا سا ہنسا اور بولا، ''خیریت سے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ پھر چل پڑا اور بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا: ''دونوں بہت نفیس صاحبان ہیں۔''

بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ کمزور آواز میں بولا، ''آپ کو سچ سچ بتاؤں جناب عالی، آج کل میرا علاج چل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے میرے پھیپھڑوں کو تباہ کر دیا ہے، اللہ اس بدبخت پر لعنت کرے اور اُس دن پر بھی جب میں نے اسے منھ لگایا۔ حقیقت یہ ہے جناب عالی، کہ آپ کو خبر نہیں۔ آپ کو اُن دنوں کا عمو خلیل یاد ہے؟ واللہ جناب، اس زمانے میں اپنے کام اور اپنے گھر کے سوا میرا کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اپنے لیے قہوے کا ایک فنجان خریدنے پر بھی میرا دل دکھتا تھا، میں خود سے کہتا کہ یہ ایک پیاستر بھی گھر پر خرچ ہو تو بہتر ہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کے ورغلانے پر شروع ہوا۔ انھوں نے مجھے یہ کہہ کر بے وقوف بنایا کہ افیون گٹھیا میں فائدہ کرتی ہے، اور مجھے اس کی لت لگ گئی اور سب کچھ برباد ہو گیا۔ مجھے اپنے گھر اور بچوں کی بھی فکر کھائے جا رہی ہے۔ پانچ بچے اور ان کی ماں، اور ایک پیسے کا آسرا نہیں۔ یہ آپ کے عمو خلیل پر بہت بڑا بوجھ ہے۔ جناب عالی، ایسی حالت میں آدمی کچھ کرنے کے قابل کہاں رہتا ہے۔ مگر جناب، الحمدللہ، جیسے ہی میرے پھیپھڑوں کا علاج پورا ہوا، اللہ کی مدد سے میں اپنے کام پر واپس آ جاؤں گا۔ مجھ پر مہربانی کیجیے، میں آپ کے پیسے لوٹا دوں گا، جیسے ہی... جیسے ہی...''

وہ اچانک رکا، پھر اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا، اس نے منھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ عادل کے قدم ڈھیلے پڑ گئے، اس نے سر تھوڑا سا پھیر کر بوڑھے کو دیکھا جو کھانسی کے حملے سے مغلوب، ہجوم میں نظروں سے تقریباً اوجھل کھڑا تھا۔ پھر وہ تیزی سے لپک کر عادل کے دور جانے سے پہلے دوبارہ اس کے پاس پہنچ گیا اور کھانسی سے بار بار ٹوٹتی، بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

''نہیں، میں پھیپھڑوں کا علاج پورا ہونے سے پہلے کام کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ للہ میری

تھوڑی سی مدد کر دیجیے، میں آپ کے پیسے لوٹا دوں گا۔''

عادل اس کی طرف رخ کیے بغیر آہستہ سے بولا، ''تم جھوٹ بول رہے ہو، عمو خلیل۔ تمھیں کوئی پھیپھڑوں کا علاج ولاج نہیں کرانا۔ تمھیں صرف اپنی لت پوری کرنی ہے۔ میں نے تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے؟ پچھلی بار میں نے تمھیں دس پیاسترد یے تھے یا نہیں؟ تم نے کیا کیا ان کا؟ افیون پر لگا دیے نا؟''

''دس پیاستر؟'' بوڑھے نے احتجاج کیا، ''واللہ، عادل بے، دس پیاستر میں تو... جناب عالی، میں آپ کو بتا چکا ہوں، افیون کا قصہ ختم ہو چکا... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ افیون کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... اگر حضور میرے ساتھ چلنے کی زحمت کریں...''

جوان آدمی سڑک پر چلتے چلتے رک گیا اور مضبوط، بے صبر لہجے میں بولا، ''دیکھو، میں تم سے صرف ایک بات کہتا ہوں: تمھیں اپنا علاج کرانا ہوگا۔ اسپتال جاؤ تا کہ تمھارا علاج ہو سکے۔ اگر تمھیں کسی بااثر شخص کا حوالہ چاہیے تو میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے، میں اس سے کہوں گا کہ وہ...'' بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر پھر عادل کا بازو پکڑ لیا۔

''چلیے،'' وہ تیزی سے بولا، ''ابھی۔ میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اللہ آپ پر مہربان ہو۔ مجھے ابھی اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس لے چلیے۔''

عادل تذبذب کے عالم میں بوڑھے کو دیکھنے لگا جو اس کا بازو پکڑے کھڑا کانپ رہا تھا، اور سوچنے لگا کہ اس سے کیا کہے۔ مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے بوڑھا کہنے لگا، ''مگر عادل بے، ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے میں اپنے بچوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے بچوں کو دیکھنا ہوگا، ان کا کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ وہ بالکل بے آسرا ہیں، جناب عالی۔ میں اسپتال چلا گیا تو انھیں کون سنبھالے گا؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ میری اس بات کو معاف کیجیے گا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان کی ماں عصمت فروشی کر کے ان کا پیٹ پالے؟ کیا آپ کو اس سے خوشی ہوگی، عادل بے؟ کیا آپ کو خوشی ہوگی؟ میں... دراصل میں نے آپ کو بتایا نہیں... میں اسپتال نہیں گیا تھا۔ میں نے خود اپنا علاج کیا، اور الحمدللہ، میں اب ٹھیک ہوں۔ اب صرف پھیپھڑوں کا اور کھانسی کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس صرف اس لیے جانا چاہتا ہوں کہ وہ میرے پھیپھڑوں کا معائنہ کر لے، یعنی ایکسرے وغیرہ۔ مجھ پر تھوڑی سی مہربانی کر دیجیے، عادل بے۔ صرف ڈاکٹر کی فیس...''

وہ دونوں سڑک کے ایک پُر ہجوم حصے میں میامی سینما کے سامنے کھڑے تھے، اور لوگ انھیں دھکیل کر راستہ بناتے ہوئے گذر رہے تھے۔ عادل نے خود کو سینما میں دکھائی جانے والی فلم کی تشہیر کے واسطے لگائی ہوئی تصویروں کے بالکل سامنے پایا، اور اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ دیر سے فلم کی خوب صورت ہیروئن کی

تصویر کو گھور رہا ہے جس میں اسے بے ترتیب بالوں اور اوپر کو اٹھی ہوئی ران پر سے سرکے ہوئے لباس کے ساتھ بستر پر نیم دراز حالت میں دکھایا گیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے عمو خلیل کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی اس نے جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑایا اور بولا:

''مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔''

جب وہ یہ کہہ کر آگے بڑھا تو بوڑھے نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کسی ایسے شخص کی طرح سر ہلایا جس پر کسی بات کا انکشاف ہو گیا ہو۔ وہ بولا، ''میں سمجھتا ہوں، عادل بے۔ آپ میرے بارے میں فکر مند ہیں۔ آپ کو اپنے عمو خلیل کی طرف سے تشویش ہے، مگر، جیسا کہ میں نے کہا، الحمدللہ، میں نے کام ڈھونڈ لیا ہے۔ میں اخباروں کا کھوکھا لگاؤں گا، اپنے پرانے کام پر واپس چلا جاؤں گا۔ اللہ نے چاہا تو پہلے سے بھی بہتر ہو جاؤں گا۔'' پھر اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا، ''مجھے صاف صاف بات کرنی چاہیے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں۔ میری تھوڑی سی مدد کر دیجیے۔ صرف اتنا جس سے بچوں کی خوراک کا انتظام ہو سکے۔''

''تمھیں بچوں سے کیا غرض؟'' عادل طیش میں آ کر بولا، ''تمھیں صرف اپنے بدبخت نشے سے مطلب ہے۔''

''نشے باز بھی آخر انسان ہوتا ہے،'' بوڑھا بولا ''جناب عالی، مجھے بھی اپنے بچوں سے محبت ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،'' عادل نے کہا۔ ''جو شخص اپنے کام اور اپنے گھر کو چھوڑ دے، صرف اس لیے کہ... میں نے تمھیں کتنی بار بتایا ہے؟ مجھے دیکھو۔ میں انجینئر ہوں۔ دن رات کام کرتا ہوں، دن میں سرکاری ملازمت اور رات کو ایک کمپنی میں۔ پیسہ کمانے کے لیے خود کو ہلاک کیے لے رہا ہوں۔ کیوں؟ کیا میں نے اپنے لیے گاڑی خریدی تاکہ بسوں میں آنے جانے کی دقت سے بچ سکوں؟ ہرگز نہیں۔ اپنا کمایا ہوا ایک ایک پیسہ بچا کر رکھ لیتا ہوں تاکہ میرے بیٹے کا مستقبل محفوظ ہو سکے۔ ابھی وہ نرسری اسکول میں ہے لیکن آدمی کو مستقبل کی فکر کرنی ہی پڑتی ہے، عمو خلیل۔ کسے پتا کتنے بچے اَور ہوں گے؟ پہلے آدمی کو مستقبل کا بندوبست کرنا چاہیے، پھر اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ تم نصیحت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے، عمو خلیل؟ اَور لوگوں کو دیکھو۔ خود مجھے دیکھو۔''

بوڑھا اس کی باتیں سنتے ہوئے رضامندی سے سر ہلائے جا رہا تھا، مگر اس کی آنکھیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں اور ظاہر کر رہی تھیں کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے ذرا بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا۔ جب عادل خاموش ہوا تو اس نے کہا، ''بالکل درست ہے، جناب۔ الحمدللہ۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، اللہ کے فضل سے اب میں صحت یاب ہو چکا ہوں۔'' پھر اس نے اچانک ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ ''آپ اتنے سے تھے

جب مجھ سے اپنے ابا کے لیے اخبار لینے آیا کرتے تھے۔ 'عمو خلیل، الاہرام!' یاد ہے؟'' اس نے ایک بار پھر رک کر عادل کا بازو پکڑ لیا۔

''مجھ پر ترس کھائیے، عادل بے، میں آپ کا ہاتھ چومتا ہوں۔''

انجینئر نے تیزی سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ''یہ باتیں بہت ہو چکیں۔'' پھر وہ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے لپکتا اور کہتا رہا، ''تھوڑی سی مدد عادل بے، کچھ بھی...''

''ہوش کی دوا کرو اور اپنے بچوں کے پاس جاؤ۔''

''میں ہوش سے کام لوں گا، عادل بے۔ واللہ، جو آپ کہیں گے وہی کروں گا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے بچوں کو نرسری اسکول میں داخل کراؤں، ہے نا؟ کراؤں گا، ضرور کراؤں گا، مگر اس وقت مجھے تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے، میں...''

بوڑھے نے پھر ہاتھ بڑھایا اور عادل کا کندھا پکڑ کر تقریباً زبردستی اسے روک لیا۔ پھر وہ اپنا چہرہ اس کے بالکل سامنے لے آیا: اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور چہرے کی نسیں بار بار پھڑک رہی تھیں۔

''سنیے،'' وہ سرگوشی میں بولا، ''ڈھونگ رچانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کو اپنے عمو خلیل سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جوان ہیں اور میں آپ کے کام آنا چاہتا ہوں۔ کچھ مت کہیے، فقط میری بات سنیے۔ آپس کی بات ہے، میں ایک عورت کو جانتا ہوں جو بے حد حسین ہے۔ نہیں نہیں، بولنے کی ضرورت نہیں۔ آخر جوانی ایک ہی بار ملتی ہے، اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ میں سچ کہتا ہوں... بے حد حسین۔ مجھے صرف جا کر اسے آپ کے پاس لانا ہوگا۔ کچھ مت کہیے، آپ کا عمو خلیل آپ کے کام آنا چاہتا ہے۔''

''پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' عادل نے کہا۔

''میری بات سنیے،'' بوڑھا بولا، ''میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ ہمیشہ زندگی سے لطف اندوز ہونے کے قائل رہے ہیں۔ میں نے بارہا آپ کو مختلف لڑکیوں کے ساتھ دیکھا ہے اور کبھی اپنے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ دیکھیے، آپ کے عمو خلیل کی زبان ہمیشہ بند رہتی ہے۔ کچھ مت کہیے۔''

بوڑھے نے اپنے منہ پر انگلی رکھ لیا، پھر ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھیں، اگرچہ اس کے پچکے ہوئے رخسار پہلے کی طرح گیلے رہے۔ دھیمی آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے وہ دبی دبی کھوکھلی ہنسی ہنستا رہا۔

''میں کبھی اپنی زبان نہیں کھولتا، کیونکہ مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو راز کو راز رکھنا جانتے ہیں۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا، فقط ٹیکسی کا کرایہ، مجھے بس جا کر اسے آپ کے پاس لانا ہوگا۔ آپ نے اپنے عمو خلیل سے تسلی کا ایک لفظ بھی نہیں کہا، مگر کوئی بات نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ میرے بیٹوں کی طرح ہیں... دنیا

میں کسی اور شخص کے لیے میں یہ کام نہیں کروں گا، لیکن اگر آپ اپنے عمو خلیل کی مدد کرنا چاہیں... دیکھیے، میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا، فقط ٹیکسی کا کرایہ۔ سنیے، اگر آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں تو میرا شناختی کارڈ رکھ لیجیے۔''

وہ کپکپاتے ہوے ہاتھوں سے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیبیں ٹٹولنے لگا اور اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو بہنے لگے۔

''تم اتنا گر چکے ہو؟'' انجینئر بولا۔ ''اس سے تو بہتر تھا کہ تمھیں موت آجاتی۔''

وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے چل دیا، تقریباً دوڑنے لگا۔ بوڑھا، جواب تک اپنا شناختی کارڈ تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھ کر کارڈ ہلایا اور کہا:

''آیئے، عادل بے، آپ میری بات نہیں سمجھے... آپ نہیں سمجھے۔''

جب بوڑھے نے اسے دوبارہ سڑک پار کرتے دیکھا تو اس کی طرف دوڑا۔ جب بریکوں کے زور سے چرچرانے کی آواز آئی اور سڑک کے درمیان کوئی بہت بھاری چیز اس سے ٹکرائی تو وہ زمین پر گر گیا۔ اس کا اوپر کا دھڑ زمین سے بلند ہوا، اس کے منھ سے ایک کراہ نکلی اور وہ بازو پھیلائے دوبارہ گر پڑا۔ کارڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر اس کے پاس گر گیا۔

یہ غروب کے بعد کا وقت تھا جب تاریکی کا غلبہ ہونے سے پہلے روشنی آخری بار اپنی چمک دکھاتی ہے۔ سفید کار کے ڈرائیور نے جب سفید بالوں اور کھلی ہوئی آنکھوں والے بوڑھے کے گرد راہ گیروں کو اکٹھا ہوتے دیکھا تو گھبرا کر نیچے اتر آیا۔ کوئی بولا، ''ابھی ذرا دیر پہلے یہ کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔'' کسی دوسرے نے کہا، ''ہاں، ایک جوان آدمی تھا، میں نے اسے ابھی ابھی سڑک پار کرتے دیکھا ہے۔'' مگر جب انھوں نے اردگرد نظریں دوڑا کر اس جوان آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو وہ انھیں نہیں ملا۔

اُس نے بھی حادثہ ہوتے ہوے دیکھ لیا تھا اور اِدھر آنے کے لیے پلٹا تھا۔ مگر پھر اچانک رک گیا تھا، خود سے کہا تھا، ''وہ میرا نام گواہوں میں لکھ لیں گے اور بلاوجہ مجھے روکے رکھیں گے؛ اور مجھے پہلے ہی کمپنی پہنچنے کو دیر ہو رہی ہے۔'' پھر وہ تیزی سے اس گلی میں مڑ گیا تھا جس کے نکڑ تک پہنچ چکا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے پھر رک کر واپسی کا ارادہ کیا تھا، مگر پھر خود سے کہا تھا، ''اگر وہ زخمی ہوا ہے تو یہ لوگ اس کا علاج کرائیں گے، اور شاید اسے کچھ معاوضہ بھی مل جائے۔ اور اگر مر گیا ہے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ شاید اس کے بچوں کو معاوضہ مل جائے اور ان کا گذارا ہو سکے۔'' اگرچہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، وہ تیز تیز چلنے لگا اور پھر نہیں رکا۔

کسی نے جھک کر بوڑھے کا کارڈ اٹھایا۔ اس نے اس کا معائنہ کیا، بوڑھے کا نام پڑھا، اس کے

بچوں کے نام پڑھے، اور پھر کارڈ پولیس کے سپاہی کو تھما دیا جو خاموشی سے کار کے ڈرائیور کی بات سن رہا تھا۔ ڈرائیور اسے سمجھا رہا تھا کہ حادثہ کیسے پیش آیا؛ اس نے دونوں ہاتھوں سے پہلے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا، پھر انھیں مرے ہوے آدمی کی جانب لہرایا جسے وہ نہیں دیکھ رہا تھا۔

یوسف شارونی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

موجود عبدالموجود کی زندگی کی جھلکیاں

مع دو عدد پس نوشت

دونوں شمعیں بجھ گئیں: لڑکی اور اس کی ماں — میری بیوی اور میری داشتہ — اور چپلوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔

میں فلسفے کا استاد ہوں، اور اس سے پہلے بہت لمبے عرصے تک فلسفے کا طالب علم رہا ہوں — مگر ہمیں کہانی کو اس کے انجام سے شروع کرنا چاہیے۔

میں کمرے میں اکیلا ہوں؛ تنہا، اداس کمرہ، وسیع چھت پر واقع، جہاں مکان میں رہنے والوں کے کپڑے سکھانے کے لیے رسیاں آڑی ترچھی بندھی ہوئی ہیں، کبھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی، کبھی متوازی چلتی اور تکون اور چوکور بناتی ہوئی۔ میرے کمرے میں زیادہ فرنیچر نہیں ہے: ایک کرسی جس کے تختے پر میں بیٹھتا ہوں اور پشت پر اپنا کپڑوں کا جوڑا لٹکاتا ہوں؛ لکھنے اور کھانے کی ایک میز؛ ایک صوفہ جس پر دن میں میرے ملنے والے بیٹھتے ہیں اور رات کو میں سوتا ہوں؛ ایک پیالہ جس سے میں کبھی پیتا ہوں اور کبھی اس میں مونگ پھلیاں رکھ لیتا ہوں جو مجھے بہت مرغوب ہیں۔ میرے کمرے کی ہر چیز دوہرا استعمال رکھتی ہے، یہاں تک کہ اخبار بھی جسے لڑکا ہر روز دروازے کے نیچے سے پھینک جاتا ہے اور جس میں میں اپنے سزا پانے کی خبر تلاش کرتا ہوں، میز پوش کے طور پر کام آتا ہے۔ مگر ہمیں کہانی کو اس کے انجام سے شروع کرنا چاہیے۔

میں رات سے کس قدر دہشت زدہ ہوں! رات کس قدر غم ناک ہے! رات کا آغاز مجھے نہیں دہلاتا، بلکہ آخری حصہ۔ شروع رات میں میں اپنے خوف سے بچ نکلتا ہوں، جب کھانے کے فوراً بعد، خواہ میں نے

کتنا ہی ہلکا کھانا کھایا ہو، گہری نیند مجھے آلیتی ہے، جیسے میں نے کوئی بہت تیز نشہ آور دوا پی لی ہو۔ مگر زیادہ دیر نہیں گذرتی کہ مجھ پر انکشاف ہوتا ہے کہ میں ایک مکروہ فریب کا شکار تھا، کیوں کہ تین یا چار بجے میں چونک کر جاگ اٹھتا ہوں، جب رات کی خاموشی دن کے غل سے زیادہ پُرشور ہو جاتی ہے: کتے کا بھونکنا، مینڈک کا ٹرّانا، گھنٹے کی آواز، چیزوں کے ٹوٹنے کا شور، اپنی طرف آتے ہوے قدموں کی چاپ، اور اس ہونی کا دھڑکا جو ہونے کو ہے؛ ہوتی نہیں مگر ہو کر رہے گی۔ میرے ذہن میں ایک خیال چکر کاٹتا ہے، مجھ سے کہتا ہے: اپنی اس صورت حال کی ایک حد مقرر کر لے، اس کا ایک حل طے کر لے؛ جب دن خدا کی مخلوق سے بھرا ہوا ہو، اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول کر اپنے جرم کا اعلان کر دے۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ کسی شور وغل کے بغیر پولیس اسٹیشن جا کر اعتراف کر لے۔ مگر کیا اعتراف کروں؟ یہ اعتراف کروں کہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کس بات کا اعتراف کرنے آیا ہوں؟ لیکن تم کیا سمجھتے ہو، وہ میرے خود وہاں جانے کے انتظار میں رہیں گے؟ شاید وہ آرہے ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کتا کیوں بھونکتا، قدموں کی چاپ کیوں سنائی دیتی؟ بے خوابی اور کرب کی یہ کیفیت کتنی ہولناک ہے! صبح اس عقوبت سے مجھے رہائی دلاتی ہے: مرغ بانگ دیتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں، اور اندھیرے کا ڈراؤنا خواب دور ہو جاتا ہے۔

اب سے دور کسی زمانے میں، ایک صبح میں کالج جانے کے لیے سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ مجھے ایک ناگوار بو محسوس ہوئی۔ پہلے میں نے سوچا کہ کسی مرے ہوے کتے یا بلی کی بدبو ہے، یا مکان میں رہنے والے بچوں نے کسی چوہے کو مار کر چکردار زینے کی تہہ میں پھینک دیا ہے۔ لیکن چند روز پہلے شیخہ مدیحہ کی گم شدگی کے خیال نے میرے ذہن میں وسوسہ ڈال دیا جو اس مکان کو، گلی کو، بلکہ پورے محلے کو چہل پہل اور آوازوں سے معمور رکھتی تھی۔ میں سیڑھیاں دوبارہ چڑھ کر اوپر گیا اور اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ مگر کسی نے میری دستک کا جواب نہ دیا۔ میں نے بند دروازے میں سے اندر کا پتا چلانے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا؛ میں نے کنجی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر جھانکا، کچھ نظر نہ آیا؛ کان لگا کر سنا، کوئی آواز سنائی نہ دی۔ صرف میری ناک کو ایک بو محسوس ہو رہی تھی جو جرم کے قریب قریب پہنچتی تھی۔ میں نے فوراً پولیس اسٹیشن جا کر اپنے خدشوں کی اطلاع دینے کا فیصلہ کیا، کیونکہ، چند ہفتے قبل شیخہ مدیحہ کے متقی ہو جانے سے پہلے، ایک سے زیادہ رشتوں نے ہمیں ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔

جب میں نے اسے بتایا کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور یہ کہ ایسی بات کا الزام اٹھانے کی کیا ضرورت ہے جس کے سلسلے میں ہم بے قصور ہیں، تو وہ جواب میں ہنسنے لگی، جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''ابھی میں پڑھ رہا ہوں۔''

''اور بیوی کا خرچ نہیں اٹھا سکتے؟''

''میں نے ابھی دلہن کا انتخاب بھی تو نہیں کیا۔''

''دلہن تمھارے سامنے ہے۔رقم کا کوئی مسئلہ نہیں، مکان سجا سجایا موجود ہے۔''

اس طرح اس نے میری شادی کی تجویز پیش کی، لیکن اپنی بیٹی سے — اس جواب سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ یہ بات، جو شیطان کے دماغ میں بھی نہ آتی، خفیہ ملاقاتوں کی توضیح کر دے گی اور میرے خوف کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مجھے اپنے چھت والے کمرے سے اتر کر اس کے فلیٹ میں جانا تھا، لوگوں کے سامنے اس کی بیٹی کے شوہر کی حیثیت سے، اور شیطان کے سامنے اس کے عاشق کے طور پر۔ کیسا گناہ آلود بستر تھا! اور ہمارے اس منصوبے کی شکار کتنی بدقسمت تھی! کیسی دیوانی عورت تھی جس نے مجھے اور اپنی بیٹی کو اپنی ترنگ کی بھینٹ چڑھا دیا۔ رہا میں، تو میں ایک تیر سے دو شکار کر کے خوش خوش اپنا فلسفیانہ ترانہ وضع کرتا ہوں: میں خوف زدہ ہوں، اس لیے موجود ہوں۔

تھانے سے واپس آتے ہوے میرے دل میں کچھ کچھ امید تھی کہ شاید میرے خدشے محض خیالی ہوں اور شاید مجھے دروازہ کھلا ہوا ملے اور شیخہ مدیحہ دروازے میں کھڑی ہو کر پولیس کا راستہ روک دے، کیوں کہ اگر شیخہ مدیحہ کو کچھ ہو گیا تو یہ میرے لیے نہ ختم ہونے والی مصیبتوں کا آغاز ہو گا، اور سب سے پہلے مجھی پر الزام رکھا جائے گا۔ جب مجھ سے تفتیشی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونے کو کہا گیا تو میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اپنے اور شیخہ مدیحہ کے تعلقات کا خلاصہ پیش کیا اور اس کے ساتھ کسی گناہ آلود ربط سے انکار کیا اور ایسے خیال تک سے بیزاری ظاہر کی؛ بعض شرارتی گواہوں نے مجسٹریٹ کو اس قسم کے امکانات سے آگاہ کیا تھا۔ میں نے تسلیم کیا کہ جمعرات کی صبح میں نے اسے اس کا قرض لوٹایا تھا۔

''کیسا قرض؟''

''وہ رقم جو اس کی بیٹی سے اپنی شادی کے دن میں نے اس سے ادھار لی تھی۔''

''تم نے کتنی رقم لوٹائی؟''

''دو پونڈ۔ پہلی قسط۔''

جہاں تک اپنے اور اُس کے جھگڑے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں میں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کی بیٹی کی چپل کا ٹکڑا، پھیکے پڑتے ہوے سرخ رنگ کا، ہمارے سامنے میز پر پڑا تھا۔ اچانک اس نے مجھ سے چپل کے باقی حصے کے بارے میں سوال کیا؛ میں نے اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ اگر مجھ پر

دباؤ ڈالا جاتا تو میں فوراً اعتراف کرلیتا، کیونکہ میں جھوٹ بولنے میں ماہر نہیں ہوں؛ یہ میری کمزوریوں میں سے ایک ہے: جو کچھ میری زبان چھپاتی ہے، میرا اضطراب اسے ظاہر کردیتا ہے۔

جس بات کا مجھے دھڑکا تھا وہی ہوئی۔ دروازہ پہلے کی طرح بند تھا اور پڑوسی، مرد اور عورتیں، جمع تھے اور بدبو سے واقعے کا اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے۔ جب پولیس دروازہ توڑ کر اندر گھسی تو انھوں نے شیخہ مدیحہ کو بستر پر مردہ پایا؛ اس کی لاش سے ناک میں چڑھ جانے والا تعفن اٹھ رہا تھا۔ میرا دل ڈوب گیا، گھٹنے کانپنے لگے اور مجھے چکر آ گیا۔ خود کو سنبھالنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ہر شخص نے اپنے رومال یا ہاتھ سے اپنی ناک بند کررکھی ہے؛ میں نے بھی ایسا ہی کیا، اور جو سوال سب لوگ ۔کررہے تھے وہی میں بھی کرنے لگا: کیا اس کا مطلب ہے کہ کوئی جرم ہوا ہے؟ اور اگر ہوا ہے تو ملزم اور گواہ کون ہیں، اور کیا میرا نام بھی ملزم یا گواہ کے طور پر آسکتا ہے؟ اور اگر میں ملزم ہوں تو مجھ پر قطعی طور پر کیا الزام ہے؟ کیا بالآخر میں مجرم ثابت ہوں گا؟

پچھلی گرمیوں میں، اپنی تعلیم کا چوتھا اور آخری سال شروع ہونے پر، رہنے کے لیے ایک کمرے کی تلاش میں میری ملاقات ایک دلال سے ہوئی۔ پہلا سال میں نے قاہرہ کے شوروشغب میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گذارا تھا؛ میں اپنے عم زاد کے ساتھ رہتا تھا اور اپنے باپ کی نصیحتیں، ماں کی دعائیں اور کھانے پینے کی چیزیں جو انھوں نے میرے بہن بھائیوں کے حصے میں سے مجھے دی تھیں، گرہ میں باندھے، اس بڑے شہر کی پیچ دار گلیوں میں بھٹکتے ہوئے اس کے اسرار سے واقف ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا لہجہ اور لفظوں کا تلفظ میرے ہم جماعت لڑکوں اور لڑکیوں پر میری اصل کو ظاہر کردے گا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ کھلے عام اور بے روک ٹوک گھومتے پھرتے ہیں؛ اور مجھے بھی ایسا ہی کرنے کی خواہش ہوئی۔ لیکن مجھ میں دو چیزوں کی کمی تھی: ایک تو اس صلاحیت یا مہارت کی جو اس کے لیے درکار تھی، اور دوسرے رقم کی۔ اس لیے میں تنہا ہی رہا اور لوگوں سے کترانے لگا۔

پچھلی گرمیوں میں میرے عم زاد کی شادی ہوئی۔ گاؤں سے واپس آنے پر میں نے اس کے فلیٹ کو خوش وضع چمکیلے فرنیچر سے آراستہ اور اس کی حسین بیوی کے قبضے میں پایا۔ میرا بستر، کرسی، میز، اور کتابیں اس نے فلیٹ کے ایک اوجھل کونے میں ڈھیر کردی تھیں۔ سو میں سر چھپانے کی جگہ کی تلاش میں نکل گیا اور بالآخر اپنے اس کمرے تک پہنچا۔

پچھلی گرمیوں میں مجھے پتا چلا کہ میں اس فروتن عمارت کی عورتوں کو، جب وہ اپنے اور اپنے شوہروں اور بچوں کے کپڑے پھیلانے چھت پر آتیں، اپنے دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔ ہر جمعے کی صبح کو مدیحہ اپنے کپڑے پھیلانے آتی۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس کے کپڑوں میں مردوں اور بچوں کے لباس نہیں ہوتے، صرف زنانہ کپڑے ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا موقع تھا جب میری اس سے ملاقات ہوئی؛ پہلی بار میں اس سے اس کے فلیٹ میں اُس دن ملا تھا جب میں نے کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ اس دن میں نے نوٹ کیا تھا کہ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی اور اس کی بیٹی، جو اس کے ساتھ تھی، کم و بیش بیس سال کی ہوگی۔ مگر جب وہ مجھ سے اپنے کچھ کپڑوں کے بارے میں دریافت کرنے آئی جو گم ہو گئے تھے، تو وہ مجھے تیس سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوئی۔ وہ چوئنگ گم چبا رہی تھی اور اس نے مجھے خوشبودار اور سرایت کر جانے والی مہک کے نرغے میں لے لیا؛ اس کا لباس سادہ مگر جگمگاتے ہوئے رنگوں کا تھا اور اس سے نہ حیا کی نمود کا اظہار ہوتا تھا اور نہ اس وقت تک اس کے فقدان کا؛ اس نے گنے چنے لفظوں میں اپنی بات کہی جو بے باکی سے مگر شائستگی کے ساتھ ادا کیے گئے تھے۔ پھر بھی مجھے اس میں اپنے لیے ایک چھپی ہوئی دعوت کی موجودگی کا احساس ہوا جو اس کی خوشبو، اس کی چوئنگ گم، اس کے لباس اور اس کی شائستہ بے باکی سے پھوٹ رہی تھی۔ رات میں، نیند اور بیداری کے درمیان، میں نے اسے اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھا، جب کہ میری ہم سبق لڑکیاں، جنھیں رات کو آنکھ لگتے ہی دیکھنے کی مجھے عادت ہوگئی تھی، نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

دوسرے موقعے پر، جب اس کی بیٹی زینب سوکھے ہوئے کپڑے اکٹھے کر رہی تھی، میں دیر تک سامنے کھڑا رہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تکلیف ہے اور میں نے کہا کہ کچھ نہیں، اگرچہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے کیا تکلیف ہے یا مجھے کیا چیز درکار ہے۔ سب سے پہلے گاؤں اور ضلعی صدر مقام میں اور پھر کالج میں اپنے ہم سبق لڑکے لڑکیوں کے ساتھ میرے تجربات نے مجھے لوگوں سے ڈرنا اور دہشت زدہ ہونا سکھا دیا تھا؛ پھر بھی میں کچھ نہیں سیکھتا۔ لوگوں کے لیے میری طلب مجھے ان سے دور لے جاتی ہے۔

زینب میں نہ اپنی ماں کی سی شگفتگی تھی اور نہ کشش، حالانکہ نوعمری نے اس میں دھیمی سی ملاحت ضرور پیدا کر دی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ گھر سے مختلف وقتوں میں باہر جاتی اور واپس آتی تھی: کبھی دوپہر کو، کبھی شام کے وقت، اور کبھی کبھی تو وہ رات میں باہر جاتی اور صبح سے پہلے نہ لوٹتی، جس کی میں کوئی توضیح نہ ڈھونڈ سکا۔ بہرحال، بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ایک اسپتال میں نرس کے طور پر ملازم ہے۔ اس کی ماں نے بے پروائی سے کہا، ''مجھے اس کے بارے میں کوئی دھڑکا نہیں، نہ بیماروں سے نہ تندرستوں سے، چاہے وہ ڈاکٹر ہوں یا اسپتال کے عملے کے لوگ، کیونکہ وہ اپنے مرحوم باپ کی طرح جذباتی طور پر بہت

پُر سکون ہے، یعنی ٹھنڈی اور ٹھس ہے۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ لڑکپن کے دن اس نے یوں گذارے جیسے برف کا تودہ ہو؟ اس کا شوہر بغیر کسی نگرانی یا خرچ کے اس کی عفت کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے۔ ہا ہا ہا! زینب اپنی شکل صورت اور طبیعت میں اپنے مرحوم باپ پر گئی ہے۔ وہ دس سال پہلے مرا تھا اور جائیداد اور دنیا میں میرے حصے کے طور پر یہ لڑکی اور یہ مکان چھوڑ گیا تھا۔''

لڑکی کا لیے دیے رہنے کا انداز مجھے ماں کے خوش باش اور آزاد طرزِ عمل پر ایک خاموش احتجاج معلوم ہوتا تھا، مگر اس کے باوجود اپنی ماں کی برائی میں ایک لفظ سن کر اس کے اندر کا سدھا ہوا جاندار کسی وحشی حیوان میں بدل جاتا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کی آواز کو اس وقت بلند ہوتے ہوئے سنا جب وہ ایک کرائے دار عورت پر چلا رہی تھی اور میں سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا، اور میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا اس پر مجھے اعتبار نہ آیا—وہ میرے حق میں بول رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اس کے منھ سے اپنا نام سنا، اور یہ نام مجھے اپنا بھی لگ رہا تھا اور اجنبی بھی: موجود عبدالموجود۔

پھر باتیں بننے لگیں۔ شاید یہ کسی ہونے والی بات کی پیش گوئی ہے، کیونکہ انھیں جس چیز کا شبہ ہے وہ اب تک تو پیش نہیں آئی۔ اور مجھے یقین ہے آئے گی بھی نہیں۔ بہر حال، اس کی مجھے توقع تھی اور خوف بھی تھا؛ میری توقع درست نکلی، جس بات کا مجھے خدشہ تھا وہ ہو کر رہی۔ میں نے اسے خبردار بھی کیا تھا مگر اس نے میری بات پر کچھ دھیان نہیں دیا؛ اس کی بے خوفی سے مجھے ڈر بھی لگتا ہے اور کشش بھی محسوس ہوتی ہے، وہ مجھے دور بھی کرتی ہے اور اپنی طرف کھینچتی بھی ہے۔ لوگوں کی باتوں میں ایسا الزام تھا جس کی بنیاد تھی بھی اور نہیں بھی تھی۔ وہ مجھ سے میرے کمرے میں ملنے آئی تھی؛ اس کا یہ فعل بظاہر غیر ارادی تھا، مگر میں جانتا تھا کہ یہ دانستہ کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ فجر کا وقت تھا، کسی کے چھت پر آنے سے پہلے کا وقت۔ مگر میں خود کو بری الذمہ کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں، جیسے میرا پیچھا کر کے مجھے گھیر لیا گیا ہو اور خود میں نے، اس سے بڑھ کر راز دارانہ اور لطیف انداز میں، کوشش نہ کی ہو؟ میں نے اس کے پاس سے گذرتے ہوئے پہل کی تھی اور پوچھا تھا کہ گاؤں سے میرے نام کوئی خط تو نہیں آیا۔ بہر حال، جب مہینے کی پہلی تاریخ آئی تو میں نے پھر حملہ کیا اور کرایہ ادا نہیں کیا، کیونکہ پیسے نہیں پہنچے تھے، لیکن میں نے اس سے کرایہ ادا نہ کرنے کی معذرت کی، اور اس دوران اس کی جانب سے دعوت کا خواہش مند اور اس سے خوف زدہ رہا۔ مجھے خوف تھا کہ نہ جانے یہ دعوت کون سی اَور دعوتوں کی تمہید ثابت ہو، اور ایسی دعوت سے کیسی چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں۔ جب میں نے اسے اشارتاً بتایا کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ایسی بات کا الزام

اٹھانے سے کچھ حاصل نہیں جس کے سلسلے میں ہم بے قصور ہیں، تو وہ جواب میں ہنس پڑی جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

عورت کا بدن کیسی دہلا دینے والی چیز ہے! میں ایک دیہاتی طالب علم ہوں جو قصبے کے اسکول کی پہلی جماعت میں پہلی بار داخل ہو رہا ہے؛ میں دور کسی چھوٹی سی جگہ سے آنے والا طالب علم ہوں جو قاہرہ یونیورسٹی میں اپنے پہلے دن کے پہلے لمحے کا سامنا کر رہا ہے۔ مجھے دل کڑا کر کے اور الگ تھلگ رہنا چاہیے؛ مجھے سیکھنا اور خود کو عادی بنانا ہے؛ مجھے کوئی چیز حاصل کرنی ہے اور کچھ چیزیں مجھ سے پوشیدہ رہنی چاہییں۔ میری اتالیق باصلاحیت اور تجربہ کار ہے اور خود کو ڈرپوک جنگلی جانور سے ہم آہنگ کر لیتی ہے۔ مجھے دروازے پر دستک سنائی دیتی اور ہمارا لطف خاک میں مل جاتا؛ پھر مجھے پتا چلتا کہ یہ صرف ہوا تھی اور ہم ٹوٹے ہوئے سلسلے کو دوبارہ جوڑتے؛ میں جادوئی غاروں میں اترتا چلا جاتا اور اپنے خوف کو خوف کے منبعے میں چھپا لیتا۔

مکان کے سامنے ایک کھلا احاطہ ہے؛ احاطے میں کسی بزرگ کا عرس ہو رہا ہے۔ تقریب میں ستر ہزار لوگ شریک ہیں، ہر ایک کے ستر ہزار ہاتھ ہیں، ہر ہاتھ میں ستر ہزار چپلیں ہیں، ہر چپل میں ستر ہزار شمعیں جل رہی ہیں۔ وہ جھومتے ہوئے گنگناتے ہیں: ’’جو جائز نہیں تھا وہ ہو گیا، قسمت کا لکھا سامنے آیا۔ بے شک تو رحمٰن اور رحیم ہے۔‘‘

شادی کے دن میری کتابیں چھت والے کمرے سے دلہن کے کمرے میں منتقل ہو گئیں، جبکہ میرا دوہرے استعمال والا فرنیچر اپنی جگہ پر رہا۔ میں نے اپنی دلہن کو چند معمولی تحفے دیے: خوشبو کی ایک شیشی، کپڑوں کا ایک جوڑا اور سرخ مخمل کی چپلیں۔ چپلیں ان میں سب سے کم قیمت تھیں، اور حیرت کی بات ہے کہ انھیں کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ اس نے انھیں سینے سے لگایا اور چوما، اور اب، اے میری دلہن، میں جانتا ہوں کہ تیری یہ مسرت کس بدبختی کی پیش گوئی کر رہی تھی۔ جہاں تک میرے باپ کا تعلق ہے، میں نے ڈر کے مارے اسے اطلاع نہیں دی۔

کمرے کا ایک دروازہ تھا، دروازے میں ایک سوراخ تھا اور سوراخ کی ایک کنجی تھی۔ وہ اتنی محتاط تھی کہ کمرے میں داخل ہو کر تالا لگا دیتی، اور میں اس سے بھی زیادہ محتاط تھا کہ کنجی کو سوراخ میں اٹکا رہنے دیتا، تاکہ سوراخ بھی بند رہے اور اگر زینب اندر جھانکنا چاہے تو اس کی آنکھ پر بھی پردہ پڑا رہے۔ لوگوں کی نظروں سے پناہ کہاں ہے؟ ہم نے اجنبیوں کی آنکھیں بند کیں تو زینب کی آنکھیں کھل گئیں۔

زینب کی عادت تھی کہ اپنے کام کے سلسلے میں جہاں کہیں جاتی مکان کی دوسری کنجی اپنے ساتھ رکھتی۔ شادی کے بعد بھی اس کا یہ معمول جاری رہا، تاکہ کہیں ہم اس کے شبہات کو بیدار نہ کر بیٹھیں، کیونکہ لوگوں کی سرگوشیاں اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ کنجی، مکان کے باہر کے دروازے کی کنجی، اس کے پاس رہنے دینا ہماری پہلی دفاعی صف تھی۔ کنجی، کمرے کے دروازے کی کنجی، سوراخ میں اٹکی رہنے دینا ہماری دوسری دفاعی صف تھی۔ ان دونوں دفاعی تدبیروں کی کمزوریاں ظاہر ہیں: پہلی تدبیر میں کوئی شخص چپکے سے پاس پہنچ سکتا ہے، دوسری تدبیر میں رنگے ہاتھوں پکڑ سکتا ہے۔

چپل کمرے کے دروازے پر پڑی ہوئی ملی، جس وقت نیچے گلی سے عورتوں کے بین کرنے اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مجرمانہ مسرت اور دہشت گلے میں جھنجھنا رہی تھی۔ یعنی اس نے اپنے کانوں کے ذریعے سے کمرے کا پردہ چاک کر لیا تھا، جو کچھ اس کی آنکھوں سے چھپا ہوا تھا اس نے اپنے کانوں سے دیکھ لیا تھا۔ تفتیش کے دوران پتا چلا کہ زینب دیوار پر سے، چھت کی دیوار پر سے، جہاں میرا کمرہ تھا، نیچے کود گئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں پڑی تھی، اس کی آنکھیں، ہول اور اتنی اونچائی سے گرنے کی وجہ سے، ابلی ہوئی تھیں۔

چپلوں کا راز میرے اور مدیحہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ میں نے انھیں اپنی دلہن کے پیروں میں پہنانا چاہا، جس وقت وہ لاش میں تبدیل ہو چکی تھی اور ہم اسے قبر کے سپرد کر رہے تھے، لیکن اس کی ماں نے انھیں اپنے پاس رکھنے پر اصرار کیا۔ جب بین کرنے والی عورتیں آئیں تو انھوں نے اسے چپلوں کو سینے سے لگاتے اور چومتے ہوئے پایا۔

اس کے اگلے دن اس نے مجھے اپنے فلیٹ سے نکال دیا۔ میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ اس کے کہنے سے پہلے ہی اپنے چھت والے کمرے کو لوٹ جاؤں۔ مجھے اس کی سختی نے ڈرا دیا، اس کی تکرار نے حیران کر دیا۔

''تمھاری بیوی مر چکی ہے اور تمھارا میرے فلیٹ میں رہنا شرعاً ناقابلِ قبول ہے۔''

مجھے ہچکچاتا دیکھ کر وہ چلانے لگی:

''خاموشی سے چلے جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔''

جس طرح خوف مجھے نیچے لایا تھا، اسی طرح خوف مجھے واپس اوپر لے گیا۔

میں ایک ایک کر کے اپنے کاغذ پھاڑنے کی عادت میں مبتلا ہو گیا، میرے باپ کے خط، مرحومہ زینب اور اس کی ماں مدیحہ کی تصویریں، میرے تدریس کے نوٹس؛ یہاں تک کہ میں نے اپنی اسکول کی کتابیں اور وہ نوٹ بکیں بھی تلف کر ڈالیں جن پر میں طالب علموں کو دینے کے لیے اپنے لیکچر تیار کرتا تھا،

کہ کہیں ان میں کوئی ایسی چیز نہ نکل آئے جو، میری بے خبری میں، مجھے مجرم ثابت کردے۔

عُرس کی راتوں کو مدیحہ بال بکھرائے، ننگے پیر، پھٹا پرانا جلا بیہ پہنے باہر نکل جاتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چپل پر ایک شمع رکھتی اور ہر شمع پر ایک شعلہ روشن کرلیتی۔ اس کے منھ سے الفاظ ادا ہوتے، نہ تو سرگوشی کی طرح دھیمے اور نہ چیخ کی طرح بلند: ''ہم سے گناہ سرزد ہوا، اور بے شک تیری آنکھ نیند سے بے نیاز ہے۔ سوائے انسانوں کے رب، تیرا انتقام بہت سخت ہے۔'' پھر وہ چلاتی: ''میں نے تمھیں دیکھ لیا... میں نے تمھیں پکڑلیا... تم دونوں کو...''

وضاحت کے لبوں پر ابہام؛ راز بدنامی کی شکل اختیار کرنے کو ہے۔ اس نے جتنا فاصلہ گلی میں طے کیا، اتنی ہی مکان کی بلندی بھی؛ ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے۔ جب عرس کا شوروشغب تھا تب بھی مدیحہ گلیوں میں بھٹکتی پھری۔ اس کے سر پر ایک خوان تھا، خوان میں دونوں چپلیں رکھی تھیں، دونوں چپلوں میں دو شمعیں تھیں، اور دونوں شمعوں کے سروں پر دو شعلے تھے۔ لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے؛ ایک گروہ وہ تھا جو اسے حیرت اور تحسین سے دیکھتا، اور دوسرا وہ جو مجھے دیکھ کر — اور مجھے دیکھے بغیر — افواہیں ایجاد کرتا اور آپس میں سرگوشیاں کرتا۔

میرا خوف اب دونوں چپلوں پر، ان کے سرخ رنگ پر، ان کے مخملیں لمس پر، اور ان میں بسے رہنے والے تلووں اور انگلیوں کی بو پر مرکوز ہوگیا تھا۔ نیند میں میں انھیں حرکت کرتے دیکھتا، جیسے کسی شخص نے انھیں پہن رکھا ہو، اور وہ کمرے کی دیواروں پر آزادی سے چلتی پھرتیں؛ جب چھت پر پہنچتیں تو گر کر میرے سر پر آ پڑتیں، اور میں خوف سے چونک کر انھیں جھٹک دیتا، جس پر وہ اپنا سفر پھر سے شروع کر دیتیں۔ میری آنکھ کھل جاتی اور مجھے معلوم ہوتا کہ میرا مثانہ دباؤ سے پھٹ رہا ہے۔

اگر میں اس سے انھیں چھین لیتا تو گویا اس پاگل عورت سے اپنا راز چھین کر اپنے قبضے میں کرلیتا جس کے لفظ ہر روز اپنے ڈھکے چھپے انکشاف سے مجھے دہلاتے رہتے تھے۔ کئی بار میں نے ٹھانی کہ جب ہم گرمیوں میں گلی کے دھندلکے میں یا جاڑوں میں اس کی پھسلواں کیچڑ میں آمنے سامنے ہوں تو میں اس پر حملہ کرکے انھیں اس سے چھین لوں، مگر مجھے اپنے خوف سے خوف آنے لگتا، کہ جو اب تک مبہم ہے واضح ہوجائے گا، اور راز کھل جائے گا۔ اگر وہ انھیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فلیٹ میں چھوڑ دیتی تو میں دبے پاؤں جا کر انھیں چرا لاتا، لیکن وہ انھیں ساتھ لے کر گھر سے نکلتی تھی اور ان کے ساتھ ہی واپس آتی تھی۔

ایک شام میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں، اس کی آواز

سرسراہٹ میں بدل گئی۔ ''پاس آنے کی جرأت نہ کرنا۔ میں جانتی ہوں تم کیوں آئے ہو۔''
یہ کہہ کر وہ سامنے والے کمرے میں رکھے صوفے کی طرف لپکی جہاں چپلیں رکھی تھیں؛ انھیں اٹھا کر اس نے سینے سے بھینچ لیا، اور میں نے خود کو پرسکون ظاہر کرکے اسے پرسکون کرنے کے لیے جواب میں کہا:
''میں جائیداد میں اپنے حصے سے دست برداری کا اعلان کرنے آیا ہوں۔''
''جھوٹ بولتے ہو۔''
''اور یہ بتانے کہ میں نے ایک اور کمرہ دیکھ لیا ہے۔''
ایک لمحے کو وہ ساکت سی ہوئی، پھر چپلوں کو لہراتے ہوئے بولی:
''تم خدا کی نظروں سے نہیں بچ سکتے۔''
اس نے چپلوں کو پھر سینے سے لگالیا، اور احتیاط رکھی کہ میرا اور اس کا فاصلہ کم نہ ہونے پائے، اور میں غور سے جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات کہتا رہا:
''اور میں تمھارا قرض بھی چکانا چاہتا ہوں۔''
''تم پر بہت سے قرض ہیں۔ تم دیوالیہ ہو۔''
میں نے اپنا ہاتھ پھیلایا جس میں رقم تھی اور اس نے رقم لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر دوسرے ہاتھ سے چپلوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ یہی موقع تھا: یہ چپلیں میرا راز تھیں اور میری دشمن، میرا خوف اور میری تشویش؛ انھیں میں نے ہی خریدا تھا، میں نے ہی تحفے میں دیا تھا؛ اس لیے وہ مجھ سے تعلق رکھتی تھیں اور میری ملکیت تھیں۔ تو پھر کوئی اور شخص مجھے دھمکانے اور میرا راز افشا کرنے کے لیے انھیں قبضے میں کیوں لیے ہوئے تھا؟ اس نے میرے سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر مجھے زور سے دھکا دیا، اور دوسرے ہاتھ سے انھیں اپنی وحشی گرفت میں رکھا۔ کتنی بار میں نے ان ہاتھوں کو، ان نرم اور نازک ہاتھوں کو، چوما تھا، اور اب ان میں سے ایک اپنے بچے کو بچاتی ہوئی شیرنی کا پنجہ بن گیا تھا اور دوسرے کی پشت پر ابھری ہوئی رگوں کو میں اپنی آنکھ کے بالکل پاس یوں دیکھ رہا تھا جیسے خوردبین میں سے دیکھ رہا ہوں؛ وہ میرے منھ کے اتنا قریب تھا کہ مجھے اس کو کاٹ لینے، بلکہ چبا جانے کی ترغیب محسوس ہوئی۔ پھر بھی، لگتا تھا کہ اس کی عزیز متاع کو چھیننا صرف ہاتھوں کی زور آمائی سے ممکن نہیں ہوگا، خاص طور پر اس لیے کہ اس کی چیخیں میرے منصوبے کو خاک میں ملانے کو تھیں۔ سر پر ضرب لگاؤ تو ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ کیا ایک سیکنڈ گذر گیا؟ دو سیکنڈ؟ چپلیں میرے ہاتھ میں تھیں؛ میرا راز میرے قبضے میں تھا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے دروازے کو قفل لگا دیا اور لپک کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا، نہ زینے میں اور نہ چھت پر۔ وہ منحوس چپلیں اب میرے سامنے تھیں؛ میں نے انھیں غور سے دیکھ کر خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ مجھ

پر انکشاف ہوا— اور وہ کیسا ہولناک انکشاف تھا— کہ وہ سالم میرے قبضے میں نہیں آئی تھیں، کہ ان کا ایک ٹکڑا، یعنی داہنے پاؤں کی ایڑی کے اوپر کا پچھلا حصہ، کچھ ہی دیر پہلے سفا کی سے نوچ لیا گیا تھا۔ بلاشبہ، میں جانے بغیر، خوف اور مسرت کی کیفیت میں، اپنی فتح کو مکمل اور اسے اپنے خلاف اس کے ہتھیار سے محروم سمجھتے ہوے، اس کے فلیٹ سے لپک کر باہر نکلتے ہوے، اس ٹکڑے کو اس کی مٹھی میں دبا چھوڑ آیا تھا۔ جب کہ وہ بے ہوشی کے حالت میں بھی اس شے کے ایک حصے پر قابض تھی جسے میں اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

بیماری کے دوران دونوں سرخ چپلیں دوبارہ ظاہر ہو کر میرے کمرے کی دیواروں پر میرا پیچھا کرنے لگیں: ایک بار صبح سویرے اور دوسری بار شام ہونے سے پہلے۔ اگرچہ دونوں وقت وہ مجھے اتنی صاف نظر آتیں کہ داہنے پیر کی ایڑی کے اوپر کا حصہ بالکل اسی طرح اُکھڑا ہوا دکھائی دیتا جیسا اصل میں تھا، اس کے باوجود مجھے احساس ہوتا کہ یہ بخار کا نتیجہ ہے، محض واہمہ ہے، اور یہ کہ مجھے اپنے کمرے کی حقیقی شہادت پر، اس کی دیواروں، اس کے اینٹوں کے فرش، اس کی چھت، اس میں رکھے ہوے صوفے، کرسی، میز اور پیالے کی شہادت پر بھروسا کرنا چاہیے۔ مجھے خوف تھا کہ میں اس دنیا سے رابطہ کھو بیٹھوں گا اور پھر مجھے یہاں تک واپسی کا راستہ نہیں ملے گا۔

اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں نے خود کو خوف میں مبتلا کرنے اور اپنے عزیزوں کی بابت خوفزدہ ہونے کے لیے سرطان کی بیماری کا انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب کی وجہ اس بیماری کی خصوصیات تھیں۔ یہ تقریباً واحد مرض ہے جس کا سبب یا علاج دریافت کرنے میں علم طب اب تک ناکام ہے؛ یہ ہر عمر کے لوگوں پر حملہ کرتا ہے؛ یہ بدن پر کسی بھی جگہ چھپ کر بیٹھ جاتا ہے، اور ذرا سا درد، یا درد کے بغیر کوئی ذرا سی بے سکونی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ زہریلا مرض پوری طرح اپنے پنجے گاڑ چکا ہے۔ اس کا درد بھی، اکثر صورتوں میں، انتہائی خوفناک اور سخت ہوتا ہے۔

اس روز میرا تنہائی کا احساس کئی گنا بڑھ گیا۔ اس روز مجھ پر دو انکشاف ہوے: پہلا یہ کہ مجھے موت سے خوف نہیں آتا، اور دوسرا یہ کہ موت سے نہ ڈرنے کا مطلب ان چیزوں سے نہ ڈرنا نہیں جو موت سے پہلے آنے والی ہیں، جیسا کہ میں سمجھتا تھا۔ میرا خوف، درد اور شکستگی کا، اور اپنی توقیر کے برباد ہو جانے کا خوف، کئی گنا بڑھ گیا۔ وہ دن میری صحت یابی کا آغاز تھا، سواے اس کے کہ بیماری کا آسیب مجھے اب بھی دہشت زدہ رکھتا ہے، اور اس کی جو بات مجھے دہشت زدہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مجھے واہموں اور پراگندہ خیالوں کی دنیا میں لے جائے گی۔

اس روز مجھے معلوم ہوا کہ میرا خوف میری زندگی کے تمام پہلوؤں تک سرایت کر چکا ہے— کوئی

مرض مجھے اپاہج کر دے گا، موت میری ماں یا میرے باپ کو آلے گی، میرا ہیڈ ماسٹر یا انسپکٹر میرے بارے میں خراب رپورٹ لکھ دے گا۔

صحت یابی کے آغاز پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے خدشوں کی دنیا میں واہمہ حقیقت پر حاوی ہو جاتا ہے: میں بیمار تھا اور صحت یاب ہو گیا ہوں؛ میرا باپ گاؤں میں ایک خونی انتقام کا ہدف بننے والا تھا اور بچ گیا؛ میرے ہیڈ ماسٹر یا انسپکٹر نے میرے ساتھ زیادتی نہیں کی؛ اور چونکہ تفتیشی مجسٹریٹ نے مجھے بہت پہلے بری کر دیا تھا، کسی شخص کو مجھ پر کوئی شبہ نہیں ہوا، اور اس کے بعد کسی مجسٹریٹ نے مجھے حراست میں لے کر تفتیش نہیں کی۔ اس لیے مجھے چاہیے کہ اپنے خوف کو اتار پھینکوں اور اعتماد اور سکون سے آگے بڑھوں۔ اس روز میں نے اپنے ایک مدرس ساتھی کے گھر جانے اور رات کا کھانا شہر کے ایک پرتعیش ریستوراں میں کھانے کا ارادہ کیا۔ اپنے کمرے میں واپسی پر میں نے کھڑکیاں کھول دیں اور دروازے کے سوراخ میں سے کنجی نکال کر، کئی برسوں میں پہلی بار، کسی بے خوابی یا اضطراب کے بغیر گہری نیند سویا اور چاندنی اور رات کی نرم ہوا آہستگی سے مجھے مس کرتی رہی۔

لیکن صحت یابی کے آغاز کے ایک ہفتے بعد مجھے ایک تار موصول ہوا جس میں میرے باپ کی ناگہانی اور غیر متوقع موت کی خبر تھی۔ اس لمحے میں پچھتاوے کے گہرے احساس میں ڈوب گیا؛ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا خوف میرے باپ کی حفاظت کرتا رہا تھا، اور میں نے اپنے سکون کو ترجیح دے کر اسے اس کی حفاظت سے ہٹا لیا تھا اور یوں موت کو ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹ کر میرے باپ کو مجھ سے چھین لے جائے۔ اس طرح مجھے اپنے سکون سے ہونے کی سزا ملی، اور اس روز میں نے جانا کہ میرے خوف کا صلہ یہی ہے کہ مجھے جس چیز کا خوف ہے وہ پیش نہ آئے — اور اگر پیش بھی آئے تو اس کا اثر تصورات اور واہموں کے ہاتھوں بڑی حد تک کم ہو چکا ہو۔

اس روز سے لے کر، جب کبھی میں سکون سے ہوتا تو خوف میں مبتلا ہو جاتا، اور جب خوف میں ہوتا تو مجھے سکون ہوتا، اور جب کبھی سکون سے ہوتا تو کسی بدبختی کی توقع کرنے لگتا، اور جب خوف میں ہوتا تو خود کو محفوظ خیال کرتا۔ اس روز سے لے کر جب کبھی میں نے خود کو کسی تردد میں گرفتار نہیں پایا تو تردد میں مبتلا ہو گیا۔

جب میں نے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی تو وہ کمرے کے وسط میں گر پڑی تھی۔ جب میں پولیس کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا تو اس کا مسخ شدہ بدن صوفے پر گٹھڑی بنا ہوا پڑا تھا۔ جو رقم اس نے مجھ سے جمعرات کی دوپہر وصول کی تھی وہ نہ اس کی مٹھی میں تھی اور نہ کہیں فرش پر۔ چند دن بعد طبی معائنے کی

رپورٹ آئی جس میں تھا کہ موت جمعے کی صبح کو واقع ہوئی۔ اس دن سے لے کر میں فرش کے وسط سے صوفے تک، جمعرات کی دوپہر سے جمعے کی صبح تک چکر کاٹتا رہا۔ یہی میرا مکاں تھا، یہی میرا زماں۔

اگر تفتیشی مجسٹریٹ نے ایک لمحے کو بھی میرے بیان پر شک کیا ہوتا تو میں اسے سب کچھ بتا دیتا اور ان سب حقائق کی روشنی میں یہ فیصلہ اس پر چھوڑ دیتا کہ میں کس حد تک مجرم یا معصوم ہوں، مگر میں نے جرم اور بے گناہی کے درمیان فیصلے کو اپنے سر کے اوپر لٹکتا چھوڑ دیا۔ اس طرح جو کچھ میری نظر سے پوشیدہ تھا مجھے خوفزدہ کرنے لگا۔

جب کبھی میری اپنے کسی ساتھی یا افسر سے کوئی تکرار ہو جاتی ہے تو میں بحث کو ایک حد سے آگے بڑھ کر جھگڑے یا رنجش کی شکل اختیار نہیں کرنے دیتا؛ کسے معلوم کہ یہ شخص کسی طرح میرے رسوا کن راز سے واقف ہو گیا ہو اور ایک لمحے میں اس دیوار کو مسمار کر ڈالے جسے خوف نے روز بہ روز تعمیر کیا ہے، اور اس شے کو میرے سر پر دے مارے جس سے میں دسیوں سال سے اپنی حفاظت کرتا چلا آیا ہوں، میرے چہرے سے وہ نقاب نوچ لے جسے گھونگھے کی سیپی کی طرح، کچھوے کے خول کی طرح تان کر میں ایک ایک دن رات، ایک ایک لمحہ گذارتا رہا ہوں، اور یہ بات افشا کر دے کہ میں شبہوں سے ماورا، مگر پھر بھی مشتبہ ہوں۔ اس لیے میں اس شخص میں کوئی شبہ ابھارنے سے پہلے ہی پسپائی اختیار کر لیتا ہوں کہ کہیں وہ میرے ماضی کو کھنگال کر مجھ پر کوئی مہلک وار نہ کر ڈالے۔ مجھے اب تک اس دن کی دہشت یاد ہے جب میری اپنے ایک مدرس ساتھی سے تکرار ہو گئی تھی اور پھر مجھے پتا چلا تھا کہ اس کا ایک رشتے دار کبھی شیخہ مدیحہ کی گلی میں رہا کرتا تھا؛ اس لیے، گو کہ اس نے پوری بحث کے دوران میرے مسئلے کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا، اور گو کہ اگلے ہی دن میری اس سے صلح ہو گئی، میں نے اسی دن اس شہر سے تبادلہ کرانے کی کوشش شروع کر دی اور جب تک اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو گیا سکون کا سانس نہ لیا۔

اس روز مجھے احساس ہوا کہ میرے خلاف اس الزام نے میری شخصیت کو کس حد تک دوغلے پن کا شکار بنا دیا ہے، ایسا دوغلا پن جس کی سرطانی ابتدا میری زندگی کے قصے میں کسی نامعلوم لمحے میں ہوئی تھی، شاید اُس روز جب میں اپنے کمرے سے اتر کر شیخہ مدیحہ کے فلیٹ میں گیا تھا، اور بلاشبہ اس میں اُس روز مزید بگاڑ پیدا ہو گیا تھا جب میں تفتیشی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا تھا اور اسے آدھے حقائق بتائے تھے اور آدھے حقائق کو چھپا کر ان سے انکار کر دیا تھا۔ اور آج میں خود کو جسے مانتا ہوں اس پر عمل نہ کرنے اور جو کام کرتا ہوں اس پر یقین نہ رکھنے کی کشمکش میں گرفتار، اور ایسی شرمندگی کا شکار پاتا ہوں جو اس کشمکش سے

بھی تلخ تر ہے، کیونکہ میں جو کچھ ظاہر کرتا ہوں وہ اس سے مختلف ہے جسے اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہوں۔

ایک شام جب میری ایک رشتے دار، ایک مطلقہ عورت، جو مجھ سے شادی کی آس لگائے ہوئے ہے (جب کہ میں نے، اس کی شادی اور طلاق سے پہلے، اس سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا تھا)، مجھ سے ملنے آئی تو اس نے اپنی دلکشیوں کو اتنی کھلی اور واضح دعوت کے ساتھ عریاں کیا کہ میری خواہش بیدار ہو گئی۔ لیکن آخری ہدف کو پہنچنے سے پہلے، جب اس نے مجھے استفہامیہ الجھن سے دیکھا، جیسے میں خود کو دیکھا کرتا تھا، تو میری شہوت جاتی رہی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اس موقعے پر میرا دھیان بٹانے والی کوئی چیز نہیں تھی؛ میں ایک دلکش عورت کی توجہ اور مہربانی کا مرکز بننے پر خوش تھا اور مجھے کم سے کم اس کی توجہ کا جواب توجہ سے دینا چاہیے تھا۔ بہرحال، اس نے بڑی مہارت سے صورت حال کو سنبھال لیا اور کوئی اشارہ نہ دیا کہ اسے لپٹنے چمٹنے اور سرگوشیاں کرنے میں ظاہر ہونے والی جذباتی قربت سے بڑھ کر کسی چیز کی توقع تھی۔ لیکن جب میں تنہا ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ مدیحہ، زینب، اس کی چپلیں، اور چلانے، اشارے کرنے اور چہ میگوئیاں کرنے والے لوگ، اور تفتیش کرنے والا مجسٹریٹ، سب میری ارضی گہرائیوں میں اتر چکے ہیں اور وہاں سے میری ناطاقتی کا عمل پڑھ رہے ہیں تاکہ میں بیج بونے اور فصل لینے کی مسرت سے محروم رہ جاؤں۔ جس بات کا پہلے مجھے اندازہ تھا اس کی اب تصدیق ہوگئی: کہ میں جس چیز کی خواہش کرتا ہوں وہ مجھے حاصل نہیں ہوتی اور جو مجھے حاصل ہے میں اس کی خواہش نہیں رکھتا، اور یہ کہ میرا وجود نارسا خواہش اور بےخواہش رسائی کے درمیان واقع ہے۔

جو بات مجھے سب سے بڑھ کر خوف زدہ کرتی ہے وہ میرا کامیاب یا ممتاز ہونا ہے۔ پچھلے سال میں نے مختلف جماعتوں کے جن طالب علموں کو پڑھایا تھا وہ سب کے سب پاس ہوگئے، اور میں ان کی اور اپنی کامیابی پر مسرور ہوا۔ مگر مجھے جلد ہی پتا چل گیا کہ مجھ سے ایک بھیانک جرم سرزد ہوا ہے؛ میرے ساتھیوں نے اسے اپنے پر ذاتی حملہ سمجھا اور ان میں جو مجھ سے قریب ترین تھے انھوں نے اجنبیوں سے پہلے جوابی کارروائی کی۔ شاید انھیں خوف تھا کہ ان کے طالب علم جماعت سے باہر پڑھنے کے لیے مجھ سے رجوع کریں گے اور اس طرح میں انھیں ان کی اضافی آمدنی سے محروم کردوں گا، حالانکہ میں اول تو جماعت سے باہر پڑھاتا ہی نہیں تھا، اور اگر بہت مجبوری آپڑے تو بےقاعدگی سے اور بغیر معاوضے کے پڑھاتا تھا— اور یہ بات انھیں اور بھی زیادہ کھلتی تھی۔ انھوں نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو، ضلعی انسپکٹر کو، اور وزارت تعلیم تک کو شکایتیں بھیجیں اور مجھ پر الزام رکھا کہ میں اپنے طالب علموں کو امتحان میں آنے والے سوال پہلے سے بتادیتا ہوں۔ جب مجھ سے باز پرس کی گئی تو معلوم ہوا کہ پرچہ میں تیار نہیں کرتا، اور امتحان میں آنے والے سوالوں

کی مجھے پہلے سے خبر نہیں ہوتی۔ لیکن مجھے اصل میں جس بات کا خوف تھا وہ یہ تھی کہ میرے مخالفوں میں سے کوئی میرے ماضی کی تہوں کو کرید کر واقف ہو جائے گا کہ میں اس مقدمے میں ملوث رہ چکا ہوں، جس سے مجھے ناقابل تلافی شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دن سے لے کر میں جان گیا کہ اگر مجھے سلامت رہنا ہے تو پس منظر ہی میں رہنا چاہیے؛ اگرچہ میں اپنے تدریس کے شوق یا خلوص سے دست بردار نہیں ہو سکتا، مگر کم سے کم مجھے اس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے؛ اور امید رکھنی چاہیے کہ میرے طالب علموں میں سے ایک آدھ ضرور امتحان میں ناکام رہے گا۔ لیکن اسی روز مجھ پر یہ افسوس ناک انکشاف بھی ہوا کہ میرا معاملہ میری خواہش پر منحصر نہیں ہے، کہ میرے طالب علم میرے نہ چاہنے پر بھی سب کے سب پاس ہو سکتے ہیں اور اس طرح میرے بارے میں شکوک دوبارہ بیدار ہو سکتے ہیں۔ اس روز سے لے کر میں نے درست اور غلط میں فرق کرنا چھوڑ دیا، یہ جان کر کہ میرے بارے میں فیصلہ کرنے والا میں نہیں کوئی اَور ہے، اور میں نہیں جان سکتا کہ کس سزا یا انعام کا مستحق ہوں۔

جب تفتیشی مجسٹریٹ نے مجھے جانے کی اجازت دی تو مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا، کیونکہ اس کا مجھے دیکھنے کا انداز تمام تر مشکوک تھا۔ وہ مجھے آزاد ہونے کا فریب دینا چاہتا تھا تاکہ میرے برتاؤ اور افعال کی نگرانی کر کے وہ شہادت حاصل کر سکے جو میرا جرم ثابت کر دے، اس لیے مجھے اس سے ہزار گنا زیادہ محتاط رہنا ہوگا تاکہ اسے اس کا مقصد حاصل نہ ہو۔

ان چپلوں کی باقیات میں نے جمعرات کی رات کو پتھروں سے بھر کر دریائے نیل کی ایک قریبی نہر میں پھینک دیں۔ وہ کسی بھی وقت سطح پر آ سکتی ہیں، اور ان کے ساتھ میرا جرم بھی؛ یا ہو سکتا ہے کوئی مچھیرا انھیں نکال لے اور تفتیش دوبارہ شروع ہو جائے اور شہادتوں سے ثابت ہو کہ میری گردن پھانسی کے پھندے کی مستحق ہے، اس سچ سے قطع نظر جو کسی کو، خود مجھے بھی، معلوم نہیں۔

میں نے اپنی زندگی کے اس لمحے کو ہلاک کرنے کی کوشش میں بہت سے طریقے اختیار کیے، مگر آخرکار مجھے پتا چلا کہ میں دراصل اپنے آپ کو ہلاک کر رہا ہوں۔ مثلاً مجھے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں میرے جاننے والے ہمسایوں، دوستوں اور رشتے داروں پر مشتمل تھے — جیسے میرا عم زاد جس نے عدالتی تحقیقات کے دوران میرے لیے وکیل کرنے کی زحمت اٹھائی — اور میں نے ان سب سے ملنا جلنا ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا: میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے مردہ تصور کر لیں اور میں انھیں۔ ابتدا میں میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا، لیکن اس کے انجام نے مجھے حیران کر دیا، کیونکہ جب بھی میں نے کسی ہمسائے، دوست یا

رشتے دار سے تعلق ختم کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود کا ایک حصہ جھڑ گیا ہے، حتیٰ کہ آج میں اپنے آپ کو مشکل سے پہچان پاتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی میں نے فرار کی راہ اختیار کی، اپنے تعاقب کرنے والے سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے فرار ہوا۔ میرے پاس اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت برسوں تک میں ان لوگوں سے کترانے میں کامیاب رہا جو دیکھ کر یا سن کر میرے اس مقدمے سے واقف ہوئے تھے، لیکن چند سال پہلے ناگاہ میری اس تفتیشی مجسٹریٹ سے مڈبھیڑ ہوگئی، جو اَب، بظاہر، ایک معمر اور بھاری بھرکم جج بن چکا تھا۔ وہ عمدہ لباس پہنے اور آفٹر شیو کی مہک میں بسا ہوا، ٹرین کے کھانے کے ڈبے میں، میرے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خوش مزاجی سے پکار کر کہا، ''شیخہ مدیحہ کے مقدمے کا کیا بنا؟'' میں نے خود پر اور دوسروں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ان لفظوں کا مخاطب میں نہیں ہوں۔ لیکن اس کی نظروں میں واضح طور پر اشتباہ تھا اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ میرا وجود میرے چہرے پر درج ہے، میرے سفید بالوں، جھریوں اور ان مونچھوں کے باوجود جو میں نے بعد میں رکھ لی تھیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہوجائے، میں نے مضطرب ہوکر سرگوشی کی، ''مجھے نہیں معلوم۔''

وہ اپنی ہموار آواز میں بولتا رہا:

''اہم بات شہادت ہوتی ہے۔ جس بات سے تم نے تفتیش کے دوران انکار کیا، یا اگر تم اس کا اقبال بھی کر لیتے، وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اقبال جبراً بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، یا اس کا سبب کسی اَور شخص کو بچانے کے لیے خود کو قربان کردینے کا جذبہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے کسی مقدمے کے انجام کے لحاظ سے وکیل کی اہمیت ملزم سے زیادہ ہے؛ اس بات سے قطع نظر کہ اپنے خلاف پہلی گواہی خود ملزم کی ہو، وکیل شہادت قائم کرتا یا اسے غلط ثابت کرتا ہے۔ اہم بات...''

یوں جیسے ہم کسی کورس کا حصہ ہوں، میں جملہ پورا کرنے میں اس کے ساتھ شامل ہوگیا:

''... شہادت ہوتی ہے۔''

پھر میں نے ہمت کی اور چالاکی کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا:

''تو کیا وہ اب تک... شہادت کا انتظار کررہے ہیں؟''

''فائل اب تک موجود ہوگی، خواہ مقدمے کا تفتیشی مجسٹریٹ تبدیل ہو چکا ہو؛ کہیں سے کسی بھی وقت کوئی چیز آکر اس فائل میں اضافہ کرسکتی ہے۔''

میں اس کا جواب اس کے ان لفظوں کے ادا کرنے سے پہلے ہی جان گیا تھا؛ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ کوئی شخص کسی ایسی بات کی تصدیق چاہ رہا ہو جس سے وہ پہلے سے واقف ہو۔ اس کے باوجود اس کے

جواب نے مجھے خوف میں مبتلا کر دیا۔ اس لیے — اور اس ڈر سے کہیں وہ اپنی نغمہ سرائی دوبارہ شروع نہ کر دے — میں نے اس سے کوئی اَور بات دریافت کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ مجھ سے پوچھ گچھ جاری رکھنے پر مصر تھا: میں کہاں جا رہا ہوں؟ ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ اس سے یہ بات چھپالوں، مگر پھر ڈر ہوا کہ ہو سکتا ہے اس کا اسٹیشن میرے اسٹیشن کے بعد پڑتا ہو اور میرا جھوٹ کھل جائے اور مجھے یقینی بُرے انجام سے دوچار کر دے۔ اس لیے اپنے سفر کی منزل صحیح صحیح بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، جس کے بعد میں نے اس سے بات کرنے سے گریز کیا، اگرچہ وہ کچھ کچھ دیر کے بعد مجھ سے میرے مقدمے سے متعلق، یا غیر متعلق، بات پوچھ کر مجھے دہشت زدہ کرتا رہا۔

میں نے اپنے تمام پرانے دوستوں کو ترک کر دیا اور ان کے بجائے ایک واحد دوست کو اختیار کیا جو میرے ماضی کے اور میرے درمیان ایک دیوار قائم کر دے؛ میں اس میں پناہ لے سکوں اور خود کو چھپا سکوں۔ لیکن ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرے پرانے تفتیشی مجسٹریٹ سے واقف ہے، جو اس کا ہم سایہ بھی ہے اور رشتے دار بھی۔ ہوسکتا ہے وہ اتفاق سے اس کے سامنے میرا ذکر کر بیٹھے، جیسے اس نے اتفاق سے میرے سامنے اُس کا ذکر کر دیا تھا، اور اس طرح اس دیوار کو مسمار کر دے جس کے پیچھے میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا ہوں، اور میں اس شے کے پھندے میں آجاؤں جس سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہوں؛ اگر میری اس سے دوستی نہ ہوتی تو اس کی زبان سے میرا نام نکلنا ممکن نہ ہوتا۔ اس دن سے مجھے احساس ہو گیا کہ میرے دوستوں کی تعداد بڑھنے سے میرے مجرم ٹھہرنے کا امکان بھی بڑھ جائے گا، کیونکہ مجھے کیا معلوم ان میں سے کون میرے پرانے تفتیشی مجسٹریٹ سے رابطے میں ہو، یا ان میں کون کسی پرانے شبہے میں مبتلا ہو۔ ان تمام باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس حقیقت سے فرار ناممکن ہے کہ میری زندگی ہی میرا اصل سوہان ہے اور یہ کہ میرا وجود ہی میرے المیے کا لب لباب ہے۔

جس بات نے مجھے سب سے زیادہ مضطرب کیا وہ یہ تھی کہ جس وقت میں نے اپنے دوست سے تعلق قطع کرنے کا فیصلہ کیا اسی وقت اس نے میزبانی کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک روز اس نے مجھے اپنے گھر ایک بڑی دعوت میں بلایا اور اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اَور لوگوں کے علاوہ میرا پرانا تفتیشی مجسٹریٹ بھی دعوت میں شامل ہوگا۔ اِدھر میں دہشت سے لرز رہا تھا اور اُدھر میرا دوست بلاشبہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں بااثر لوگوں سے ملاقات پیدا کرنے اور خوب صورت، خوش لباس عورتوں اور مسرور، خوش ادا لڑکیوں کو دیکھنے، ان کی خوشبو کو محسوس کرنے اور ان کی ہنسی کے نشے میں مست ہونے کے خیال سے کس قدر خوش ہوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میرا دوست میرے چہرے پر آجانے والے یاس کے گہرے اور اتھاہ تاثر کو نہ سمجھ

سکا— اور ہر گز نہ سمجھ سکتا تھا۔ اپنے تردد کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں معذرت کرنے کی شائستگی یا ہمت پیدا نہ کر سکا۔ لیکن جب دعوت کا دن آیا تو میں نے خود کو یقین دلالیا کہ میں اس قدر بیمار ہوں کہ اپنے دوست کے گھر ہر گز نہیں جا سکتا، اس لیے میں اپنے کمرے میں پڑا رہا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ اپنے دوست سے ممکن حد تک گریز کروں گا کہ کہیں وہ نادانستگی میں مجھے اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال سے دوچار نہ کر دے۔ گو اس بار میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، مگر کسے معلوم کہ اگلی بار کامیاب ہوں گا یا نہیں۔ بلاشبہ میرا دوست میرے اس رویے کی کوئی توجیہہ نہ کر سکا اور اس بات نے اسے، شاید بہت دنوں تک، حیران رکھا۔

ایک دن میں نفسیات کے بارے میں لیکچر دے رہا تھا کہ ایک طالب علم کے اس سوال نے مجھے متعجب کر دیا: آیا ماں کے رحم میں لوٹ جانے اور دوبارہ جنین کی شکل اختیار کر لینے کی آرزو (کتاب کا صفحہ۶۱) ذات کا دفاع ہے یا ذات کا خاتمہ؟ اگرچہ میں اپنے بعض کینہ ور طالب علموں کے سوالوں پر شک کرنے کا عادی ہو گیا تھا، لیکن اس سوال نے میرے غمگین احساسات کو اس طرح بیدار کر دیا کہ میں تقریباً رو پڑا— خاص طور پر اس لیے کہ میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے مناسب طور پر تیار نہ تھا۔

جب انسپکٹر میرے بارے میں رپورٹ لکھنے آیا تو وہ اعتماد کے ساتھ ہنس رہا تھا۔ میں نے اس طالب علم کا سوال اس کے سامنے دہرایا:

''ماں کے رحم میں لوٹ جانے کی آرزو ذات کا دفاع ہے یا ذات کا خاتمہ؟''

اس کے چہرے پر اچانک افسردگی چھا گئی اور وہ سرگوشی میں بولا:

''دیکھو، میرے بیٹے، یوں تو یہ ذات کا دفاع ہے لیکن اس کا انجام ذات کا خاتمہ ہے۔''

وہ ایک ہم درد اور فہم رکھنے والا انسپکٹر تھا اور ان دوسرے انسپکٹروں اور ہیڈ ماسٹروں سے مختلف تھا جن کے ساتھ میں نے کام کیا تھا۔ شاید اس کی بات کتاب میں لکھی ہوئی معلومات کی نہیں بلکہ اس کے جھیلے ہوئے کسی تجربے کا پتا دیتی تھی۔ اس لیے میں نے اس بات کا کوئی تردد نہیں کیا کہ اس نے اپنی رپورٹ میں کیا لکھا ہوگا۔

اور اب جب رات آتی ہے تو میں اپنے کمرے کی کھڑکیاں احتیاط سے بند کر لیتا ہوں، دروازے کے سوراخ میں کنجی اٹکا دیتا ہوں، جیسے پہلے بھی کرتا تھا۔ میں کچھ نہیں سیکھتا اور اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ میں گھٹنے موڑ کر اس انداز میں سوتا ہوں جیسے بچہ ماں کے رحم میں سوتا ہے۔ میں رات سے، رات کی غم ناکی سے، کس قدر دہشت زدہ ہوں! میرے کمرے کی بے خوابی اور اضطراب کیسا ہولناک ہے!

یہ میرا قلعہ بھی ہے اور میرا جال بھی۔ اب میں اسے اپنے تمام حواسوں کی مدد سے پہچانتا ہوں: اس

کی دیواریں، کھڑکیاں اور اینٹوں کے فرش کا رنگ؛ اس کا وہ حصہ جو پہلے کی طرح ہے اور وہ جو بدل گیا ہے، اس کے چھت کے پاس والے کونے جن میں مکڑیوں کے جالے ہیں، فرش کے پاس والے گوشے جو گردآلود ہیں؛ بہت دنوں تک بند رہنے سے پیدا ہوجانے والی بو اور میرے کھانا پکانے کی بو، اور اس سے ملحق غسل خانے سے آنے والی بو۔ یہاں تک کہ میں اس کی دیواروں کے نچلے حصوں کا ذائقہ بھی جانتا ہوں: سفید، بھربھرا اور نمکین۔ دیواریں روز بہ روز پتلی ہوتی جارہی ہیں اور مجھے خوف ہے کہ ایک دن مجھے پتا چلے گا کہ یہ بالکل کھوکھلی ہوچکی ہیں، اور میرے تمام منصوبے بنیادوں تک مسمار ہوجائیں گے۔ اس کی آوازوں سے بھی میں پوری طرح آشنا ہوں: چوکنی، پراسرار آوازیں۔ جو بات مجھے دہشت میں مبتلا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آوازیں نامعلوم جگہوں سے اٹھتی ہیں۔ ان کی توجیہہ کرنے کی کوشش مجھے پُرسکون کردیتی ہے: شاید کوئی چوہا کوڑے دان میں خوراک کے ریزوں پر منھ مار رہا ہوگا یا کوئی لال بیگ غسل خانے میں خوشی سے مست ہو رہا ہوگا۔ پھر دوسری آوازیں ہیں، دور یا نزدیک کی، اوپر یا نیچے سے آتی ہوئی، جو رات کی تاریکی اور سکوت میں بڑھتی چلی جاتی ہیں، جفتی کرتی یا لڑتی ہوئی دو بلیاں، بھونکتا ہوا کتا، بڑھتا ہوا قدم، ٹوٹتی ہوئی چیزیں۔ جس طرح میں اپنے کمرے سے مانوس ہوگیا ہوں بالکل اسی طرح لگتا ہے یہ بھی میرا عادی ہوگیا ہے: میری دھڑکن جو تیز ہوتی ہے تو ڈھول کی دھمک جیسی ہوجاتی ہے اور جب دھیمی پڑتی ہے تو تقریباً رک جاتی ہے؛ میرا سانس جو تیز ہوتا ہے اور پھر سست ہوجاتا ہے؛ یہ کمرہ بھی میری بےخوابی اور میرے اضطراب کا شاہد ہے، اور اس کا کہ میں کام سے واپس آکر اس میں داخل ہوجاتا ہوں اور پھر اگلی صبح سے پہلے اس سے باہر نہیں نکلتا، اور اس کا بھی کہ نہ میں کسی سے ملنے جاتا ہوں اور نہ کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے۔

اور اس طرح، اپنی آزادی برقرار رکھنے کی خاطر، میں نے اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں۔ خود میں نے اپنے آپ کو قید کرلیا ہے تاکہ کسی اور کو یہ زحمت نہ کرنی پڑے، اور میرے اسم اعظم کا میرے ہاتھ میں ہونا اس سے بہتر ہے کہ یہ کسی اور کے ہاتھ، یا گرفت یا مٹھی میں ہو۔

پس نوشت:

اپنی تعلیم کی بدولت — اور بعض اوقات مشغلے کے طور پر — میں نے افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جہاں تک خود لکھنے کے تجربات کا تعلق ہے، وہ مجھ سے میرے پروفیسروں کی جانب سے کیے جانے والے مطالبوں یا ان خطوں تک محدود رہا ہے جو میں اپنے باپ کو، خدا اس کی روح کو سکون بخشے، لکھا کرتا تھا۔ تحریر کے باب میں یہی میرا کل تجربہ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں اس قصے کا موجد تو ہوں مگر مصنف نہیں۔ اس کا مصنف وہی شخص ہے جس کا نام عنوان کے ساتھ درج کیا گیا ہے، کیونکہ میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اپنے

خلاف جانے والے لفظوں کو تحریر میں لے آؤں جو شاید میری معصومیت کے گواہ ہوں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میرے جرم کی جانب اشارہ کرتے ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی عمر اور پتا نشان چھپائے رکھا ہے جبکہ میرا نام اور پیشہ فرضی ہے۔ اپنی ذات تک پہنچ پانے والے ان راستوں کو میں نے اسی طرح مسدود کر دیا ہے جس طرح دروازے کے سوراخ میں کنجی اٹکا کر اسے بند کر دیتا ہوں۔ میں افسانوں کا شائق نہیں ہوں، نہ مجھے عظمت کی جستجو ہے؛ جس شے سے بھی میرا انکشاف ہو سکے مجھے اس کے بارے میں دھڑکا لگا رہتا ہے، کیونکہ یہ کوئی شہادت بھی ثابت ہو سکتی ہے جو میرے خلاف کھلی ہوئی فائل میں اضافہ کر دے۔ اسکول کی تقریبوں میں میں اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر گنگ رہ جاتا ہوں جو تقریریں کر کے اور اپنے طالب علموں کی سرگرمیوں کی رہنمائی کر کے نمایاں ہونے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں، اور میں ترحم سے ان کی جانب اشارہ کرتا ہوں: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذات کو مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔ اس سبب سے میں جان بوجھ کر پچھلی صفوں میں بیٹھتا ہوں اور جب فوٹو گرافر آتا ہے تو احتیاط کرتا ہوں کہ اپنا چہرہ آگے بیٹھے ہوئے مرد یا عورت کی آڑ میں کر لوں تاکہ میری موجودگی کا نشان نہ رہے اور اسے کسی دن میرے خلاف شہادت کے طور پر پیش نہ کیا جا سکے۔ تاہم ان میں سے ایک تصویر کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اپنا چہرہ بہت واضح انداز میں چھپایا ہے اور کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر محسوس کر سکتا ہے کہ میں ڈھونڈ لیے جانے سے بچنے کی کوشش میں ہوں، اور یوں مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میرا چہرہ مجھے اشتباہ سے دوچار کر سکتا ہے تو اسے چھپانے کی کوشش اس سے بڑھ کر ایسا کر سکتی ہے۔ اس لیے میں نے خود کو دوسرے لوگوں کی آنکھوں، کانوں اور ناکوں سے بہت دور کر لیا، کیونکہ کسی وسیع اور پُر ہجوم مقام پر میرا موجود ہونا ہی میری ذات کا اعلان اور ان شبہوں کی بنیاد ہے جو اس اعلان سے جنم لیتے ہیں۔ اسی لیے کسی کیفے یا کلب میں بیٹھنے سے میں اضطراب اور گھٹن کا شکار ہو جاتا ہوں جہاں دھندلی نگاہیں مجھے ٹٹولتی اور میرا جائزہ لیتی ہیں، مجھ پر حملہ کر کے مجھے مفلوج کر دیتی ہیں، اور جہاں کوچہ گرد کان کسی اشتباہ یا نیم اشتباہ کے شکار کی تلاش میں ہیں، اور جہاں ہمیشہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو مجھے چھو کر یا سونگھ کر دریافت کر لیتے ہیں، جبکہ میں دوسروں کو باتیں کرتے، چیختے چلاتے، کھیلتے، تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے، پیتے پلاتے، کھاتے اور آتے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں اور خود سے سوال کرتا ہوں کہ ان میں سے کون سے ملزم ہیں اور کون سے گواہ، کون سے مجرم ہیں اور کون سے منصف، کون سے تفتیشی مجسٹریٹ اور استغاثے کے وکیل ہیں اور کون سے میری طرح ہیں — نہ ملزم، نہ معصوم اور نہ مجرم۔ اور اس طرح کامیابی اور شہرت اور ہر چیز جو لوگوں کے خیال میں خوشی کا باعث ہوتی ہے، میرے نزدیک شدید یاس اور اندوہ کا منبع ہے۔

ہر سال میں خود سے کہتا ہوں: ''اس سے پہلے کہ زندگی تیرے لیے مٹادی جائے، یہ تیری آخری

سالگرہ ہے، کسی تقریب یا رسم کے بغیر۔'' ہر مہینے میں خود سے کہتا ہوں: ''یہ تیری آخری تنخواہ ہے اس سے پہلے کہ تیری نوجوانی کی سزا کے طور پر تیری پختہ عمر کو فنا کر دیا جائے۔'' ہر ہفتے میں خود سے کہتا ہوں: ''یہ تیرا آخری حمام ہے، اس سے پہلے کہ تجھے اُس کا مجرم پایا جائے جس سے خود کو الگ کرنے کی تو سر توڑ کوشش کرتا رہا ہے اور جس میں انھیں لگتا ہے کہ تو اَور گہرا اتر گیا ہے۔'' اور ہر روز شیو کرتے ہوئے میں خود سے کہتا ہوں: ''یہ آخری صبح ہے جب تو اپنے کمرے کو دیکھ رہا ہے اس سے پہلے کہ وہ دروازہ توڑ کر تیری خلوت میں داخل ہو جائیں۔'' اور ہر سال اور ہر مہینے اور ہر ہفتے اور ہر روز میں خود کو موجود پاتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اپنے کمرے کی چار دیواری میں سانس لے رہا ہوں، اگر چہ اگلے لمحے، یا اس سے اگلے لمحے، اپنی تقدیر کی پیش گوئی کرنے سے بالکل قاصر ہوں۔ جب کبھی میں اپنی سالگرہ کرتا ہوں، یا تنخواہ وصول کرتا ہوں، یا حمام اور شیو کرتا ہوں، تو خود سے کہتا ہوں: ''اب تو اس لمحے کے استقبال کے لیے تیار ہے جو آ رہا ہے، اور نہیں آتا، مگر ضرور آئے گا۔'' اس طرح وقت کے ہر موڑ پر میرا خوف نئے سرے سے تازہ ہو جاتا ہے؛ نہ زنگ خوردہ ہوتا ہے اور نہ پھیکا پڑتا ہے۔

لیکن اگر چہ میں اپنے کمرے میں پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں، پھر بھی مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ میرا وجود، جس کی ابتدا پہلی سطر کے پہلے لفظ سے ہوئی تھی، اب کم و بیش اپنے انجام تک پہنچ رہا ہے... میں فقط ایک یاد بن گیا ہوں جو چند لمحوں کے لیے اپنا احساس کراتی ہے، جیسے کوئی زلزلہ یا ہوائی حملہ یا کسی سنگین جرم کی تفتیش، اور جلد یا بدیر زندوں اور مردوں کے ہجوم میں کھو جاتی ہے۔

پس نوشت:

میں خوف زدہ ہوں، اس لیے غیر موجود ہوں۔

یوسف شارونی

انگریزی سے ترجمہ: احتشام شامی

سزاے موت پانے والا آٹھواں آدمی

وہ جمعے کا دن تھا۔ مجوب صبح سے اپنے گھر کے باغیچے میں کام میں ڈوبا ہوا تھا، جہاں اس نے چیونٹیوں کا ایک بل دریافت کیا تھا۔ وہ چیونٹیوں پر پانی انڈیل کر انھیں ڈوبتے اور جان بچانے کی کوششیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی اس اچانک دریافت میں ایک عجیب وغریب لذت ڈھونڈ نکالی تھی۔ اپنے اردگرد ایک نظر دوڑانے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ باغیچہ چھوٹی بڑی کالی پیلی چیونٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ پوری صبح گلاس میں پانی بھر بھر کر چیونٹیوں پر ڈال کر ان کے جان بچانے کے طریقے دیکھتا رہا تھا اور ان کے فرار کے تمام راستے بند کرنے میں اسے ایک عجیب سا مزہ آرہا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس کی مشغولیت صرف اوپری تھی، کیونکہ اس کے اندر کی بہت گہرائی میں، ڈراؤنے احساسات اور جذبات کا ایک بھنور پڑا ہوا تھا۔

روزانہ کی طرح، کل وہ کورٹ میں تھا۔ اس کی گمبھیر، پاٹ دار آواز میں عدالت کے شروع ہونے کا اعلان سننے کے بعد جج حضرات آتے تھے اور پھر وہ نشہ بازوں، چوروں، قاتلوں، رنڈیوں اور معاشرے کے پست ترین افراد کو دی جانے والی سزائیں سنتا رہتا تھا۔ جب سے مجوب نے عدالت کے چوبدار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تھا، معاشرہ مسلسل، پچھلے پانچ برسوں کے ہر دن، اپنے ناسوروں سے پیپ بہانے میں مصروف رہا تھا۔ اور یہ معاشرے کا کتنا بڑا کمال تھا کہ اس نے مجوب کو کبھی بھی ایک جیسے دو مقدمے نہیں دکھائے، ہمیشہ اس کے ناسوروں سے کوئی نئی، عجیب و غریب کراہت انگیز چیز رستی رہی۔

ابھی کل ہی، اس سال میں ساتویں مرتبہ، اس نے کسی کو سزاے موت ہوتی سنی۔ اس کے لیے سزاے موت کا اعلان جج کے منھ سے نکلنے والے چند جملوں سے زیادہ کبھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، مگر کل

پہلی دفعہ اسے اس عجیب احساس نے آگھیرا کہ اسے بھی سزائے موت سنائی جا سکتی ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہی وہ آٹھواں آدمی ہو۔

جس آدمی کو سزائے موت سنائی گئی تھی وہ بتیس سال کا تھا، یعنی تقریباً اس کا ہم عمر۔ اس آدمی کے نقوش بہت حساس تھے، چہرے پر شرمیلا، دھیما تاثر، بالکل لڑکیوں کی سی نازک سی ناک اور شہد کے رنگ کی آنکھیں جو عدالت میں ہر طرف یوں دیکھتی رہتی تھیں جیسے فرار کا کوئی راستہ ڈھونڈ رہی ہوں یا پھر کسی مہربان کو جو اس اُفتاد میں اسے تسلی دے سکے۔ یہ اس مقدمے کی پانچویں اور آخری پیشی تھی۔ اس کے مجرم ہونے کے تمام شواہد اور ثبوت بالکل صاف اور واضح تھے۔ جب شوہر اندر داخل ہوا تھا تو اس نے اس نوجوان کو اپنی بیوی کے ساتھ بستر میں پایا تھا۔ جب شوہر نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تو نوجوان نے خنجر سے، جو اس نے کسی ایسے ہی موقعے کے لیے رکھا ہوا تھا، وار کر کے اس کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس تمام واقعے کے دوران وہ عورت چیخ چیخ کر اپنے شوہر اور عاشق سے فریاد کرتی رہی تھی۔ ایک دو محلے والوں نے جو عورت کی چیخیں سن کر آ پہنچے تھے، اس کو خنجر کا آخری وار کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بیوی نے عدالت کے سامنے اس کے ساتھ اپنے معاشقے کا اقرار کر لیا تھا۔ نوجوان نے پہلے پہل تو تمام باتوں کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی مگر پھر خون آلود کپڑوں، خنجر پر انگلیوں کے نشانات اور عینی شاہدوں کی گواہیوں کی موجودگی میں اسے اقرارِ جرم کرنا ہی پڑا تھا۔

مجوب کو حسنیہ کے ساتھ اپنی آج دوپہر کو طے شدہ ملاقات یاد آئی تھی۔ اگر کبھی اس کا باپ اس طرح کمرے میں آ گیا تو؟ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کٹہرے میں جج کے سامنے کھڑا ہونے والا آٹھواں مجرم ہو اور جج اسے سزائے موت کا حکم سنائے؟

جب دوپہر کو وہ تھوڑی دیر سو کر اٹھا تو اس کی عمر رسیدہ ماں مولیاں بیچنے والے سے جھگڑ رہی تھی۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مجوب روزانہ ذریب لین میں اپنی ماں اور محلے کی دیگر عورتوں کو مولیاں اور پھلیاں بیچنے والوں سے، اور اُم حسن سے جو تعمیہ بیچا کرتی تھی اور گلی کے مشرقی کونے پر رہتی تھی، بھاؤ تاؤ کرتے سنتا تھا۔ اس کے باوجود آج وہ غور سے اپنی ماں اور مولیاں بیچنے والے کے درمیان ہوتی بحث کو سننے لگا۔ اس کی ماں مولیوں کے چھ بنڈل دس ملیم میں خریدنا چاہتی تھی جبکہ ٹھیلے والا اپنی اونچی، غصیلی آواز میں انھیں بارہ ملیم میں بیچنے پر مصر تھا۔ اس کی ماں کا اصرار تھا کہ اس کو مولیاں تھوک کے بھاؤ ملنی چاہییں مگر وہ آدمی بھی ہر صورت میں دو ملیم فی بنڈل کمانا چاہتا تھا۔ اس جھگڑے نے اس کے اندر عجیب گنجلک جذبات کو جنم دیا تھا جن کی جڑیں اتھاہ گہرائیوں تک جاتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں — نفرت، تضحیک اور کراہت آمیز جذبات، جرم کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے، گلی کے کیچڑ کی گندگی کا احساس، مٹی کے ڈھیروں

کا، بچوں کی آنکھوں، ناک اور منھ کے گرد چکر لگاتی ہوئی مکھیوں کے غولوں کا، مکانوں کے اندر اور باہر کبھی نہ ختم ہونے والے جھگڑوں کا اور ڈراؤنے خوابوں کا احساس جو اس کے سینے اور روح پر صدیوں سے قبضہ کیے بیٹھے تھے۔

اسے حسنیہ سے اپنی طے شدہ ملاقات یاد آئی تھی۔ وہ کئی دنوں سے اس ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کو طے کرنے کے لیے اسے مہینوں پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اس کے نزدیک مرد صرف دو طرح کے ہوتے تھے — باعورت مرد اور بے عورت مرد — اور اس کے لیے دوسرے گروہ میں شامل ہونا سخت اذیت کا باعث ہوتا تھا۔ وہ مہینوں رات کو بھوکا سو سکتا تھا، مولیوں اور تعمیہ پر گذارا کر سکتا تھا مگر اس کی نفسانی بھوک ہمیشہ زندہ رہتی تھی۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جس میں آدمیوں کے درمیان کوئی انصاف، کوئی برابری نہیں تھی۔ پھر اسے کل سنائی جانے والی سزائے موت کا خیال آیا۔

اُم حسن کے پاس سے گذرتے ہوئے مجوب نے دیکھا کہ آج اس نے اپنی دکان پر ایک پرانا گندا سا طغرہ لگا رکھا تھا جس پر لکھا تھا: "یہ ہے جو میرے مالک نے مجھے دیا ہے"، اور پھر تعمیہ کی بو اس کے نتھنوں تک پہنچی تھی۔ وہ خود اپنے بچے محمد کو زور زور سے مارنے میں مصروف تھی۔ پے در پے پڑنے والی ضربوں کے درمیان بار بار اس بچے کی گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔

وہ گلیوں گلیوں، ایک راستے سے دوسرے راستے پر نکلتا ہوا بڑی سڑک پر آ پہنچا اور ٹرام کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سینہ خشک ٹھنڈی ہوا سے بھرا اور آنکھوں کو نرم و نازک، خوبصورت لباسوں والی لڑکیوں کے نظارے سے سیراب کرنے لگا۔ جب ٹرام پہنچی تو وہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس نے پائیدان پر قدم جما کر لوگوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ فرسٹ کلاس تک پہنچ گیا۔ اس ڈبے میں صرف ایک موٹا آدمی، سفید جیکٹ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کا سر گنجا اور ماتھے پر گوشت کا ایک چھوٹا سا گول گومڑا تھا۔ مجوب نے زور لگا کے سیکنڈ کلاس کا دروازہ کھولا اور لوگوں کے ہجوم میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ معجزاتی طور پر ایک بڑا سا آدمی، پسینے کی بدبو میں ڈوبا ہوا، اپنی سیٹ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ مجوب نے اس کی جگہ پر فوراً قبضہ کر لیا۔ اتفاق سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک دبلی پتلی نقاب پوش لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے کالے ملایہ کی تہوں میں سے اس کا نرم و گداز، گورا بازو جھانک رہا تھا۔ مجوب اپنے پہلو میں اس بدن کے نرم و گرم لمس سے پوری طرح باخبر تھا اور اس نے دھیرے دھیرے، بہت ہوشیاری کے ساتھ، اپنے بازو کو اس لڑکی کے بازو کے ساتھ رکھ کر اس سے مس کرنے کا طریقہ ڈھونڈ لیا۔ جب لڑکی نے اپنا بازو نہیں ہٹایا تو مجوب کو یقین ہو گیا کہ اس کو اس لمس پر کوئی اعتراض نہیں، اور کامیابی کے احساس نے اس کا مزہ دوبالا کر دیا۔

دوسری طرف ایک نوجوان اپنے کام کرنے والے کپڑوں میں، جو جا بجا تیل کے دھبوں سے اَٹے ہوئے تھے، شام کا اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ اس حقیقت نے کہ اس کا بازو لڑکی کے بازو کو چھو رہا ہے، محجوب کو اپنی روزانہ صبح کی عادت کے مطابق، جھانک جھانک کر اپنے ساتھ بیٹھے یا رش میں پھنسے ہوئے لوگوں کے اخباروں کی سرخیاں پڑھنے سے باز نہیں رکھا تھا۔

اس کی نظریں آخر کار ایک چھوٹی سی خبر پر ٹھہر گئیں، جس میں راس البار کی تزئین کے لیے مختص کی گئی سوا لاکھ پاؤنڈ کی رقم کا ذکر تھا۔ کیا ہو جائے گا اگر اسے صرف سو پاؤنڈ، فقط سو، اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے دے دیے جائیں؟ وہ شادی کر کے اپنے آپ کو ان خطرناک جنسی معرکوں سے دور رکھ سکتا تھا، جن سے نہ اس کی تسکین ہوتی تھی اور نہ علاج۔ اور کیا ہو جائے گا اگر وہ صرف پانچ سو پاؤنڈ ذریاب لین کو ٹھیک کرنے میں لگا دیں؟ وہ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ راس البار جایا کرتا تھا جب اس کو موسم گرما کے ایک تفریحی مرکز میں ڈھالا جا رہا تھا۔ اس کے خیال میں راس البار کو مزید ایک کوڑی کی بھی تزئین کی ضرورت نہیں تھی۔ جب کہ ذریاب لین کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔

اپنے خیالوں سے جاگتے ہوئے، اسے احساس ہوا کہ ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی ٹرام سے اترنے کے لیے اٹھ رہی ہے۔ اس دوران کنڈکٹر اور ایک جوشیلے نوجوان کے درمیان زوردار بحث شروع ہو گئی۔ آخر کار وہ ٹرام سے اتر کر حسنیہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ مین روڈ سے تنگ گلیوں کی طرف مڑا تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ واپس جا کر اپنے باغیچے میں چیونٹیوں پر پانی انڈیلے مگر اس دفعہ گرم کھولتا ہوا پانی۔ اب اس کے دل میں حسنیہ سے ملاقات جلد از جلد ختم کر کے اس نئے طریقہ کار کو آزمانے کی خواہش مچلنے لگی۔ پھر بھی وہ چلتا رہا اور چلتے چلتے علی چچا کے سامنے سے گذرا، جو حسنیہ کا باپ تھا۔ وہ باڑھ کے ساتھ اپنی معمول کی جگہ پر بیٹھا، ایک پرانے جوتے میں پیوند لگانے میں مصروف تھا۔ اس کے پاس اسی محلے کا ایک آدمی کھڑا تھا جو اپنا جوتا بننے کے انتظار میں دکھائی دیتا تھا۔ اس دفعہ محجوب نے علی چچا کو غور سے دیکھا تھا۔ داڑھی، دبلا پتلا جسم، سفید بال۔ ہاں، اگر وہ حسنیہ کے ساتھ بستر میں پکڑا جاتا تو علی چچا کو قتل کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ پھر اسے ذلت، تضحیک اور کراہت کے احساس نے گھیر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے وسیع اور خوفناک احساسِ محرومی نے جو آدمی کو کسی بھی جرم یا پاگل پن کی طرف دھکیل سکتا ہے۔

اس نے دیکھا وہ دروازے سے لگی ایک فراخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خواہش اور چہرے پر درد، غربت اور احساسِ محرومی تھا۔ گھر کے اندر سے گندگی میں بسی بدبو کا جھونکا آ رہا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی محمود اپنے پیچھے پتلے پیلے نخلے کی لمبی لکیر چھوڑتا مٹی میں رینگ رہا تھا۔ حسنہ کئی منٹ غائب رہنے کے بعد واپس آ کر ایک کاغذ سے فرش صاف کرنے لگی۔ اس کے بال ملائم اور

گھنے تھے اور جب وہ جھکی تو اس کے گول گول کولھے، پھٹے ہوئے تنگ لال لباس میں قید لگ رہے تھے۔
جب حسنیہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے حسنیہ کو اپنے نزدیک بٹھالیا اور اس کو کل سنائی جانے والی سزائے موت کی کہانی سنانے لگا جیسے اسے ڈرانا چاہتا ہو، مگر حسنیہ اس کے اور نزدیک آ کر ایک دلفریب انداز میں اس کے بوسے کا انتظار کرنے لگی۔

وہ پانچ سال سے اس قسم کے معر کے سرانجام دیتا چلا آیا تھا مگر وہ کبھی بھی کسی کو حقیقتاً اپنا بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسے راس البار کا خیال آیا؛ اگر وہ اس وقت وہاں کی کسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہوتا تو اسے کیسا لگ رہا ہوتا؟ مگر ایسی چیزیں اس کے لیے، جس کی زندگی کی تبدیلی، کسی ترقی یا حرکت سے عاری تھی، ناممکنات میں سے تھیں۔ وہ پانچ سال سے اس عدالت میں چوبدار تھا اور اس کو مستقبل میں کسی بہتری کی کوئی امید نہیں تھی۔ اور پانچ سال سے — یا کسی نامعلوم تاریخ سے — ذریاب لین اپنے گرد و غبار، بھنبھناتی مکھیوں، اور مکینوں کی لڑائیوں سمیت، ویسی کی ویسی تھی۔ اور اس کا رات کے اندھیروں میں، چوروں کی طرح حسنیہ جیسے جسموں سے لطف اندوز ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسرے لوگ گھر بار، بچوں والے تھے۔ اس کے پاس کیا تھا؟ وہ صرف چکروں میں گھوم رہا تھا — نہ آگے بڑھتا تھا، نہ ترقی کر پاتا تھا۔

حسنیہ اب تک اس کے بدن پر اپنے ہاتھ پھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اس کی تھکی ہوئی درد بھری آنکھوں اور اپنے سامنے موجود خواہش سے لرزتے بدن پر ایک نظر ڈالی۔ اپنے ذہن میں ذریاب لین والے گھر کے باغیچے میں چیونٹیوں پر گرم پانی انڈیلنے کا تصور کرتے ہوئے اس نے جلدی سے حسنیہ کو زور سے اپنے سینے سے لگایا، اس کے ماتھے پر ایک بوسہ چسپاں کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

یوسف شارونی

انگریزی سے ترجمہ: احتشام شامی

آپ کا تابعدار خادم

کچھ روز پہلے، محمود زعتر صاحب کے ساتھ، جو ایک سرکاری ملازم تھے، ایک بہت اہم — بلکہ مضحکہ خیز — واقعہ پیش آیا۔ اٹھاون سال کی عمر ہونے کے باعث ان کی ریٹائرمنٹ میں صرف دو سال باقی رہ گئے تھے۔

اس امر کے باوجود کہ ان کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی اور وہ ایک نچلے درجے کے سرکاری ملازم تھے، وہ اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کا ایک بیٹا ڈاکٹر بن رہا تھا، دوسرا وکیل اور تیسرا انجینئر۔ اسی طرح سے انھوں نے — بلکہ ان کی بیگم نے — اپنی بیٹیوں کی شادیاں بھی اچھے گھروں میں کرادی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے، اپنی کم آمدنی کے باوجود، اور رشوت لیے بغیر، ایک تین منزلہ بلڈنگ بنوائی تھی جس کی ہر منزل پر دو دو فلیٹ تھے۔ انھیں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا آدمی ضرور مل جاتا تھا جو انھیں کم سود پر، یا بلا سود، ایک اَور منزل کی تعمیر کے لیے قرض دینے پر رضامند ہوجاتا۔ اس قرض کو اتارنے کے بعد وہ ایک منزل کا مزید اضافہ کرنے کے لیے اَور رقم قرض لے لیتے تھے۔ اب وہ اور ان کی بیگم درمیانی منزل میں رہتے تھے جبکہ باقی تمام فلیٹ انھوں نے کرائے پر اٹھادیے تھے۔

بیٹوں کے گھروں کے نئے اور عمدہ فرنیچر کے مقابلے میں اب ان کے فلیٹ کا فرنیچر بوسیدہ اور گھسا پٹا لگتا تھا۔ دعوتوں اور دوسرے خاص خاص موقعوں پر سارے بیٹے اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ان کے فلیٹ پر جمع ہوجاتے تھے۔ اس فلیٹ کو وہ سب مذاقاً ''بڑا گھر'' کہا کرتے تھے۔ مگر ان میں سے کسی کو کبھی اس بوسیدہ فرنیچر کو تبدیل کروانے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

زعتر صاحب، دل کے اچھے ہونے کے باوجود، ایک اعصابی اور غصیل طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے نہ کبھی کسی کا مذاق اڑایا تھا اور نہ ہی ان کو کسی سے اپنا مذاق اڑوانا پسند تھا۔ ان کی شادی شدہ

زندگی بھی بحرانوں سے خالی نہیں رہی تھی حالانکہ وہ ہمیشہ ایک کامیاب شادی شدہ زندگی کے تمام ظاہری تقاضے پورے کرتے آئے تھے۔ ان کی بیگم، عواطف، ایک خاموش طبع خاتون تھیں اور اپنے کام سے کام رکھنا اور بچوں کی پرورش میں مصروف رہنا پسند کرتی تھیں۔ گھر واپسی پر اکثر ان کے شوہر کے چہرے پر ناراضگی کے آثار موجود ہوتے تھے جن سے ان کو پتا چل جاتا تھا کہ اب ایک طوفان برپا ہونے والا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے شوہر چاہتے ہیں کہ وہ ان سے پوچھیں کہ کیا بات ہے۔ جب وہ مارے باندھے ان سے پوچھتیں تو واقعات کی تفصیل بتاتے بتاتے وہ زیرلب گالیاں اور دھمکیاں دینے لگتے۔ ان کو سمجھانے کی کوشش میں وہ خود ان کے غضب کا نشانہ بن جاتیں حالانکہ وہ ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی زندگی میں آنے والے غصے کے ان دوروں کے درمیان ان کی بیگم ہی تھیں جو ان کو ٹھنڈا رکھتی تھیں، ورنہ اگر ان کی بیگم کا رویہ حقیقت پسندانہ نہ ہوتا تو وہ غصے میں نہ جانے کیا کر بیٹھتے۔ طوفان کے تھمنے کے بعد ان کو جلد ہی بیگم کے الفاظ یاد آنا شروع ہوجاتے اور آخرکار ان کو بیگم کی باتوں کا قائل ہونا ہی پڑتا تھا۔ پھر کچھ دن پہلے وہ واقعہ رونما ہوا جس نے انھیں ہلا کر رکھ دیا اور ان کی پوری جمی جمائی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا۔

زعتر صاحب کی اہلیت اور محنت کے باوجود ان کی واجبی تعلیم ان کے اپنے محکمے میں اعلیٰ عہدوں پر تقرری کی راہ میں حائل رہی تھی۔ آج سے دس سال پہلے ہی وہ اس عہدے پر پہنچ چکے تھے جہاں تک ان کی تعلیمی سطح والا آدمی زیادہ سے زیادہ ترقی کرسکتا تھا۔ لہٰذا اب وہ صرف وقت کاٹنے میں مصروف تھے جبکہ ان کے اردگرد ان کے بیٹوں کے ہم عمر نوجوان ترقی کرتے ہوئے انھیں پیچھے چھوڑتے جارہے تھے، بلکہ ان میں سے کچھ تو ان کے اپنے افسر بھی بن چکے تھے۔

اپنے بچوں کی صورت میں نہ صرف ان کے دل کو تسلی حاصل ہوتی تھی بلکہ ان کو ایک ہتھیار بھی میسر آجاتا تھا، جب وہ بہت آرام سے اپنے باس کو جتاتے تھے کہ ان کے بیٹے اس کے ہم پلہ عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کی بلڈنگ بھی ان کے لیے اشک شوئی کا ایک ذریعہ اور ساتھ ساتھ ایک ہتھیار تھی کیونکہ وہ اپنے نوجوان باس کو باتوں باتوں میں اس بات کا احساس دلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے کہ ان کی جائیداد سے ہونے والی آمدنی اس کی تنخواہ سے زیادہ ہے۔ گویا یہ اس طرح تھا کہ جیسے وہ پورے محکمے میں ہر کسی پر یہ واضح کردینا چاہتے تھے کہ اگر کبھی یہ نوکری ان کے لیے ذلت کا باعث بنی تو ان کے بیٹے اور جائیداد آرام سے اس کی کمی پوری کرسکتے ہیں۔

کام پر وقتاً فوقتاً پیش آنے والی مشکلات کے باوجود، جو کبھی ان کی اور ان کے باس کی عمروں کے تفاوت، کبھی ان کی غصیلی طبیعت اور کبھی ان کے باس کے پُرغرور رویے کی وجہ سے ہوتی تھیں، انھوں نے

کبھی بھی اس نوکری کو چھوڑنے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ انھیں ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس نوکری ہی کی وجہ سے ان کی زندگی بامعنی ہے جس کی جگہ نہ ان کے بچے لے سکتے تھے نہ ان کی بلڈنگ۔ یہ احساس ریٹائرمنٹ کے نزدیک آتے آتے اور بھی تقویت پکڑ گیا تھا، ایسے جیسے وقت ان کو ایک اتھاہ گہرائی کی جانب دھکیل رہا ہو، جیسے نوکری کے دوران برسوں سے جاری بلندیوں کی جانب سفر ختم ہوجائے گا اور وہ یکا یک، ہمیشہ کے لیے، زمیں بوس ہوجائیں گے۔ پھر وہ سانحہ ہوا جو ان کی زندگی میں کسی بھی دوسرے واقعے سے زیادہ اذیت ناک ثابت ہوا۔

محمود زعتر صاحب کا بنیادی کام محکمہ جاتی مراسلوں کے جوابات بھیجنا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس نوکری کے لیے پچھلے بیس سال سے وقف کر رکھا تھا جس کے دوران وہ مصر کے سب سے بالائی علاقے سے لے کر سب سے زیریں علاقوں میں اور محکمے کے ہر شعبے میں کام کر چکے تھے۔ کنعان میں تعیناتی کے بعد انھیں فائلنگ کا کام ملا تھا، جس کے دوران وہ کبھی موصول شدہ اور کبھی بھیجی جانے والی ڈاک پر کام کرتے رہے تھے۔ ان کے سوئز تبادلے کے وقت یہ پتا چلا تھا کہ وہاں محکمۂ مالیات میں ایک آدمی کی ضرورت ہے، لہٰذا ان کو وہاں بھیج دیا گیا۔ اور ان کے ذمے ٹھیکوں کے انتظامات، ان کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات، اور ان کا حساب کتاب لگایا گیا۔ پھر کچھ عرصے کے لیے انھوں نے فیوم میں شعبۂ افرادی قوت میں کام کیا۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے خوشگوار دور تھا کیونکہ ان کو لوگوں کی ذاتی فائلیں دیکھنے اور ان کے ایسے راز دریافت کرنے میں، جس کا کسی اور کو علم نہ ہوتا تھا، بہت مزہ آیا کرتا تھا۔ جیسے مثال کے طور پر ایک اونچی ناک والے مینیجر کا باپ — جیسا کہ اس کے پیدائشی سرٹیفکیٹ میں درج تھا — ایک معمولی چپراسی تھا۔ جس دن انھوں نے یہ اہم راز پڑھا تھا ان کے جذبۂ انتقام کو ایک خوشگوار تسکین پہنچی تھی۔ ان پر یہ راز بھی کھلا تھا کہ ان کے ایک اور بڑے افسر، جو بہت سخت گیر تھے، بہت پہلے جب وہ گوداموں کے شعبے میں تعینات تھے، ایک مرتبہ اپنی پندرہ دن کی تنخواہ لاپرواہی یا بے ایمانی کے الزام میں — اور خدا ہی جانتا ہے کہ کیا سچ تھا — کٹوا چکے تھے۔ اس کے بعد زعتر صاحب محکمے کی اسکندریہ شاخ کے ٹائپنگ کے شعبے میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد آخر کار قاہرہ میں ڈائریکٹر کے سکریٹریٹ میں تعینات ہوئے تھے۔ وہاں پر ان کی ذمے داری محکمہ جاتی مراسلت کے جوابات تحریر کرنا تھا جو کہ وہ کبھی اپنے افسروں کی ہدایات کے مطابق اور زیادہ تر اپنے طور سے کرتے تھے۔ اور آخر حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اس کام میں اپنے افسران سے زیادہ طاق تھے کیونکہ افسروں کے تو تبادلے اور تقرریاں ہوتی رہتی تھیں جبکہ وہ ان کے آنے سے پہلے اور جانے کے بعد بھی وہیں موجود رہتے تھے۔ افسران اپنی ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اجنبیوں کی طرح وہاں سے گذر جاتے تھے۔ ابھی وہ بمشکل کام کی الف بے ہی سیکھ پاتے تھے کہ ان کی جگہ کوئی اور

لے لیتا تھا جبکہ زعتر صاحب، اپنے شعبے کی بوسیدہ ڈیسکوں کی طرح، ہر آنے جانے والے افسر کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔

کبھی کبھی تو وہ دل میں دس دس خط لکھ ڈالتے تھے اور کبھی ان کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اپنے طویل تجربے کے باوجود وہ بہت عرق ریزی کے بعد ایک ایک لفظ لکھتے، ہر خط کا مسودہ ایسے تیار کرتے جیسے پہلی مرتبہ یہ کام کر رہے ہوں، ہمیشہ حد درجہ محتاط کہ ان کے لکھے ہوئے خط اپنی مثال آپ ہوں، کبھی نہ ایک لفظ کم ہو نہ زیادہ اور ہر ایک بالکل واضح اور غیر مبہم، بالکل صحیح صحیح معنوں کے ساتھ ہو۔ وہ ہر خط بار بار لکھتے جب تک کہ پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں۔ پھر وہ خط ڈائریکٹر جنرل صاحب کے نام کے ساتھ ارسال کیا جاتا تھا جبکہ زعتر صاحب اپنی ڈیسک کے پیچھے دبکے بیٹھے رہتے تھے جیسا کہ جنگ میں حصہ لینے والا سپاہی گمنام رہ جاتا ہے جبکہ فتح کا سہرا ہمیشہ کسی ایسے جرنیل کے سر باندھ دیا جاتا ہے جس نے کبھی میدان جنگ کی شکل بھی نہیں دیکھی ہوتی۔

سکریٹریٹ میں لکھے جانے والے خطوط پر افسران کے دستخطوں کا ایک لمبا سلسلہ چلتا تھا، ہر ایک افسر کے اوپر اس سے بڑا افسر، جیسے کوئی وسیع اہرام تھا جس میں سب سے نیچے محمود زعتر اور ان کے ساتھی اکڑوں بیٹھے تھے جبکہ ان کے افسر کے افسر کے افسر سب سے اوپر عرش خداوندی کے بالکل ساتھ براجمان تھے۔ ان میں سے چند افسران خطوط کو پڑھے بغیر صرف ان کو دبائے بیٹھے رہنے میں دلچسپی رکھتے تھے تاوقتیکہ ان کے دستخط اس پر جلوہ گر نہ ہولیں۔ دوسرے، حسن شدید صاحب کی طرح، جو کہ براہ راست ان کے افسر تھے، خط کا ایک ایک لفظ بغور پڑھتے تھے، کہ کسی بھی جملے، لفظ، حتیٰ کہ حرف، میں غلطیاں پکڑ کر اسے دوبارہ ٹائپ کروانے کے لیے لوٹایا جاسکے۔ لیکن جہاں تک محمود زعتر صاحب کے لکھے ہوئے خطوط کا تعلق تھا ان کے ساتھ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ سارے دفتر میں ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ زبان و بیان کی غلطیاں نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے ساتھی اکثر صرف و نحو کے معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہتے تھے۔ شاید ان کی اس زبان دانی کا سبب ان کے والد شیخ زعتر کی جامعۃ الازہر کی تعلیم تھی اور والد نے ان کو بچپن ہی میں قرآن حفظ کرانے پر خصوصی توجہ دی تھی۔ شیخ زعتر کے پاس اسلامی فقہ اور شریعت کی چند کتابیں بھی تھیں حسن کو ان کے بیٹے نے جوانی کے دنوں میں، نوکری اور بیوی بچوں میں مصروف ہونے سے پہلے، پڑھ رکھا تھا۔ یہ کتابیں آج بھی، جبکہ وہ ان کے مضامین کے بارے میں سب کچھ بھول چکے تھے، ان کو غلطیوں سے بچنے میں مدد دیتی تھیں۔ جب ان کے بیٹے عباس کی اسوان میں تقرری ہوئی اور ان کے درمیان خطوط کا سلسلہ شروع ہوگیا تو وہ اپنے خطوں میں پورے پورے پیراگراف اپنے بیٹے کی گرامر کی غلطیوں کو درست کرنے میں صرف کر دیتے تھے۔ ان کے بیٹے کے بھی ان کے خطوط میں کوئی ایک بھی

گرامر کی غلطی پکڑنے کی پوری کوشش کی مگر ایسی کوئی غلطی ہوتی بھی تو عموماً محض قلم کے بہکنے کا نتیجہ ہوتی۔ غرض یہ کہ باپ بیٹے کے درمیان ایک دوستانہ مقابلہ پروان چڑھنے لگا۔ ان تمام باتوں نے محمود زعتر صاحب کے اندر اپنی اہمیت کا اور ایک طرح کی برتری کا احساس پیدا کیا جس کا دفاع وہ ہر کسی کے سامنے کرنے کو تیار تھے۔ پھر وہ سانحہ پیش آیا جو محمود زعتر صاحب کے نزدیک ان کی انا پر ایک خطرناک اور حقیقی حملہ تھا۔

اس صبح زعتر صاحب روزمرہ کی طرح گھر سے نکل کر دفتر کی طرف روانہ ہوئے تو وہ منھ ہی منھ میں اپنے آپ سے کہتے جا رہے تھے، ''اے خدا جو کچھ ہو اس میں بہتری ہو... اے خدا جو کچھ ہو اس میں بہتری ہو...'' حالانکہ انھیں خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کس چیز سے خوفزدہ ہیں اور کس بات میں خدا سے خیریت کے طالب ہیں۔

گذشتہ روز ان کا اپنی بیگم سے اتنا زبردست جھگڑا ہوا تھا کہ انھوں نے اس طویل رفاقت کے باوجود انھیں طلاق دینے کے بارے میں سوچا تھا۔ ان کو ہوٹل میں دوستوں کی محفل سے واپس آتے آتے دیر ہو گئی تھی۔ وہ ایک سرد رات تھی اور انھوں نے ہوٹل جاتے ہوئے اپنے ساتھ اوورکوٹ بھی نہیں لیا تھا کیونکہ موسم نے رات کے اس قدر سرد ہونے کا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنی بیگم کو سوجے ہوئے منھ کے ساتھ اپنا منتظر پایا اور انھیں اس عمر میں اپنی صحت کا خیال نہ رکھنے کے بارے میں سرزنش سننے کو ملی۔ انھوں نے غصے میں بیگم کو جواب دیا تھا، ''ہمیشہ یہی ہوتا ہے... میں اچھے خاصے موڈ میں خوشی خوشی اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گذار کر جیسے ہی اس گھر میں قدم رکھتا ہوں، مجھے جلی کٹی باتیں اور طعنے تشنے سننے کو ملتے ہیں۔ خدا کا واسطہ ہے، یہ کیسا گھر ہے!''

''بات صرف اتنی ہے کہ میں تمھارے اور تمھاری صحت کے بارے میں پریشان ہوں۔ تمھیں خوامخواہ مجھ سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''تمھارے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ موجود ہوتا ہے۔ جب ہمارے بچے نہیں تھے تو تم کہا کرتی تھیں کہ میں تمھیں اکیلا چھوڑ کر اپنے دوستوں میں بیٹھا رہتا ہوں، اور جب گھر بچوں سے بھرا ہوا تھا تب تم کہا کرتی تھیں کہ میں بچوں کو تمھاری جان عذاب میں کرنے کے لیے تم پہ چھوڑ جاتا ہوں۔ اور اب تم میری صحت کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔''

''اچھا تو تمھیں ایک ہفتہ پہلے کھانسی نہیں ہو رہی تھی اور تم خود نمونیہ ہو جانے کے بارے میں فکرمند نہیں تھے؟''

''تمھاری احمقانہ باتوں سے میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ جیسے میں ابھی تک کوئی چھوٹا سا بچہ

ہوں۔ شادی سے پہلے اگر میں دیر سے گھر آتا تھا تو میری اماں پریشان، میرے انتظار میں جاگ رہی ہوتی تھی۔ میں نے ان پابندیوں سے بچنے کے لیے شادی کی تو پتا چلا کہ تم جس طرح سے میرے اوپر پابندیاں لگاتی ہو وہ اور بھی دماغ خراب کر دینے والی ہیں۔''

''خدا کا واسطہ ہے چلاؤ نہیں، پڑوسی سن لیں گے۔''

''تم ہمیشہ یہی کہتی ہو۔ بات کو پلٹتی ہو۔''

''خدارا، چلاؤ مت۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔''

''تم مجھے بھڑکا کر چاہتی ہو کہ میرا دماغ خراب نہ ہو۔ قسم خدا کی، کمال ہے۔''

''ایسا لگتا ہے کہ تم بڑھیا گئے ہو اور تم نے...''

''زیادہ زبان چلا کر مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اچھا سب میرا قصور ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہی تھی...''

''بک بک بند کرو۔ تمھارے ساتھ زندگی اب ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ میں تمھارے ساتھ اب ایک دن بھی اور نہیں رہنا چاہتا۔'' آخر کے جملے دونوں کے چلاّنے کے درمیان آپس میں ایسے مل گئے تھے جیسے چیخنے کے کسی مقابلے کے دوران ہوتا ہے۔ ان کی آوازیں ایسے گڈ مڈ ہوگئی تھیں کہ دونوں نے ایک دوسرے کی بات بالکل نہیں سنی تھی۔ اس طوفان کے بعد عواطف سسکیوں اور رونے کے بیچ بیچ مدھم آواز میں دہرائے جا رہی تھی: ''تو یہ میرا انعام ہے... یہ جو آج تم سے مجھے سننے کو ملا ہے۔'' زعتر صاحب کو محسوس ہوا کہ وہ ان کے آنسوؤں کے سامنے دھیمے پڑتے جا رہے ہیں مگر انھوں نے بیگم کو منا لینے کی خواہش کو دبائے رکھا اور کھانا کھائے بغیر ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ (دراصل انھوں نے ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ روٹی اور پنیر کا ایک دور چلا لیا تھا۔) لیٹنے کے بعد انھوں نے بیگم سے علیحدگی کے طریق کار پر غور کرنا شروع کیا اور بیگم کو گھر سے نکال کر کسی بیٹے کے ہاں بھیجنے کے بارے میں سوچتے رہے۔ بیٹے کبھی بھی یہ بات نہیں مانیں گے اور ان کے لیے مشکلات پیدا کر کے انھیں اپنی ماں کو واپس لینے پر مجبور کر دیں گے۔ (وہ دن لد گئے جب ان میں سے کسی کو چوں کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔) اس سے بہتر یہ تھا کہ وہ خود کہیں دور چلے جائیں، مثلاً کسی ہوٹل میں، اور جاتے جاتے اپنے الوداعی خط میں گھر چھڑوانے کا الزام بیگم کے سر ڈالتے جائیں۔ پھر انھوں نے اس خط کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ وہ اس میں کیا لکھیں گے، ابتدا میں بیگم کو کیسے مخاطب کریں گے اور اختتام کیسے ہونا چاہیے جو کہ اس طرح کے خطوط کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔

کسی چھوٹے بچے کی طرح ان کے رات کو جاگتے میں دیکھے ہوئے خواب، دن کی روشنی کے ساتھ

ہی دھواں بن کر اڑ گئے۔ بیگم کو معمول کے اہتمام کے ساتھ ناشتہ تیار کرتا دیکھ کر انھیں اپنے رات کے رویے پر شدید پشیمانی ہوئی اور اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ان کی زندگی کا ایک بنیادی جزو بلکہ ایک ایسا حصہ ہیں جس سے وہ کسی طرح بھی جدا نہیں ہو سکتے۔

پھر جب وہ کام پر روانہ ہوئے تو ایک عجیب سا اداس خیال انھیں تنگ کر رہا تھا اور وہ اس سے چھٹکارا پانے کی ناکام کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اچانک زعتر صاحب کو اس حقیقت کا احساس ہوا تھا کہ اتنی عمر کا ہونے کے باوجود، ساری زندگی انھیں اپنی بیگم کے علاوہ کسی اور عورت کے بدن سے آشنائی حاصل نہیں ہو پائی تھی، نہ شادی سے پہلے اور نہ شادی کے بعد۔ جس طرح کسی کو گناہ کی زندگی گذارنے پر پشیمانی ہوتی ہے، زعتر صاحب کو اپنی زندگی کے اس قدر پاک بازی سے گذرنے کا شدید ملال ہوا، جس نے انھیں زندگی کی ان راحتوں سے محروم رکھا تھا جن کا اب وقت نکل چکا تھا۔ انھیں اس خیال سے بھی اذیت ہوئی کہ وہ ایک دادا بن چکے ہیں اور اب ان کے بال سفید اور چہرہ جھریوں سے پُر ہے۔ ان کی بیگم کا جسم بھی اب ڈھیلا پڑ چکا تھا، چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور بال سفید ہو چکے تھے۔ درحقیقت بیگم نے اپنے بدن سے لطف اندوز ہونا کب کا چھوڑ دیا تھا۔ زعتر صاحب کے اردگرد ہر چیز اب پرانی اور بوسیدہ ہو چکی تھی سوائے عورت کی خواہش کے، جو اَب بھی جوان اور بھرپور تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کل رات ہونے والا جھگڑا اس احساس کا باعث ہو، یا پھر ہوسکتا ہے کہ ان پر اچانک آشکار ہونے والا اپنے نوجوان دل اور ظاہری بڑھاپے کے درمیان تضاد، ان پشیمانی کے دوروں کا سبب رہا ہو۔

اپنی نوجوانی میں انھوں نے بھی اپنے حصے کے عشقیہ کارنامے سرانجام دیے تھے۔ ایک دفعہ محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ، ایک دفعہ ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ اور تیسری مرتبہ اپنی منگیتر کے ساتھ، جس نے بعد میں کسی اور سے شادی کر لی تھی (آخری دونوں معاملے بیک وقت چلے تھے)۔ مگر ان تمام معرکوں میں بات کبھی ہاتھ پکڑنے یا زیادہ سے زیادہ ہونٹوں کو چھو لینے سے آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔ ان کی تشنگی اور بھوک کو ہوا دینے کے بعد، ان سب نے ان جذبات کو آسودہ کرنے سے انکار کر دیا تھا جو انھوں نے بھڑکائے تھے۔ اس صبح انھیں یہ احساس بھی ہوا، جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، جیسے اپنی بیگم کے ساتھ بھی، تمام بچوں کے ہونے کے باوجود، وہ کبھی ہاتھوں اور ہونٹوں کو چھو لینے سے آگے نہ بڑھ پائے ہوں؛ جیسے وہ عورت کے سپردگی پر آمادہ بدن کی نرمی اور گرمی اور اس کے سربستہ رازوں اور پوشیدہ خزانوں کے معاملے میں اب تک ایک ناتجربہ کار نوجوان ہوں۔

صبح رات جتنی ہی سرد تھی، بلکہ بارش کے بھی آثار تھے۔ محمود زعتر صاحب، شہر کے اَور باسیوں کی طرح، موسم کے گرم وسرد ہونے کے سوا، قدرت سے بالکل بے خبر رہتے تھے۔ عمارتوں، ٹریفک، لوگوں اور

ان کی اداس گہری سوچوں نے ان سے اس لطف کو چھپالیا تھا۔

اور تب اچانک وہ احمقانہ واقعہ پیش آیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے (وہ کبھی کبھار ہی سگریٹ پیتے تھے اور کبھی بھی خرید کر نہیں پیتے تھے) جب چپراسی نے ان کو اطلاع دی تھی کہ شدید صاحب ان کو یاد کر رہے ہیں۔ بقیہ کی سگریٹ، ایش ٹرے میں رکھنے اور اپنی جیکٹ درست کرنے کے بعد وہ اپنے دھویں، میزوں، اور دفتر کے لوگوں سے بھرے کمرے سے نکل کر اپنے باس کے وسیع، پُرسکون اور آرام دہ آفس میں داخل ہوے۔ وہ ان کی میز کے پاس کھڑے فون پر جاری گفتگو کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے، جو لطیفوں اور قہقہوں سے بھرپور تھی۔ شدید صاحب نے ایک شاندار امریکی چشمہ لگایا ہوا تھا جو گفتگو کے دوران ان کی ناک پر اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا۔ وہ اس چشمے کو پرستائش نظروں سے دیکھ رہے تھے، خصوصاً اس کی چمک کو، جیسے اس کے مالک نے ابھی ابھی اس کو پانی میں ڈبو کر نکالا ہو۔ فون پر گفتگو ختم کرنے کے بعد، شدید صاحب نے ایک خط اٹھایا جو کہ زعتر صاحب نے کل لکھا تھا اور ساتھ ہی ان کے ہنستے مسکراتے چہرے پر چڑ چڑے پن کے آثار اور تیوری پر بل آنے لگے۔ شدید صاحب کا رنگ عام حالات میں خاصا پھیکا تھا مگر غصے کی کیفیت میں، جیسے کہ اس وقت، ان کے کان لال ہوجاتے تھے، جس کے بعد ان کا پورا چہرہ کسی ترکی مرغ کی کلغی کی طرح لال بھبھوکا ہوجاتا تھا۔

زیرِغور خط منسٹر صاحب کے دفتر بھیجا جانا تھا اور اس کے باوجود اس کا اختتام ''نیک خواہشات کے ساتھ'' پر ہوا تھا جیسے منسٹر صاحب ان کے دفتر میں ساتھ کام کرنے والے کوئی ملازم ہوں۔

''کیوں زعتر صاحب، آپ نے 'آپ کا تابعدار خادم' کیوں نہیں لکھا؟ کیا آپ میرے اور منسٹر صاحب کے درمیان جھگڑا کروانا چاہتے ہیں؟''

''مگر جناب، منسٹر صاحب کب کسی خط کے القابات پر نظر بھی ڈالتے ہیں۔ ان کے پاس ان تمام ادب آداب پر نظر ڈالنے کی فرصت کہاں؟''

''میں آپ کو ہزار دفعہ بتا چکا ہوں کہ خط کا اختتام کس طرح سے ہونا چاہیے...'' ہوسکتا ہے وہ محمود زعتر صاحب کو کچھ دوسرے ملازمین کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہوں۔ ''خصوصاً منسٹر صاحب کے نام لکھا گیا خط۔''

''مگر میں نے تو اس خط کو تین یا چار مرتبہ درست کیا تھا...''

''مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تم میری ہدایات کو نظرانداز کر رہے ہو اور محکمے کا وقت اور کاغذ ضائع کر رہے ہو۔''

''میں تو صرف احتیاط سے کام لیتا ہوں، وقت ضائع نہیں کرتا۔''

''مجھے ہر بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھے تم۔''

''مگر جناب...''

''بس بحث مت کرو اور، بکواس بند کرو۔''

''بکواس بند؟''

''ہاں! میں نے کہا بکواس بند کرو۔ بکواس بند!''

بحث کی آواز چلانے میں تبدیل ہونے پر ان کا ایک ساتھی اور چپراسی، زعتر صاحب کو وہاں سے لے جانے کے لیے اندر آ گئے۔ ان کا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ چلا رہے تھے، ''میں کچھ بھی برداشت کر سکتا ہوں مگر بے عزتی نہیں۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے۔ میری بھی...'' جب وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو موسم کے سرد ہونے کے باوجود پسینے میں نہائے ہوئے چلاّئے جا رہے تھے (حالانکہ اب ان کی آواز ان کے باس کے کانوں تک نہیں جا رہی تھی): ''وہ کیا سمجھتا ہے، یہ اس کے باپ کی جاگیر ہے؟ بس اب یہی رہ گیا ہے کہ یہ کل کے چھوکرے آ کر ہماری بے عزتی کریں؟'' اس دوران ان کے ساتھی انھیں ٹھنڈا کرنے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ہوا کیا تھا۔

محمود زعتر صاحب نے مختلف لوگوں کے سامنے پورا واقعہ کم از کم دس مرتبہ دہرایا تھا۔ انھوں نے اپنے اور شدید صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو حرف بہ حرف سنائی تھی اور ساتھ میں چند ایسی باتوں کا اضافہ کر دیا تھا جن سے ایک ایسے شخص کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا تھا جس کی بے عزتی کی گئی ہو۔

ہر دفعہ جب وہ یہ قصہ دہراتے تو نئی تفصیلات، جن کو وہ بھولے ہوئے تھے، یاد آنے کے ساتھ ساتھ ان کا خون پھر اسے کھولنے لگتا، ان کی آنکھیں لال ہو جاتیں اور منہ سے کف ابلنے لگتا۔ ''بکواس بند کرو'' کہتے ہوئے اس نے اپنی میز پر ہاتھ مارا تھا۔ وہ ہکلا رہا تھا جب اس نے کہا تھا کہ کیا تم میرے اور منسٹر صاحب کے درمیان جھگڑا کروانا چاہتے ہو؟ ''میں نے اس سے زیادہ بزدل آدمی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا مگر میرے سامنے وہ شیر ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔'' ''اس نے مجھے کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا... اسے کوئی شرم و حیا ہے؟ مگر میں چپ تو نہیں ہوا... میں نے اس کے ایک ایک لفظ کا برابر جواب دیا جب تک اس نے چیخنا نہیں شروع کر دیا۔'' اور اس مقام پر، شدید جوش میں، وہ شدید صاحب کے لہجے اور آواز کی نقل اتارتے ہوئے چیخنا شروع کر دیتے: ''میرے ساتھ زیادہ زبان مت چلاؤ!'' اور ان کے سامعین ہنسنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ دراصل جس بات سے ان کی انا سب سے زیادہ مجروح ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کل کا لونڈا ان پر چلایا اور انھیں بکواس بند کرنے کو کہا۔

اُس روز صبح خزاں کی پہلی بارش ہوئی تھی۔ ان کا گھر معمولی مزدور پیشہ لوگوں کی بستی میں واقع تھا

(یہی وجہ تھی کہ وہ اس زمین کو خرید پائے تھے جس پر انھوں نے یہ مکان بنوایا تھا) اور جس گلی میں ان کا گھر تھا وہ کیچڑ کا ایک سمندر بن چکی تھی۔ کیچڑ سے بچتے ہوئے وہ احتیاط سے گھر کی جانب چل رہے تھے، جیسا کہ وہ لاتعداد اور بہت سے یادگار موقعوں پر بھی کر چکے تھے۔ ان کے دل میں اپنے باس کی موت کی خواہش موجزن تھی۔ دراصل وہ خود اس کو مار ڈالنے کے بارے میں سوچ جا رہے تھے، مگر انھوں نے اس منصوبے کی تفصیلات پر زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ کیا وہ گھات لگا کر اس کے انتظار میں کہیں چھپے رہیں گے اور اس طرح سے ایک نا معلوم قاتل بن جائیں گے؟ یا پھر وہ اس کے آرام دہ آفس میں جا کر اس کے چھرا گھونپ دیں گے تا کہ وہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو اور ہر کسی کو پتا چلے کہ انھوں نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے؟ وہ اس بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تھے۔ ممکن ہے اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی اچھی طرح سے مار لگانا ہی کافی ہو۔ کبھی کبھار شدید صاحب لوگوں کے جانے کے بعد دیر تک دفتر میں ہوتے تھے۔ زعتر صاحب کسی ایسے موقعے کا انتظار کر سکتے تھے اور اس کے اکیلے ہونے پر، آفس کا دروازہ بند کرنے کے بعد، تا کہ کوئی ان کے خلاف گواہی دینے والا نہ ہو، اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کے چمکتے ہوئے چشمے اور اس کے پیچھے چمکنے والی آنکھوں کا بھرتا بنا سکتے تھے۔

پھر انھوں نے کسی زیادہ قابل عمل منصوبے پر سوچنا شروع کیا یعنی کہ وہ رات کو دفتر جائیں اور چوکیدار کی نظر بچا کر، اپنے اور باس کے کمرے کے درمیان پڑنے والے برآمدے میں رسی باندھ کر پھانسی پر لٹک جائیں تا کہ جب لوگ صبح دیکھیں تو ان کے جذبات شدید صاحب کے خلاف بھڑک اٹھیں، یا پھر خود شدید صاحب کا ضمیر ان کو ملامت کرے۔ پھر انھوں نے تصور کیا کہ انھوں نے دفتر کی عمارت کے سب سے بلند مقام سے چھلانگ لگا دی ہے اور سارے لوگ ان کے خون میں لت پت جسم کے گرد جمع ہیں۔ انھی خیالوں میں اچانک انھوں نے اپنے آپ کو گھر کے سامنے پایا تو ان کو ہوش آیا کہ وہ کن احمقانہ خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے جوتے خزاں کی کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے جس نے ان کی پتلون کے پائنچوں کو بھی لت پت کر دیا تھا۔ ان کو یہ بھی احساس ہوا تھا کہ وہ ابھی تک جذبات کی شدت سے کھول رہے ہیں۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر ان کی بیگم کو فوراً احساس ہو گیا کہ ان کے اندر غصے کا ایک طوفان کروٹیں لے رہا ہے۔ اور یہ کل ان کے درمیان ہونے والے جھگڑے کا نتیجہ نہیں تھا کیونکہ صبح تو وہ دفتر جاتے ہوئے ان کا تیار کیا ہوا کھانا کھا کر گئے تھے۔ زعتر صاحب شدید غصے کی حالت میں ہونے کے باوجود دل کے بہت اچھے انسان تھے اور ان کے لیے سارا دن اپنی بیگم کے لیے نفرت دل میں لیے پھرتے رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ جہاں تک اس وقت کا تعلق ہے تو ان کو بیگم کی ضرورت تھی۔ ایسے موقعوں پر دہرائی جانے والی رسم کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ خود سے، بیگم کے پوچھنے سے پہلے، ایک لفظ بھی منہ سے

نہیں نکالتے تھے۔

اپنے کیچڑ سے لتھڑے جوتے تارنے کے دوران انھوں نے بیگم کو پوری کہانی سنائی۔ اس مغرور جاہل آدمی کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ان کو بکواس بند کرنے کو کہے۔ ''وہ کیا سمجھتا ہے کہ اس کے سرٹیفیکٹ اور ڈگریاں ہی اس زمانے میں چلتی ہیں؟... میرے بچوں کے پاس بھی ڈگریاں ہیں مگر ان کی صحیح تربیت ہوئی ہے۔ وہ تو کبھی اپنے سے کسی بڑے سے بدتمیزی نہیں کرتے... کیا بے کار حماقت کی بات ہے! یہ کیا بات ہوئی... آخر 'نیک خواہشات کے ساتھ' یا 'آپ کا تابعدار خادم' میں کیا فرق ہے؟ اس کے پاس اپنی برتری جتانے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ مجھے کہتا ہے بکواس بند کرو۔ مجھ کو کل ہر صورت میں استعفیٰ دے دینا چاہیے۔'' (یہ نیا عہد انھوں نے بیگم سے باتوں کے دوران کیا تھا۔) ''میں بھوکے مرنے کو اس منحوس دفتر میں رہنے پر ترجیح دوں گا۔ مجھے استعفے کا ایک تفصیلی خط لکھنا چاہیے ایسا جو کہ آج تک اس محکمے میں کسی نے نہ لکھا ہوگا۔''

ان کی آواز کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ بیگم ان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ ان کے استعفیٰ دینے کے اعلان نے انھیں دہلا دیا تھا، حالانکہ یہ دھمکی وہ پہلے بھی کئی مرتبہ دے چکے تھے۔ انھوں نے ان کی توجہ اس موضوع سے ہٹانے کے لیے ایک ایسے واقعے میں جو انھوں نے نہیں دیکھا تھا، مذاق کا پہلو ڈھونڈنے اور باس کی بدتمیزی کا اپنی طرف سے جواز تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''کیا پتا وہ بھی آپ کی طرح آج خراب موڈ میں گھر سے چلا ہو۔''

''مگر مجھ سے بات کرنے سے پہلے تو وہ فون پر ہنس رہا تھا، بلکہ پوری آواز کے ساتھ ٹھٹھے مار رہا تھا۔''

''مگر آپ کے استعفے سے اس کا کیا بگڑے گا؟ بلکہ شاید وہ چاہتا ہی یہ ہو۔''

''مجھے سب سے زیادہ افسوس جس بات کا ہے وہ یہ ہے کہ وہ میرے بیٹے کی عمر کے برابر ہے، بلکہ ہوسکتا ہے اس سے بھی چھوٹا ہو۔''

اس بات کے کہنے کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا کہ بے شک ان کا بیٹا بھی ان کے عمر کے کئی لوگوں کے اوپر افسر تھا اور کیا پتا وہ بھی ان سے اسی قسم کا سلوک کرتا ہو جیسا کہ ان کے باس نے آج صبح ان کے ساتھ کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ان کو چیخ چیخ کر بکواس بند کرنے کا حکم دیتا ہو؟ وہ جس کے لیے ان کی ایک کڑی نظر چپ کرانے کو کافی ہوا کرتی تھی۔

جہاں تک ان کی بیگم، عواطف، کا تعلق تھا، ان کو اس بات کا ڈر تھا کہ اگر کہیں انھوں نے سچ مچ استعفیٰ دے ڈالا تو ان کے پاس اپنی مرضی چلانے کے لیے بیگم کے علاوہ کوئی ہوگا نہیں اور اس تمام فراغت

کے ساتھ، وہ سارا وقت گھریلو معاملات میں مداخلت کرتے رہا کریں گے، جیسا کہ اپنی سالانہ چھٹیوں کے دوران ان کا معمول تھا۔ اسی وجہ سے وہ پوری کوشش میں تھیں کہ زعتر صاحب اپنا ارادہ تبدیل کرلیں۔ مگر انھوں نے جتنا ان کو سمجھانے کی کوشش کی اتنا ہی ان کا ارادہ پختہ اور آواز بلند ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ انھوں نے ان پر دشمن کا ساتھ دینے کا الزام لگانا شروع کردیا اور ان سے خاموش رہنے کو کہا کہ اس معاملے سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔

آخر کار زعتر صاحب خود ہی خود کچھ ٹھنڈے ہوے۔ بیگم کے غصے پر غور کرتے ہوے ان کی سمجھ میں آنا شروع ہوا کہ عقلمندی کی بات یہی ہے، کیونکہ استعفے سے کوئی فائدہ نہیں اور الٹا سراسر ان کا اپنا نقصان ہے۔ کیوں نہ وہ شکایت داخل کرکے اس معاملے کی چھان بین کی درخواست کریں؟ یہی صحیح اور سمجھداری کی بات ہے۔

جب عواطف نے دیکھا کہ اب ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے تو انھیں کھانا کھانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ کھانے کے آگے بیٹھ گئے لیکن ان کو بالکل بھوک نہیں تھی اور ان کا دل شدت سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ آنکھ سے کوئی آنسو نہ نکلنے کے باوجود ان کو اپنا جی بھر آنے اور گلے کے رندھنے کا بار بار احساس ہو رہا تھا۔

کھانا چھوڑ کر وہ میز پر بیٹھ گئے۔ اپنے ساتھ لائے ہوے کچھ کاغذوں پر — جو کہ بلاشبہ دفتر کی ملکیت تھے — انھوں نے کچھ لکھنا شروع کیا۔ ''پریشان مت ہو۔ میں استعفیٰ نہیں لکھ رہا۔ مجھے خود منسٹر صاحب کو اپنی شکایت لکھنی چاہیے تاکہ ان کو پتا چلے کہ یہاں ہو کیا رہا ہے اور اس معاملے کی انکوائری کا مطالبہ کرنا چاہیے۔''

انھوں نے فوراً ہی اپنی شکایت لکھ ڈالی مگر وہ اس سے مطمئن نہیں ہوے۔ پھر انھوں نے اسے دوسری مرتبہ لکھا اور دوبارہ سے پڑھا۔ ''یہ جملہ کمزور ہے۔ مجھ کو اسے اَور سخت الفاظ میں لکھنا چاہیے... یہ لفظ کچھ زیادہ ہی سخت ہے اور میرے خلاف بھی جا سکتا ہے لہٰذا اسے اڑا دینا ہی بہتر ہے... اس خط میں گرامر کی کوئی غلطی نہیں ہے... میرے لکھنے کے انداز سے ہی منسٹر صاحب کو پتا چل جائے گا کہ میں ایک لائق افسر ہوں۔ مگر اس خط کو ختم کیسے کیا جائے؟ 'نیک خواہشات کے ساتھ' یا 'آپ کا تابعدار خادم'؟ اور پھر اس کے بعد کیا لکھوں؟ میں نے ایسی کتنی ہی شکایات کو اپنے باس کے سپرد ہوتے دیکھا ہے کیونکہ اوپر والے انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے... آخر یہ قتل، غبن یا جعلسازی کا معاملہ تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو یقیناً اس کے ہی سپرد کردیا جائے گا۔ تو پھر اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ بہتر ہے کہ میں براہ راست اس کو ہی لکھوں۔ مجھے اس کی بےعزتی کرنی چاہیے، اسے شرم کا کوئی احساس دلانا چاہیے۔''

اس شام زعتر صاحب نے اپنے باس کو خط لکھا کہ ''آپ نے مجھ سے کہا کہ بکواس بند کرو۔ اس سے میرے جذبات شدید مجروح ہوے ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میرے بیٹے آپ کی عمر کے ہیں... بزرگوں کا احترام کرنا ضروری ہے... میں نے آپ کو جیسا بھی جواب دیا تھا اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ آپ نے میری تذلیل کی تھی... میں چند مہینوں میں ریٹائر ہونے والا ہوں۔ مجھے پتا چلا کہ آپ بلا وجہ ہی ایک ہیجانی کیفیت میں تھے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ کا تابعدار خادم... ہاں، آپ کا تابعدار خادم...''

اپنا لکھا ہوا خط دوبارہ پڑھنے کے بعد زعتر صاحب کا دل چاہا کہ اسے پھاڑ کر پھینک دیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ آخر وہ اسے خط کیوں لکھیں؟ ''اس کو مجھ سے اپنے کیے کی معافی مانگنی چاہیے... مجھے اس کو خط نہیں لکھنا چاہیے... نہیں، مجھے خط بھیج دینا چاہیے... یا میں اسے دوبارہ سے لکھوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ 'ہیجانی کیفیت' پر اسے غصہ آجائے۔ آخر وہ سچ مچ ایک ہیجان میں مبتلا تھا۔ میں ان الفاظ کو یونہی رہنے دوں گا۔ میں انھیں نہیں نکالوں گا... میں تھک گیا ہوں، بہت زیادہ تھک گیا ہوں...'' انھیں احساس ہوا کہ ان کی زندگی میں طوفان برپا ہے، ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی معاملات سے نمٹنے کی صلاحیت کھوتے جا رہے ہوں۔

رات کا وقت تھا جب محمود زعتر صاحب کیفے کی طرف روانہ ہوے۔ اس مرتبہ انھوں نے اپنا اوورکوٹ کیچڑ میں لت پت کپڑوں اور جوتوں کے اوپر پہن لیا تھا؛ گلیاں ابھی بھی کیچڑ سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ وہاں جلد از جلد پہنچنا چاہتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ دوستوں کو اپنی داستان سنا سکیں اور ان کے سینے پر سے یہ بھاری بوجھ کچھ ہلکا ہوسکے۔ جب وہ کیفے پہنچے تو شروع شروع میں انھوں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی، مگر ان کے دوست، ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی غمگینی کو دیکھ کر ان سے اس اداسی کی وجہ دریافت کرنے لگے۔ بہت جلد زعتر صاحب نے خود کو اپنے دوستوں سے سارا ماجرا بیان کرتے ہوے پایا۔ ایسا کرتے ہوے انھوں نے کچھ ایسی تفصیلات بھی بیان کیں جو کہ حقیقتاً واقع نہیں ہوئی تھیں مگر وہ ان کو اتنی مرتبہ دہرا چکے تھے کہ ان کے اپنے لیے وہ ایک حقیقت بن چکی تھیں۔

ان کے دوستوں کے ان کی کہانی کو مذاق اور طنز کے سے انداز میں سنا، تھوڑا سا مذاق ان کا اڑایا گیا اور بہت سارے طنز کا نشانہ ان کا باس بنا۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ جب کسی حالیہ مرنے والے کا سوگ منا رہے ہوتے ہیں اور ہر کوئی ان سے تعزیت کے دوران اپنے بچھڑ جانے والے پیاروں کا ذکر کرتا ہے اور اس طرح سے خود سوگ کی کیفیت اپنا لیتا ہے، اب ان کے ہر دوست نے بھی اپنے اپنے باس کے قصے سنائے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا اور اپنے دوست زعتر صاحب کا انتقام لینے کی کوشش سڑے ہوے مذاقوں کے ذریعے کی، جو کہ بعض اوقات اس قدر گھٹیا تھے کہ اپنے ان قارئین کے جذبات کے احترام میں جو اس قسم

کے لطیفوں کا کھلے عام بیان کیا جانا ناپسند کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کو صرف سرگوشیوں میں بیان کیا جانا چاہیے، ہم ان کو یہاں بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

اس شام، ان قابل احترام بزرگوں کے قہقہوں نے کیفے کی چھت سر پر اٹھالی تھی۔ اس رات جب زعتر صاحب جلدی گھر لوٹے تو انھیں وہ گلیاں کم کیچڑ زدہ محسوس ہوئیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ قہقہوں میں ایک دوبار شریک ہولیے تھے بلکہ انھوں نے ایک لطیفہ بھی سنایا جو بے تحاشا مزاحیہ اور تیربہ ہدف تھا حالانکہ وہ ان کا اپنا بنایا ہوا نہیں تھا۔ مگر پھر بھی، دوستوں کو چھوڑ کر ایک بار پھر اکیلے ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں اندازہ ہوا کہ یہ بحران ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ان کے غصے کی جگہ دھیرے دھیرے ایک طرح کی گہری اداسی لیتی جا رہی تھی۔ انھیں اس بات کا بہت ملال تھا کہ یہ واقعہ ان کی اتنی عمر گذرنے کے بعد اس عمر میں ہونا تھا اور ان کے سفید بالوں کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا جانا تھا۔

بستر پر لیٹنے کے بعد زعتر صاحب نے اپنے باس کے نام لکھے گئے خط کو دوبارہ پڑھنے کی کوشش کی مگر پھر شدید غصے اور نفرت میں انھوں نے اس کو بستر کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر پھینک دیا۔ عواطف ان کے ساتھ لیٹی ان کا دل بہلانے اور دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کو ایسا لگا جیسے برسوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر ہو جبکہ صبح سے اس قدر بھڑکتے ہوئے جذبات مکمل طور پر اس سانحے کے بوجھ تلے ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ سارے جسم میں پھیل جانے والی تھکن کے ساتھ وہ اپنی بیگم کی آغوش میں ہاتھ پاؤں سکیڑ کر ماں کے پیٹ میں موجود کسی بچے کی طرح لیٹ گئے۔ پھر انھوں نے اپنے پریشان اور پراگندہ ذہن کو سلانے کی کوشش شروع کی اور جلد ہی ان پر گرمی کے احساس اور بے حسی کی راحت نے غلبہ پالیا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فجر کا وقت ہو جب انھوں نے اپنے آپ کو کام پر جاتے ہوئے راستے میں پایا۔ انھیں خلا میں اونچا اڑنے میں بہت مزہ آ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ کولھوں کے نیچے رکھے انھوں نے اپنے جسم کو خلاؤں میں اچھال دیا تھا اور ایک بیٹھے ہوئے آسن میں وہ شہر کی عمارتوں، گاڑیوں اور لوگوں سے بہت اوپر پہنچ گئے، حتیٰ کہ انھوں نے اپنے آپ کو دفتر کی عمارت کے اوپر منڈلاتے ہوئے پایا۔

شدید صاحب نے سکریٹریٹ میں سارے عملے کی ایک میٹنگ بلوائی ہوئی تھی مگر ان کی بات کوئی بھی نہیں سن رہا تھا اور ہر کوئی زعتر صاحب کو رشک آمیز حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس مافوق الفطرت صلاحیت کے بارے میں حیرت زدہ سے تھے اور انھوں نے لوگوں میں اترنے سے پہلے مزید کئی چکر لگائے۔

ایسا لگتا تھا کہ شدید صاحب اب بھی احکامات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں کیونکہ زعتر صاحب نے انھیں کہتے سنا تھا کہ آدمی کو 'نیک خواہشات کے ساتھ' اور 'آپ کا تابعدار خادم' کے درمیان فرق کرنا

ابراہیم الکونی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

صحرا کی دھمک

مصباح سعید لینڈ روور سے کود کر نیچے اترا اور اس میں سے کمبل نکال کر ایک چھدرے صحرائی درخت کے نیچے بچھا دیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو لینڈ روور کا سامنے کا حصہ کھول کر تیل کی مقدار جانچتے اور انجن کو ٹھنڈا کرتے ہوے دیکھا۔ اس نے خاموش اور سورج کے سامنے سپر انداز خالی پن پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جب کہ انجن کی گھرگھراہٹ اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ ''جبور،'' وہ کمبل پر ڈھیر ہوتے ہوے بولا، ''تمھارے پاس ایک اسپرین تو نہیں ہوگی؟ تمھاری گاڑی کے شور سے میرے سر میں درد ہوگیا۔'' اس نے سورج کی شعاعوں میں چمکتی ہوئی ریت پر تھوکا اور تھوک کو ریت کے پیاسے مساموں میں تیزی سے غائب ہوتے ہوے دیکھنے لگا۔

''مجھے لگ رہا ہے جیسے میرا بھیجا اُبل رہا ہو،'' اس نے کہا۔

جبور ہاتھوں میں روٹی، سارڈین مچھلیوں کے ڈبے اور زرد مائع سے بھری بوتل لیے اس کی طرف آیا۔

''تم شہر کے لوگ صحرا کے عادی نہیں ہو۔ ذرا ٹھہرو، میرے پاس سردرد اور دوسری بیماریوں کے لیے قدرتی علاج ہے، اسپرین سے زیادہ موثر دوا۔''

''اتنی گرمی میں وِسکی؟ معاذاللہ!''

''ہم شام ہونے تک یہاں آرام کریں گے،'' سارڈین کے ڈبے کھولنے میں مشغول جبور نے کہا۔ ''پھر رات میں سفر دوبارہ شروع کریں گے۔ یہ ہمارے لیے بھی بہتر ہے اور گاڑی کے لیے بھی۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے روٹی توڑی، پھر بوتل کھولی اور دو گلاسوں میں وسکی انڈیلی۔

''چلو اب سے یہ طے کر لیتے ہیں،'' وہ اسے گلاس تھماتے ہوے بولا، ''کہ میں ایک گلاس پیوں تو تم

کندھے پر ٹہوکا لگا تو میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میری بیوی کہہ رہی تھی، ''تم کو کیا ہو گیا ہے؟ سن رہے ہو؟ ہم کب بنانا شروع کریں گے؟''

اس مکان کا آسیب ابھی میرے سر میں موجود تھا۔

''جن لوگوں نے تباہی کے یہ سب خوفناک ہتھیار ایجاد کیے ہیں،'' میں بولنے لگا، ''آخر وہ کوئی ایسی چیز بنانے کی کیوں نہیں سوچتے جو مکانات کو ان کی تباہ کاریوں سے بچا سکے؟''

میری بیوی کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ اس نے مجھ کو یوں دیکھا جیسے بڑے دُلار سے سوال کر رہی ہو۔ میں مسکرا دیا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح گھمانے لگا جیسے اپنے خیالات کو اڑا رہا ہوں، اور بولا، ''فکر کی کوئی بات نہیں؛ میرا اس پر یقین ہے کہ اب جنگ کبھی نہیں ہوگی۔''

اس بات نے میری بیوی کے چہرے کی حیرانی کو اور بھی بڑھا دیا۔

لانے کی ابا کی ہر کوشش بے کار گئی۔

آخر کار یہ قتل عام بند ہوا۔ آسمان سے ہوائی جہاز معدوم ہو گئے اور اوپر سے آتی ہوئی تمام آوازوں اور دھاکوں نے بند ہو کر زمین کے وحشیانہ شوروغوغا کے لیے جگہ خالی چھوڑ دی جو اس وقت تک جاری رہا جب تک دن کی روشنی کا اولیں ڈورا نمودار نہ ہو گیا۔

تکان سے چور چور ہم سب اپنی خندق سے نکلے تھے اور اپنے والدین کے پیچھے پیچھے چل دیے تھے۔ ان کے حکم پر ہم نے اپنی آنکھیں کس کر میچ رکھی تھیں تاکہ ہماری نظر گردوپیش کے خون خرابے پر نہ پڑ جائے۔ ہم نے سیدھے اپنے گھر کی راہ لی، مگر وہ وہاں موجود نہ تھا۔ ہماری گلی میں نہ چچا حسن کا گھر سلامت تھا نہ تیسرا والا مکان اور نہ چوتھے کا آدھا حصہ؛ سب کے سب ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔ ملبے کے اس ڈھیر پر جو ہمارا مکان تھا، ہماری ایک بط چکراتی پھر رہی تھی۔ پیچھے پیچھے اس کا ایک بچہ بھی تھا، جبکہ پہلے وہ پانچ تھے۔ ہوا میں چنبیلی کی مہک کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

ابا کسی سراسیمہ شخص کی طرح پہلے تو کھڑے کھڑے اس ملبے کو تکتے رہے اور پھر امی کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگے جن کو اس ناگہانی نے دم بخود کر دیا تھا۔

اس دن کا آخری اور اندوہ ناک منظر ابا کو روتے ہوئے دیکھنا تھا — ایسا منظر جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''زندگی بھر کی محنت پل بھر میں اکارت ہو گئی،'' امی آنسوؤں کی جھڑی میں منمنائیں۔

''شکر الحمدللہ،'' ابا آنسو پونچھتے ہوئے بڑبڑائے۔ ''شکر ہے کہ ہم اندر نہیں تھے۔'' کچھ دیر کے لیے خاموشی ہم پر مسلط رہی۔ پھر وہ بولے، ''اب تم لوگوں کو اندرونِ ملک ترک وطن کر جانا ہوگا،'' اور اس طرح میں نے ایک نئی ترکیب ''ترک وطن'' سیکھی۔

''چلو، جب تک کوئی اور بندوبست نہ ہو تمھاری پھوپھی کے گھر چلتے ہیں،'' ابا نے بات جاری رکھی، ''بشرطیکہ وہ بھی ڈھے نہ گیا ہو۔''

غم زدہ جلوس پھر سے مرتب ہوا اور ہم سب مریل چال سے چلتے ہوئے روانہ ہو گئے، ''جیسے کسی میت کے ساتھ ساتھ'' جیسا کہ میں سیانا ہو جانے پر اپنے احباب کو یہ واقعہ سناتے وقت کہا کرتا تھا۔ اپنے مکان کے ملبے کے پاس سے ہٹتے وقت میں نے دیکھا کہ ابا نے باہر کو نکلے ہوئے ایک پتھر کو گھسیٹا اور دوبارہ ملبے کے بڑے سے ڈھیر کی طرف اچھال دیا۔

''جب جنگ ختم ہو جائے گی،'' میں نے ان کو کہتے سنا، ''تو ہم اس کو پھر سے بنائیں گے۔''

پھر جنگ ختم ہو گئی...

یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ اس ابتری کی رات میں کتنی ساری خلقت نے اس صحرا میں پناہ لے رکھی تھی؛ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ تاریک راہ گذار لوگوں سے اس طرح پٹا پڑا تھا جیسے ہم سب کسی بزرگ کے عرس میں آئے ہوئے ہوں، جیسا کہ چچا حسن نے زہر خند کے ساتھ کہا تھا: ''شیخ ہٹلر کے عرس میں۔''

''زمین کھودنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ!'' ابا نے امی سے اس قسم کے امور کے کسی ماہر کے لہجے میں کہا تھا۔ ''چلو بچو، کھود دو۔ حسن آفندی، اپنے بچوں کے لیے ایک خندق بنالو تاکہ گولوں کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں کی زد سے محفوظ رہیں۔''

ہم نے مل کر ایک بڑی سی خندق کھودی جس میں ابا نے ہم سب کو ٹھسا ٹھس بھر دیا۔ اس دوران بستی پر پے در پے دھماکوں پر دھماکے ہوتے رہے اور آسمان پر بے ہنگم گھن گرج چھائی رہی۔ اوپر آسمان بجلی کی طرح وقفے وقفے سے روشنی کے جھماکے ہوتے رہے اور پھر ہوائی جہاز ہمارے اوپر منڈلانے لگے۔

''بالکل ہمارے سروں پر آگئے ہیں،'' ابا چلائے۔ امی نے ایک دل دوز چیخ ماری اور ہم سب کو چھپا لینے کے لیے ہمارے اوپر اوندھ گئیں۔ ابا نے بھی یہی کیا۔ پورے صحرا میں لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے آوازیں گونجنے لگیں۔ جواب میں ان کو چپ کرانے کے لیے کچھ دوسری آوازیں بلند ہوگئیں۔

میں نے اپنی گردن اچکا کر سر اوپر کو اٹھایا اور ابا کی بغل میں سے آسمان کی طرف دیکھا کہ شاید کسی ہوائی جہاز میں کوئی جرمن دکھائی دے جائے اور میں اپنے تصور میں بنائی ہوئی جرمنوں کی شکل کی تصدیق کر سکوں۔ مگر ابا نے زور سے دبا کر میرا سر ریت میں دے مارا۔

''اگر ان کی لڑائی انگریزوں سے ہے تو آخر ہم پر بمباری کیوں کر رہے ہیں؟'' امی نے سرگوشی کی۔ ابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا ہم ان کے رفیق نہیں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''دونوں پر اللہ کی لعنت!'' ابا زور سے چیخے۔

ہوائی جہاز زمین کے اتنے قریب آگئے تھے کہ ان کی تھرتھراہٹوں نے مجھ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر یکا یک خوفناک روشنی کے جھماکوں نے سیٹیاں سی بجاتے ہوئے تاریک صحرا کو بے لباس کر دیا اور پھر تو، جیسا کہ چچا حسن کی بیوی نے، جو اس رات دو برس کے بعد ہم کو ملی تھیں، بیان کیا تھا، ''لوگوں پر بارش کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔''

زمین سے بلند ہوتی ہوئی چیخوں نے آسمان سے آتے ہوئے دھماکوں کے ساتھ مل کر شور اور واویلا کا اس قدر ہنگامہ گرم کیا کہ اتنا وقت گذر جانے کے بعد بھی وہ اب تک میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ جب پو پھٹی تو امی نے آس پاس کی دوسری عورتوں کی طرح خود کو جنونی دوروں کے حوالے کر دیا اور ان کو آپے میں

صورت گری میں لگ جاتا۔ میرے تصور میں جرمن نہ تو انگریزوں کے سے ڈیل ڈول کے ہوتے اور نہ ان کی سی شکل صورت کے، بلکہ وہ مجھ کو ان سے کہیں زیادہ لمبے تڑنگے اور شان دار نظر آتے۔

ایک رات ہوائی حملے کا سائرن بج اٹھا۔ یہ بھی اس زمانے کی ایک نئی اور دلچسپ چیز تھی۔ گلی کوچوں اور گھروں کی بتیاں بجھ گئی تھیں اور ہر سو گہری خاموشی سے بوجھل اندھیرے کی عملداری ہوگئی تھی۔ دروازوں پر آسیبی ہیولے سے جمع ہو گئے تھے اور چنبیلی کی تیز مہک گذری ہوئی راتوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی تھی۔

''جرمن ہوائی جہاز!'' ابا چلائے۔ آسمان پر نظریں جمائے اور پوری توجہ سے کان لگائے میں اس بے ہنگم بھنبھناہٹ کا اندازہ لگا سکتا تھا جو افق کے اس پار سے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو چیرتی ہوئی قریب آ رہی تھی۔

''کیا وہ بستی پر بمباری کریں گے؟'' میں نے دہشت زدہ ہو کر امی سے پوچھا۔

''نہیں،'' ابا نے ایک ایسے شخص کی طرح مطلع کیا جو اس قسم کے معاملات سے اچھی طرح واقف ہو۔ ''ہٹلر ایسا نہیں کرے گا۔ وہ تو بس انگریزوں کی چھاؤنی کی طرف جا رہے ہیں۔''

انگریزوں کی چھاؤنی ہمارے چھوٹے سے شہر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھی، بلکہ تقریباً آ ملی تھی۔ ہم نے ہیبت ناک دھماکے سنے جنھوں نے مجھے نہیں یاد کہ ختم ہونے کا نام بھی لیا ہو۔ ایک ہوائی جہاز آسمان ہی میں پھٹ کر شعلۂ جوالہ بن گیا۔ پھر آسیبی ہیولے اپنی بھاری بھاری چاپ کے ساتھ ہجوم کرتے لوگوں کو یہ بتاتے ہوئے گذرے کہ جہاز بستی کو برباد کیے دے رہے ہیں اور مشورہ دینے لگے کہ لوگ اپنے گھروں سے دور دور رہیں۔

آسیبی ہیولوں کے پرے کے پرے گرتے پڑتے گلی کوچوں میں نکل بھاگے۔ ہمارے والدین بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سب کو جلدی جلدی سمیٹ کر خوف زدہ اژدہام کے ساتھ اس صحرا کی جانب نکال لے گئے جو بستی کے شمال مشرق میں پھیلا ہوا تھا۔ آس پاس پناہ کے لیے کوئی اور جگہ ہی نہیں تھی۔

وہ رات قیامت سے کم نہ لگتی تھی۔ ابا اس کو اسی طرح بیان کرتے تھے اور بعد میں امی بھی ان کے یہی الفاظ دہرایا کرتیں۔ لوگ وحشیوں کی طرح آپس میں دھکا پیل کر رہے تھے اور ننگے پاؤں اپنے گھر کے لباسوں میں اس گھپ اندھیرے میں ایک دوسرے کو آوازیں دیتے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ''محسن، تم کہاں ہو؟''، ''بچے کہاں ہیں؟''، ''دروازہ لگا دیا تھا؟''، ''گھر کو جھونکو جہنم میں، جلدی کرو''، ''ابا، ذرا رکو تو!''، اور کتے تھے کہ چہار جانب سے بھونکے چلے جا رہے تھے۔ میں اپنے تین بھائی بہنوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے روتا بھی جا رہا تھا۔ اس گھنے اندھیرے میں آہ و بکا کرنے والوں میں بچوں کی اکثریت تھی۔

مجھ کو اُس زمانے کے کوئی خاص واقعات تو اب یاد نہیں رہے سوائے اپنے ایک بھائی کی ولادت کے جو ہم سب میں پانچواں اور نرینہ اولاد میں تیسرا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر واقعات اتنے غیر اہم تھے کہ انھوں نے میرے دماغ پر کوئی نقش نہیں چھوڑا، لیکن مجھ کو یہ یاد رہا کہ جب شام ہو جاتی تھی تو ہمسایوں کی ٹولی میرے ابا سے ملنے آجاتی تھی اور وہ سب باغیچے میں بیٹھ کر مختلف موضوعات پر خوش گپیاں کیا کرتے تھے، جب کہ ہم بچے ان کے آس پاس کھیلتے رہتے اور بادِ بہاری چنبیلی کی مہک سے بوجھل ہو کر نشے میں جھومتی پھرتی۔ ممکن ہے اس وقت ہمارے گھر میں سدا بہار ہی رہا کرتی ہو کیونکہ میں اب اس زمانے کو بغیر باغیچے کے ان کھیلوں اور چنبیلی کی خوشبو کے یاد ہی نہیں کر پاتا۔

پھر کچھ ایسے واقعات رونما ہونے لگے جنھوں نے گو ہماری زندگی کی یکسانیت کو یک دم درہم برہم نہیں کیا، اس وجہ سے وہ مجھ کو پوری تفصیل کے ساتھ تو مشکل ہی سے یاد آتے ہیں، ہاں ان کی مبہم سی بازیافت ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ لفظ ''جنگ'' انھی دنوں کان میں پڑنا شروع ہوا تھا جو میرے لیے ایک نیا لفظ تھا اور اس وقت گھر میں لفظ ''روٹی'' کی بہ نسبت کہیں زیادہ استعمال کیا جانے لگا تھا۔ ہماری گلی کے بڑے بوڑھے بھی اب اس کو مستقل بولنے لگے تھے جب کہ میں اس کے معنی ہی نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح کے اَور بھی کئی الفاظ تھے جو اجنبی اور مشکل ہونے کے باوجود، صرف تواتر سے بولے جانے کی بنا پر، مجھے ازبر ہو گئے— اتحادی، محوری، جرمن، ماژی نولائین اور نہ جانے کتنے، جو سب کے سب میرے لیے محض ایسے الفاظ تھے جو میرے کان میں پڑتے رہتے تھے۔

ابا اور ہمارے ہمسائے باغیچے میں بیٹھ کر انھی سب پر باتیں کیا کرتے اور باتوں ہی باتوں میں دو گروہوں میں بٹ جاتے۔ ایک انگریزوں کی فتح کا خواہاں ہوتا تو دوسرا جرمنوں کی کامیابی کا دعا گو۔ میرے ابا کا تعلق آخرالذکر گروہ سے تھا، اس لیے میں بھی جرمنوں کی کامیابی کی دعا مانگا کرتا۔ اکثر میں ابا کو کہتے سنتا: ''جرمنوں کی فتح کا مطلب ہے انگریزوں کا مصر سے انخلا۔'' اگرچہ ہمارے ساتھ والے ہمسائے چچا حسن کو یقین تھا کہ ''اگر انگریزوں نے مصر خالی کیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ جرمن اس میں گھس پڑیں گے۔'' بزرگ اسی طرح دیر تک اپنی زوردار بحثا بحثی جاری رکھتے جو ایک رات کو جہاں ختم ہوتی دوسری رات کو وہیں سے پھر شروع ہو جاتی۔ ادھر ہم بچے کھیل کھیل میں دو ٹولیوں میں بٹ جایا کرتے، ایک انگریز تو دوسری جرمن۔ ظاہر ہے میں دوسری ٹولی سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر ہم اپنی بچکانہ جنگوں میں جٹ جاتے جس کی وجہ سے آخر کار ہم سب ہانپتے کانپتے تھک تھکا کر چور ہو جاتے تھے۔

جب سونے کا وقت ہو جاتا تو میں اپنے بستر میں جا گھستا اور کچھ دیر تک باغیچے سے آتی بزرگوں کی آوازیں سنا کرتا جن میں مَیں ابا کی آواز کو الگ سے پہچان لیتا۔ پھر لیٹے لیٹے اپنے ذہن میں جرمنوں کی

اس قسم کے مکان کی رہائش بچوں کی صحت کے لیے بہت اچھی رہے گی۔ میرے دادا کا منصورہ میں بہت پیارا سا گھر تھا۔ ایک ایکڑ کا تو باغ ہی تھا اس میں۔ ذرا سوچو! اور ہاں، اوپر کپڑے دھونے کے لیے کوئی جگہ ضرور نکالنا، اور ایک کمرہ ملازموں کے لیے بھی...''

''ملازموں کے کمرے سے کیا مطلب ہے تمھارا؟'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''میں نے تو اپنی زندگی کے قیمتی سال اس خواب کو حقیقت بنانے میں لگا دیے، اب میں تم سے درخواست کروں گا کہ اس کو فضولیات میں تو نہ بدلو۔''

''اچھا اچھا، اور گیراج؟ بنگلے میں گیراج تو ہونا ہی چاہیے۔''

''مگر میرے پاس کار کہاں؟''

''کبھی تو کار ہوگی۔ جو گیراج نہ ہوگا تو کہاں رکھو گے بھلا؟'' اس نے پکار کر بیٹی سے کہا کہ اپنے بھائی کو لے کر آ جائے، اور پھر وہ خود تیکھا سا قہقہہ لگاتی بچوں کے پیچھے کسی کم سن لڑکی کی طرح دوڑیں لگانے لگی۔

ان تینوں کو پلاٹ کے بیچوں بیچ اس حالت میں دیکھتے دیکھتے میرا دھیان بھٹک کر بہت دور نکل گیا اور پھر اسی وقت پلٹا جب میری بیوی پلٹ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی اور دوبارہ اپنی باتیں کلی پھندنے لگا کر دہرانے لگی اور میں اپنے دھیان میں کھویا ہوا تھا — نہیں، میں اس کی باتوں کا جواب دیتا رہا تھا۔

زمان و مقام سے بہت دور مجھ کو ایک پرانا گھر یاد آ گیا۔ مقام تو تھا اسمٰعیلیہ؛ رہ گیا زمانہ تو اس کا اندازہ میں اپنی عمر سے لگا سکتا ہوں۔ میں اُس وقت آٹھ نو برس کا تھا۔ اس بستی میں ہمارا مکان تھا، معمولی سا یک منزلہ مکان جس کے چہار اطراف ایک مختصر مگر خوب صورت سا باغیچہ تھا۔ بہر حال اس میں ملازموں کے لیے کوئی کمرہ نہیں تھا کیونکہ ہمارے پاس ملازم ہی نہیں تھے۔ نہ ہی اس میں کوئی گیراج تھا کیونکہ میرے ابا نے اپنی زندگی میں کبھی کسی ذاتی کار میں قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے باغیچے میں انگوروں کی ایک ٹٹی تھی، آم کے دو پیڑ تھے، لیموں کا ایک جھاڑ تھا، اور مرغیوں کے لیے ایک بڑا سا دڑبا تھا۔ مجھ کو یہ بھی یاد آیا کہ ابا کو گھر میں آئے ایک منٹ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کھرپی اٹھا کر باغیچے میں کام سے لگ جاتے تھے جس کی باڑھ چنبیلی کی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھ کو یہ یاد نہیں کہ ہم اس مکان کے مالک کب بنے تھے یا کب اس میں بود و باش اختیار کی تھی؛ پر اتنا یاد ہے کہ ابا کو اس پر بے انتہا ناز تھا اور میری امی اس کے ملکیت میں آنے کو ایک عظیم الشان تاریخی واقعہ سمجھتی تھیں، چنانچہ انھوں نے اس کو خود اپنی اور اپنے کنبے کی زندگی کے دیگر واقعات کا صحیح وقت متعین کرنے کا پیمانہ بنا لیا تھا۔ کئی بار میں نے ان کو کہتے سنا، ''جب ہم اس مکان میں اترے اس وقت فلاں پیٹ میں تھا''، یا ''جب ہم نے یہ مکان خریدا تو میرے میاں کی تنخواہ اتنی تھی''، اور اسی طرح کی اَور باتیں جن کو یاد کر کے میں اب بھی مسکرا اٹھتا ہوں۔

کی مٹھائی بھی لانا گوارا نہیں کیا،'' اس نے میرے خالی ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''ان کو خالی خولی مٹھائیاں اور کھلونے دلانے سے اب میں بیزار آ گیا ہوں،'' حیرت پیدا کرنے کی خاطر اس سے بہتر تمہید باندھنے میں ناکام ہو کر میں نے اپنی بغل میں دبا بڑا سا لفافہ نکالا اور بیوی کے حوالے کر دیا۔
''میرا تحفہ اس لفافے میں ہے،'' میں نے اسے بتایا۔ اس نے کاغذات نکالے اور ان پر نظر دوڑانے لگی، اور میں اپنی اس توفیق پر اتراتے ہوئے اس پر نظریں گاڑے رہا۔ بیک نظر ان دستاویزات کی اصلیت کو پانے میں ناکام ہو کر اس نے سوالیہ انداز میں اپنا حسین چہرہ اٹھایا اور چیخی، ''یہ کیا ہے؟''
''ان کے لیے ایک گھر،'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ہشام پیچھے سے آیا اور میری ٹانگوں میں اپنا منھ دے کر دھیمے دھیمے ہنسنے لگا۔ میں نے جھک کر اس کو اٹھا لیا اور اپنی بیوی پر ہونے والے غیر متوقع ردعمل سے بالکل بے خبر اپنے بیٹے کو پیار کرنے لگا۔
اس پل کے بعد بیوی کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ حد یہ ہے کہ اس نے میری محبت کا وہ پرانا قصہ چھیڑا ہی نہیں جس سے وہ چند دن پہلے واقف ہو چکی تھی۔ پتا نہیں اس نے اسے بھلا دیا تھا یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ بلکہ وہ تو نہایت نرم خو اور بشاش ہو گئی اور شاید ہی ہمارا کوئی عزیز یا جاننے والا بچا ہو جس کو اس نے یہ نہ بتایا ہو کہ ہم اپنا مکان بنانے جا رہے ہیں۔ اصل میں اس کو تو اب مکان کے سوا کوئی اور بات کرنے میں لطف ہی نہیں آتا تھا۔
ایک دن ہم چاروں اپنا پلاٹ دیکھنے گئے، یعنی بقول اس کے ''موقعے کا معائنہ کرنے۔'' ہم پلاٹ کے ایک کونے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ وہ میرے پاس کھڑی مارے خوشی کے پھولی نہ سما رہی تھی۔ دونوں بچے قریب ہی خوش خوش دوڑیں لگا رہے تھے، شور مچا رہے تھے اور گرد و غبار کے چھوٹے چھوٹے مرغولے اڑا رہے تھے۔
میری بیوی بتائے جا رہی تھی کہ مکان کس طرح کا ہوگا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے بار بار دہرا رہی تھی: ''ایک منزلہ ہوگا، ہے نا؟ جب بچے بڑے ہو جائیں گے تو ہم ایک منزل اور چڑھا لیں گے۔ ہم اس کو بڑے باغ سے گھیر دیں گے۔ اس کی دیکھ بھال میں خود کروں گی۔ میں اس کو پھولوں سے پاٹ دوں گی۔ تمھیں کس طرح کے پھول پسند ہیں جی؟ ہے نا ہنسی کی بات کہ پانچ برسوں میں میں یہ بھی نہ جان پائی کہ تمھیں کون سا پھول پسند ہے۔''
''مجھے چنبیلی پسند ہے۔''
''ہم باغ کو چنبیلی سے پاٹ دیں گے،'' وہ چلائی۔ پھر بولنے لگی، ''شہر کے شور اور دھوئیں سے دور،

محمود دیاب

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

ایک گھر اپنی اولاد کے لیے

یہ تو خیر ممکن ہی نہیں کہ یہ خیال مجھے وقت کے وقت سوجھ گیا ہو، کہ میں تو سدا سے ایک ذاتی مکان کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ گو خوابوں میں اس کے خدوخال کچھ اتنے زیادہ صاف نظر نہیں آتے تھے، مگر اس کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ اس پر حرارت اور راحت کی ایک فضا سی محیط رہتی۔ چناں چہ جیسے ہی مجھے موقع میسر آیا، میں نے اس کو فی الفور ایسے جھپٹ لیا جیسے میرا جینا اسی پر منحصر ہو۔

خود میرے لیے یہ سودا کوئی اتفاقی امر نہیں تھا مگر میری بیوی کے لیے یہ کچھ اتنا حیران کن تھا کہ وہ مارے خوشی کے اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ دراصل میں نے خالی خولی ہوائی قلعے کے بجائے شہر کے مشرقی علاقے میں قائم کی گئی ایک نئی رہائشی بستی کے ایک خالی پلاٹ کے حقیقی بیع نامے کی شکل میں اپنی بیوی کی حیرت کا سامان کیا تھا، ورنہ پھر اس میں گرم جوشی پیدا نہ ہوتی۔

یہ اس دن کی بات ہے جس دن ہمارے بچوں، ہالہ اور ہشام، کی سالگرہ تھی۔ ہماری بیٹی کی عمر چار سال اور بیٹے کی تین سال تھی۔ دونوں کی پیدائش ایک ہی ماہ کی تھی، گو تاریخیں جدا جدا تھیں، اس لیے ہم دونوں کی سالگرہ ایک ہی دن منایا کرتے تھے۔

اس دن گھر پہنچنے پر بیوی نے پوچھا، ''کیا بھول گئے تھے کہ بچوں کی سالگرہ ہے؟''

''نہیں تو، بھولا تو نہیں،'' میں نے بے چینی کو چھپاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ تمھارے پلے کچھ بھی نہیں،'' اس نے چھینٹا کسا۔

''نہیں نہیں، میں قلاش نہیں ہوں۔''

''ایک وہ ہیں کہ کب سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں اور ایک تم ہو کہ تم نے ان کے واسطے ایک پیاستر

لازمی ہے۔ زعتر صاحب نے پہلی مرتبہ اسی وقت نوٹ کیا کہ ان کا باس اپنا تمام قد و قامت اور گورا رنگ کھو چکا تھا اور اب وہ کسی کالے ٹھگنے بونے سے زیادہ ملتا جلتا لگ رہا تھا۔ ان کے ساتھی اس بدہیئت آدمی کو بار بار ٹو کے جا رہے تھے، جبکہ زعتر صاحب نے اپنے آپ کو قہقہے مارتے ہوئے پایا۔ انھوں نے اپنے باس کی موجودگی میں اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کی مگر ان کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس دوران شدید صاحب ان کو دیکھ دیکھ کر ان سے چپ ہو جانے کی منتیں کر رہے تھے مگر اس کا الٹا اثر ہو رہا تھا، کیونکہ اب دوسرے لوگ بھی ان کے قہقہوں میں شامل ہوتے جا رہے تھے، بلکہ ایک نے تو شدید صاحب کے قریب جا کر ان کی گدی پر ایک چانٹا بھی رسید کر دیا تھا جس کے باعث ان کی عینک زمین پر جا گری تھی اور ان کو جھک کر اسے اٹھانے کی کوششیں کرنی پڑ رہی تھیں۔

اچانک زعتر صاحب کو احساس ہوا کہ وہ پائجامہ پہنے ہوئے ننگے پیر ہی آفس آ گئے ہیں۔ ان کو بے تحاشا شرم کا احساس ہوا اور انھوں نے گھبرا کر اپنے آپ کو چھپانے کی یا پھر کم از کم ارد گرد سے ڈھونڈ کر ایک جوتا ہی پیر میں ڈالنے کی بہت کوشش کی۔ اس گھبراہٹ اور اضطراب میں ان کی آنکھ کھل گئی...

صبح کی روشنی ان کے کمرے میں چھننا شروع ہو گئی تھی۔ ان کی بیگم بستر سے اٹھ چکی تھیں اور وہ خط جو وہ اپنے باس کو لکھنا چاہ رہے تھے اب تک کرسی پر پڑا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے انھوں نے خط اٹھا کر دوبارہ سے پڑھا۔

انھیں گذشتہ روز ہونے والی ساری باتیں یاد آ گئیں اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کے زخم اب تک کھلے ہوئے اور تازہ ہیں۔ انھوں نے اس خط کو، اس عمل کی لغویت کا ادراک ہونے کے بعد، پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر انھیں خیال آیا کہ کسی ٹوہ میں رہنے والے جمعدار کو ان کا خط جوڑ کر پڑھنے کا دورہ نہ پڑ جائے اور پھر وہ ان کی اس ذلت تک نہ پہنچ جائے، چنانچہ انھوں نے خط کے ٹکڑوں کو جمع کیا اور ان کو مزید چھوٹے ٹکڑوں میں پھاڑ دیا۔

بیگم کے قدموں کی آہٹ پر، جن کو ان کے جاگنے کا پتا چل چکا تھا، انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ان کو اپنے سوٹ اور جوتے تیار کرتے ہوئے پایا۔ جوتوں پر لگی کیچڑ کے خشک ہو جانے پر وہ ان کو برش سے صاف کر چکی تھیں۔

دو پیو گے۔ مت بھولو کہ میں گاڑی چلا رہا ہوں— پھر میں تمھاری طرح کا پکا شرابی بھی نہیں ہوں۔''

''تم سے کس نے کہا کہ میں پکا شرابی ہوں؟''

''تم شہر کے ہو، اور پھر میرا خیال ہے یوروپ میں تمھاری زندگی ان چیزوں سے خالی تو نہیں گذری ہوگی۔ رہا میں، تو میں تو ابھی پڑھ رہا ہوں، اور اگر کہیں میرے باپ کو بھنک پڑ جائے تو وہ مجھ پر بندوق نکال لے— حالاں کہ موصوف خود اپنے وقت میں خوب لگمی چڑھاتے رہے ہیں۔ آہ، ہمارے بزرگ کس قدر ظالم تھے، کھجور کے قلب کے شیرے سے مدہوش ہونے کی خاطر سالم درخت کو قتل کر دیتے تھے۔''

''آہ، یوروپ...'' مصباح سعید نے جیسے خود سے بات کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے ایک سینڈوچ لیا اور اسی لہجے میں اضافہ کیا:

''یوروپ، اس نے مجھے زیر کر لیا۔ میں تمھاری طرح تھا۔''

''یوروپ کی باتوں کو تیسرے گلاس کے بعد کے لیے اٹھا رکھو،'' جبور نے دوسرا گلاس تھماتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ''اس موضوع سے مجھے بے حد دلچسپی ہے۔ مجھے وظیفے پر فرانس بھیجنے کا وعدہ کیا گیا تھا تاکہ میں اپنے زرعی مشیر کے پیشے میں ترقی کر سکوں۔ زرعی مشیر— کیا پیشہ ہے! تمھیں اندازہ ہے کہ یہ کس قدر مصیبت کا کام ہے؟ اُف، یہ طوارگ ☆، کسی زرعی منصوبے میں ذرا تعاون نہیں کرتے۔ وہ اب تک اسی گمان میں ہیں کہ وہ اشراف ہیں، صحرا کے سورما ہیں، اور کاشتکاری اور کاشتکاروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔''

اس نے دانتوں سے سینڈوچ کاٹا اور اسے چباتے ہوئے بولتا رہا:

''مگر... وہ ہیں اچھے لوگ... اور ان کی... مدد کرنی چاہیے۔''

وہ مصباح سعید کی طرف مڑا جو درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا افق پر جھلملاتے سراب کو تک رہا تھا۔

''تم فکرمند دکھائی دیتے ہو۔ اب یوروپ کے بارے میں سوچنا چھوڑو۔ میں نے کہا نا، تیسرے گلاس کے بعد۔ تیسرا گلاس تمھیں وہ سارے راز کھولنے پر مجبور کر دے گا جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔''

''یوروپ میں کچھ بھی راز نہیں ہوتا۔''

''دیکھیں گے، دیکھیں گے۔ دوسرے گلاس کے بعد بھی تم فکرمند لگ رہے ہو۔ آہ، مجھے یاد آیا— غات کے گورنر کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ یہ تو کسی صحافی کے لیے دھماکے کی خبر ہوگی۔ وہ بہت

☆ طوارگ: شمالی افریقہ کے صحراؤں میں پائے جانے والے خانہ بدوش قبائل جو اپنی گذر اوقات کے لیے گلہ بانی پر انحصار کرتے ہیں اور جدید سیاسی سرحدوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، لیبیا، مراکش، الجزائر اور براعظم کے دوسرے ملکوں کے صحراؤں میں ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان کی جانب مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔

منکسر مزاج آدمی ہے، اس نے تمھیں وہ قصہ نہیں سنایا کہ اس نے کس طرح سن ستاون کے حملے میں، اپنے تین بچوں کے ساتھ، تن تنہا، پورے فرانسیسی بکتر بند دستے کا مقابلہ کیا تھا — اپنی تحقیق میں اس واقعے کو شامل کرنا مت بھولنا۔"

"یوروپ جانے سے پہلے،" مصباح نے اپنی خواب آلود آواز میں اس کی بات کاٹی، "میں تمھاری طرح تھا۔"

اس نے جبور کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

"یوروپ مت جانا،" اس نے مضبوط لہجے میں کہا، "میں تمھیں اس کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا..."

جبور نے استفسار کے انداز میں اپنا سر اٹھایا۔ جبور سے ایک سگریٹ لیتے ہوے وہ بولا:

"اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے۔"

"تیسرے گلاس کے بعد بھی؟"

"دسویں کے بعد بھی۔"

کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ پیشانی سے بہتے ہوے پسینے کو قمیص کی آستین سے پونچھتے ہوے جبور نے کہا:

"مجھے امید ہے کہ جب تم واپس جاؤ گے تو تمھارے پاس جنوب کی زندگی کے بارے میں اچھا خاصا مسالا ہوگا۔ میرے خیال میں تم اس ملک میں پہلے صحافی ہو جو اپنے پیشے کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔"

مصباح سعید اپنے سگریٹ کے دھویں کو ہوا میں تیرتے دیکھتا رہا۔

"ہاں،" اس نے مایوس لہجے میں جواب دیا، "مگر مجھے اس میں کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا۔"

جبور آ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"شاید،" اس نے وسیع خلا کو گھورتے ہوے، راز دارانہ انداز میں کہا، "مگر میں اسے یوں نہیں دیکھتا۔ ان بدقسمت لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی بدحالی پر قانع ہیں، مصیبتوں کے سامنے ہار مان لیتے ہیں، جیسے خدا نے ان کی تقدیر میں یہی لکھا ہو۔ ہمارا کام اس قناعت کے احساس کو ختم کرنا ہے، انھیں یقین دلانا ہے کہ وہ بدفطرت لیفٹیننٹ اور اس کا مددگار گورنر پتلوں سے زیادہ کچھ نہیں جنھیں کرسیوں پر بیٹھنے اور حکمرانوں کے نام مشتبہ رپورٹیں لکھ لکھ کر بھیجنے کے لیے رکھا گیا ہے۔ ان کی قناعت کو ختم کرنا مشکل ہے، مگر کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔"

اس نے سگریٹ کا کش لیا اور مزید کہا:

"اور یہ کام اخباروں کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔"

''لیفٹننٹ تو اچھا آدمی ہے۔''

''اچھا آدمی؟''

خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ پھر بولا، ''اچھے آدمی قتل نہیں کرتے۔''

''قتل؟''

''اور کیا؟ اس نے مظاہرے میں چونسٹھ لوگوں کو ہلاک اور زخمی کیا۔ اس نے مظاہرہ کرانے پر مجھے آج تک معاف نہیں کیا۔ وہ مجھ پر بڑی شفقت ظاہر کرتا ہے مگر یہ سب ڈھونگ ہے— ڈھونگ اور کمینگی۔ وہ بھولا نہیں ہے کہ اس جرم کی وجہ سے اس کے دو بلّے اتار لیے گئے تھے، اور اس کا خیال ہے کہ میں اب تک لوگوں میں سیاسی کام کر رہا ہوں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ آدمی کا ذاتی مفاد ہر چیز سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔''

مصباح کی آنکھوں میں استعجاب ظاہر ہوا لیکن وہ چپ رہا۔ وہ سراب کو خاموشی، ریت اور دھندلے افق سے زور آزمائی کرتے دیکھ رہا تھا۔

جب لینڈ روور لا انتہا تک پھیلے ہوئے خالی پن میں روانہ ہوئی تو سورج ڈوبنے لگا تھا۔

''صحرا— کس قدر سنسان اور ڈراؤنا ہے!'' مصباح نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

اسٹیئرنگ کو پوری قوت سے پکڑے ہوئے جبور نے تبصرہ کیا:

''ہاں، سنسان اور ڈراؤنا تو ہے، مگر زندگی کی طرح ہے، وجود کی طرح؛ ویرانی اور خاموشی میں دبا ہوا ایک راز۔ یہ آدمی کو ہر چیز کا بہلاوا دیتا ہے، راستے سے بھٹکے ہوئے مسافر کے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز کا۔ یہ اسے پانی کا بہلاوا دیتا ہے، اور جب وہ اس کی طرف دوڑتا ہے تو اسے اپنے سامنے صرف سراب ملتا ہے۔ سراب ہی سراب، سرابوں کا سمندر۔ یہ سراب نظروں کے سامنے ناچتے ہیں اور زبان نکال کر منھ چڑاتے ہیں، اور بے مقصد بھٹکاتے پھرتے ہیں۔ لیکن خبردار، آدمی کو مزاحمت ضرور کرنی چاہیے۔ سراب کو سراب سمجھ کر مایوس نہیں ہو جانا چاہیے، کیونکہ صحرا کا سراب ایک معما ہوتا ہے، جس کے پیچھے سچ مچ کے پانی کو تلاش کرنا لازمی ہے۔ خود کو مایوسی کے حوالے نہیں کر دینا چاہیے، کیونکہ آخر میں، دور، سراب کے پیچھے، نخلستان نہیں تو کنواں ضرور ملے گا۔ اصل بات ہے مزاحمت کرنا— یہ صحرا سے مقابلہ کرنے کا پہلا گر ہے۔''

وہ مصباح کی طرف مڑا اور اس سے ایک سگریٹ سلگا کر دینے کو کہا۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد، جس میں صرف انجن کی گھر گھراہٹ سنائی دے رہی تھی، وہ بولا:

''صحرا کسی عشوہ طراز عورت کی طرح ہے— ناقابل تسخیر، نخرے باز، پہلی بار میں کبھی ہاتھ نہ آنے

والا۔ اس کے راز دریافت کرنے، اس پر قابو پانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے، پھر کہیں اس پر تصرف حاصل ہوتا ہے۔ تمھیں اس میں کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا۔ مگر مجھے ہر چیز میں مقصد نظر آتا ہے۔ صحرا نے مجھے یہی سکھایا ہے۔ جہاں تک یوروپ کا تعلق ہے، اس نے تمھیں اس لیے زیر کرلیا کہ تم نے اس سے ہار مان لی۔''

مصباح نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ باہر کے خلا میں اندھیرے کو اترتے دیکھتا رہا، موٹر کی گھرگھراہٹ سنتا رہا جو اس کے کانوں کو چھیدے ڈال رہی تھی اور جس سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

ریت کی ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پاس پہنچ کر جبور نے گاڑی روک لی۔ وہ باہر نکل کر پہاڑی پر چڑھا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

''آدھی رات کا وقت ہے،'' وہ واپس نیچے اترتے ہوئے بولا، ''اور اُوباری کی روشنیاں دور دور تک دکھائی نہیں دیتیں۔ لگتا ہے، ہم راستہ بھول گئے ہیں۔''

گاڑی سے کود کر باہر نکلتے ہوئے مصباح نے چڑ کر کہا:

''ہمیں شروع ہی سے بڑی سڑک پر رہنا چاہیے تھا۔''

''نہیں، یہ کہو کہ ہمیں اتنی نہیں پینی چاہیے تھی — یہ زیادہ درست ہوگا۔'' جبور نے ہنستے ہوئے خود کو نرم ریت پر گرادیا اور جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

''میں شارٹ کٹ لینا چاہتا تھا،'' سگریٹ جلا کر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے اپنے تجربے پر بھروسا کیا، مگر لگتا ہے کہ صحرا شرابیوں کو معاف نہیں کرتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم چوتھی غلطی سے محفوظ رہیں تو ہمیں سورج نکلنے تک یہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اتنا پٹرول نہیں ہے کہ ہم صحرا میں یوں ہی بھٹکتے پھریں۔ ہمارے پاس پٹرول کا کافی ذخیرہ بھی نہیں ہے۔ یہ ہماری تیسری اور بدترین غلطی ہے۔ آ جاؤ، پیارے دوست، آج رات تو تمھیں مجھ سے یوروپ کی باتیں کرنی ہی پڑیں گی، وقت کاٹنے کے لیے ہی سہی۔''

وہ خوش دلی سے ہنسنے لگا مگر مصباح کے تیور دیکھ کر رک گیا۔ مصباح ٹھنڈی ریت پر ڈھیر ہوگیا تھا اور تاریک خاموشی میں ڈوبے ریت کے ٹیلوں کو دیکھ رہا تھا۔

''تھوڑی دیر میں چاند اپنا چہرہ دکھائے گا،'' جبور اس کی بےچینی کے سبب کو محسوس کرکے، گویا اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''تم دیکھنا صحرا چاندنی رات میں کیسا طلسمی دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ کسی یوروپی عورت کی طرح خود کو عریاں کرے گا تب تمھیں اس طلسم کا لطف آئے گا۔ وہ تم پر اپنے بہت سے راز آشکار کرے گا، اتنے بےشمار راز جتنے ریت کے ذرے۔''

مصباح سعید توجہ سے کان لگائے سنتا رہا۔ اسے لگا کہ کہیں قریب سے، بہت قریب سے، پہاڑی

کے پیچھے سے یا چوٹی سے، آتی ہوئی ڈھول کی تھاپ اور موسیقی کی گونج سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ وہ پھر غور سے سننے لگا: ڈھول کی تھاپ اَور تیز، اور موسیقی کی گونج اَور شدید ہوگئی۔ یہ کوئی افریقی دھن تھی— شدید اور گونج دار، شوریدہ سر اور غمناک۔

مصباح سعید اتنا مضطرب ہوگیا کہ اسے ڈر ہوا کہ کہیں وہ اپنے ساتھی سے ان آوازوں کا تذکرہ نہ کر بیٹھے۔

اس نے اس واہمے سے نجات پانے کے لیے خود کو کسی طرح مصروف کرنے کا ارادہ کیا، اور ایک قدیم لوک گیت گانے لگا۔

چاند کا زرد چہرہ ریتیلی پہاڑی کے پیچھے سے نمودار ہونا شروع ہوا۔ مصباح نے، جو ابھی تک اضطراب کی گرفت میں تھا، دریافت کیا:

''جبور، کیا تمھارے خیال میں آس پاس خانہ بدوش قبائل رہتے ہیں؟ مثلاً طوارگ؟''

''طوارگ کھلے آسمان تلے نہیں رہتے،'' جبور نے سگریٹ سلگا کر کاہلی سے ریت پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی اور دور، خلا میں دیکھا۔ ''ان ویرانوں میں صرف بھیڑیوں، خاموشی اور مختلف قسم کی چھپکلیوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ وہ بھی صرف رات کے وقت— دن میں تو یہاں فقط دھوپ کی تپش اور سراب ہوتے ہیں۔''

''عجیب بات ہے! مجھے کچھ دیر پہلے یوں محسوس ہوا...'' وہ اپنا راز ظاہر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا: ''کچھ دیر پہلے مجھے ڈھول کی دھمک اور کسی دیوانے ساز پر بجائی جانے والی موسیقی سنائی دی تھی۔''

''دیکھا!'' جبور مسکرا کر بولا، ''یہ پہلا راز ہے۔''

''تم مذاق کر رہے ہو۔''

''نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا،'' جبور فوراً سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''یہ صحرا کی دھمک ہے۔''

''صحرا کی دھمک؟'' مصباح نے بچوں کے سے لہجے میں پوچھا۔ ''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔''

''یہ بات نہیں۔ صحرا ایک زندہ وجود ہے، انسان کی طرح اس میں جان اور روح ہوتی ہے اور اس کی جلد میں مسام ہوتے ہیں۔ اسے دکھ بھی پہنچتا ہے۔ رات میں یہ ناچتا ہے، گاتا ہے، ڈھول بجاتا ہے، ساز چھیڑتا ہے۔ وہ شدید جھلستے ہوئے دن کی اذیت ختم ہونے پر جشن مناتا ہے۔ تم صحرا کو نہیں جانتے، مصباح۔''

مصباح خاموش رہا اور جبور نے زرد چاند کی طرف رخ پھیرا۔

''تم افریقی موسیقی کی کامیابی کا راز نہیں جانتے،'' وہ کہتا رہا۔ ''وہ راز یہی ہے کہ یہ موسیقی صحرا کے

پیٹ سے نکلتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کو تکتے رہنے سے وہ پاگل ہو جائیں گے، اس لیے وہ اس کے رقص اور جشن میں شامل ہو گئے اور اس طرح اس کے خوف پر فتح پا کر انھوں نے اسے زیر کر لیا۔ اگر وہ تماشا دیکھنے والوں کا سا انداز اختیار کیے رہتے تو دہشت اور دیوانگی میں مبتلا ہو جاتے۔ وہ اس سے اسی طرح نبردآزما ہوتے ہیں جیسے زندگی سے۔ جب میں نے پہلی بار یہ دھمک سنی تھی تو دہشت میں آ گیا تھا، لیکن بعد میں مجھے اس کی عادت ہو گئی۔''

''میں نے تو اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔''

''اور سنو گے بھی نہیں۔ تم شہر والوں نے خود کو شہروں میں قید کر لیا ہے اور زندگی اور دوسری چیزوں کی شکایت کرتے رہتے ہو۔ تم بھلا صحرا کو کیسے سمجھ سکتے ہو؟ میں نے تمھیں بتایا ہے، صحرا عورت کی طرح ہے جسے شروع ہی میں جان لینا دشوار ہے۔ اگر تم اس کے رازوں سے واقف ہونا چاہتے ہو تو تمھیں طویل عرصے کے لیے اس کی قربت اختیار کرنی پڑے گی۔''

اس نے اپنے جوتے اتار دیے اور ہاتھ اور پیر ٹھنڈی ریت میں دھنسا لیے۔

''صحرا کتنا غم زدہ ہے،'' اس نے رکتی ہوئی آواز میں کہا، ''اسے دن کے ہاتھوں اذیت اٹھانی پڑتی ہے، دھوپ اس کی ہڈیاں پگھلا دیتی ہے۔ وہ ریت کے باریک ذروں پر طلسمی دھنیں چھیڑ کر اپنے ازلی غم کی شکایت کرتا ہے۔ وہ موسیقی چھیڑتا رہتا ہے، ڈھول بجاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ صبح اسے آ لیتی ہے، اور وہ ایک بار پھر اپنا بدن اپنے جلاد سورج کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ازلی و ابدی اذیت کا سفر جاری رہتا ہے۔''

جبور نے زمین پر سر جھکا رکھا تھا، اس کے ہاتھ اور پیر ریت میں دبے ہوئے تھے۔ مصباح سعید کو محسوس ہوا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔ وہ خاموشی سے اسے تکتا رہا، پھر اس کے کانوں میں ڈھول کی آواز ہلکورے لیتی ہوئی داخل ہوئی— غمناک اور شوریدہ سر۔

بڑی سڑک تک پہنچنے سے پہلے گاڑی کا پٹرول ختم ہو گیا۔ جبور نے پانی کا گیلن لے کر لینڈ روور پر سے چھلانگ لگائی۔

''ہم العوینات کی پولیس چوکی جا چکے ہیں، اس لیے وہاں سے مدد ضرور آئے گی۔ ان کے تلاش شروع کرنے سے پہلے ہمیں سڑک تک پہنچ جانا چاہیے۔''

''ہم نے سڑک سے اتر کر ہی غلطی کی۔''

''اصل غلطی تو یہ تھی کہ ہم نے بہت پی لی۔ مجھے ابھی سے پیاس لگنے لگی ہے۔ میں نے ایک ایسا گناہ

کیا ہے جسے صحرا کبھی معاف نہیں کرے گا۔''
اس نے پانی اٹھالیا اور دونوں سڑک کی سمت چلنے لگے۔

دوپہر ہوگئی۔ سورج اپنے بے لگام شعلوں کے ساتھ صحرا کے بدن کے بالکل قریب آ گیا۔ پانی کا آخری قطرہ تک ختم ہو چکا تھا مگر وہ سڑک تک نہیں پہنچے تھے۔

مصباح اپنی سانس درست کرنے کے لیے جُھلستی ہوئی ریت پر بیٹھ گیا جبکہ جبور انگلیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے :وے اپنے سامنے حدنظر تک پھیلی ہوئی وسعت کو دیکھ رہا تھا۔
''میں کہیں نہیں جا رہا'' مصباح اپنے منھ کے اندر کی دیواروں اور سوکھے ہوے ہونٹوں کو زبان پھیر کرتر کرنے کی کوشش کرتے ہوے بولا۔ ''مجھ میں اب دم نہیں ہے۔''
جبور نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن اس نے سختی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

اس نے جبور کے بولنے کی آواز سنی، پھر اسے اپنے پاس بیٹھتے ہوے محسوس کیا، پھر اسے لگاتار باتیں کرتے اور ہاتھوں سے مسلسل اشارے کرتے ہوے دیکھا، مگر اسے آواز نہیں آ رہی تھی، وہ کچھ نہیں سن رہا تھا، کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ جب جبور نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا تو سب کچھ تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا، گرتا، پھر اسے پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹنے لگتا، اور نرم صحرا اپنی غمناک، بوجھل دھن پھر چھیڑ دیتا۔

نارنجی چمک میں سورج کی ٹکیا افق سے ہم آغوش ہوگئی۔ جلتی ہوئی شعاعیں دن بھر بستی کو گویا دہکتی ہوئی سلاخوں سے پیٹتی رہی تھیں۔ تمازت کے ختم ہوتے ہی چھپکلیاں اور کیڑے مکوڑے اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے اور جھاڑیوں، ویران جگہوں اور کھجور کے درختوں میں پھرنے لگے۔ لوگ بھی، جو دن بھر اپنی جھونپڑیوں میں گھسے رہے تھے، باہر نکل کر اپنے کاشت کیے ہوے کھیتوں کی طرف چل دیے اور آبپاشی کی سوکھی نالیوں کو بھرنے کے لیے پمپ چلانے لگے۔
گیسٹ ہاؤس کے سامنے کے احاطے میں بڑے بڑے سفید صافوں والے، بستی کے بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے اور تجسس بھری آنکھوں سے کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے۔
لینڈ روور، اپنے پیچھے گرد کا ایک طویل سلسلہ چھوڑتی ہوئی، آ پہنچی۔ بستی کے لوگ بھاگ کر بلدیہ کی عمارت کی پشت پر لگے ہوے کھجور کے درختوں میں جا چھپے۔ دراز قد لیفٹننٹ نے باہر قدم رکھا؛ وہ یونیفارم

میں ملبوس تھا اور اس کے کندھوں پر چاندی کے دو بلے چمک رہے تھے؛ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ وہ گیسٹ ہاؤس کے احاطے میں پہنچ کر رکا اور اندر داخل ہونے سے پہلے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

''اب تمھارا کیا حال ہے؟'' اس نے، لکڑی کی کرسی پر بیٹھتے ہوے، کسی جذبے کے بغیر سوال کیا۔

مصباح سعید بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پیٹھ دیوار سے لگالی۔

''خدا کا شکر ہے،'' وہ بولا۔ ''میری طاقت رفتہ رفتہ واپس آرہی ہے۔ تازہ ترین خبر کیا ہے؟''

لیفٹننٹ نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ مصباح سعید کو پیش کیا، جس نے لیفٹننٹ کا سگریٹ سلگانے کے لیے دیا سلائی جلاتے ہوے اپنا سوال دہرایا:

''کیا خبر ہے؟''

''کچھ نہیں۔ آخری رپورٹ مجھے کچھ دیر پہلے ملی تھی — ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔ گاڑیاں مسلسل صحرا کی خاک چھان رہی ہیں۔''

جھینگروں کی آوازیں اور بستی والوں کی دبی دبی سرگوشیاں خاموشی کو چیر رہی تھیں جو دوبارہ گیسٹ ہاؤس کے گرد جمع ہوگئے تھے۔

''تمھیں بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے۔''

''میرا خیال ہے اب وقت گذر چکا ہے،'' لیفٹننٹ اس تجویز کے جواب میں بولا۔ باہر خاموشی میں جھینگروں کا شور اور پمپوں کی گھر گھراہٹ اور بلند ہوگئی تھی۔ لیفٹننٹ نے اپنی بات دہرائی:

''میرا خیال ہے اب وقت گذر چکا ہے۔''

پمپوں کی گھر گھراہٹ تھم گئی تھی، بستی والے اپنی جھونپڑیوں میں واپس چلے گئے تھے، اور رات کیڑے مکوڑوں اور چھپکلیوں کی آماج گاہ بن گئی تھی؛ صرف جھینگروں کی مسلسل ماتمی آوازیں خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔ ایرانی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوے، سویلین کپڑوں میں ملبوس لیفٹننٹ راکھ میں چھپے انگاروں کی آنچ پر سبز چائے تیار کر رہا تھا۔

''انھوں نے اسے کنویں میں ڈوبا ہوا پایا،'' اس نے کہا۔ ''وہ بالکل ننگا تھا۔''

اس نے کھجور کی شاخ کا پنکھا جھل کر انگاروں پر سے راکھ ہٹائی اور دھیمی آواز میں کہتا رہا:

''تمھیں پتا ہے، شدید پیاس کے عالم میں آدمی یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ اس کے کپڑے اس کے جسم پر بہت بھاری ہوگئے ہیں، اور وہ خود کو ہر بوجھ سے آزاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ننگا پھرنے کی شرم سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے۔''

''پیاس،'' اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنی بات پھر شروع کی، ''پیاس اس کے ذہن سے یہ بات محو کر دیتی ہے کہ کپڑوں کے بغیر کنویں پر پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انھیں پھاڑ کر وہ ان کی رسی بنا سکتا تھا اور کنویں کے پانی میں بھگو کر اسے چوس سکتا تھا۔ مگر کپڑوں سے اس نے خود کو آزاد کر لیا ہے اور اب اسے ایک سفاک انتخاب کا سامنا ہے — یا تو وہ کنویں کی منڈیر پر سے جھانک کر پانی کو دیکھتے دیکھتے پیاسا مر جائے، یا پھر پانی میں، یعنی کنویں میں، ڈوب کر مر جائے۔''

وہ چائے میں چمچ ہلانے لگا۔ پھر اپنی آواز کے لاتعلق لہجے کو تبدیل کرنے کی کوشش کیے بغیر اس نے اپنی بات جاری رکھی:

''تم تصور کر سکتے ہو کہ آدمی کے لیے پچاس میل کا راستہ طے کرنے کے بعد آخر میں کنویں کی تہہ میں ڈوب کر مر جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس نے بہت دیر تک مزاحمت کی، اور پوری طرح ناامید اور پاگل ہونے پر ہی کنویں میں چھلانگ لگائی۔''

اس نے مصباح کو چائے کا فنجان تھمایا جو اس نے فرش پر اپنے سامنے رکھ لیا۔ وہ خاموش رہا، اس کی پیٹھ ٹھنڈی دیوار سے لگی ہوئی تھی اور وہ باہر سے آتی ہوئی جھینگروں کی ماتمی آوازیں سن رہا تھا۔ اپنے انگوٹھے کو ایرانی غالیچے پر بنے ہوئے نقش پر پھیرتے ہوئے وہ آہستہ سے بولا:

''لیفٹننٹ، میں نے خشک سالی اور قحط کے دنوں میں الحمادہ الحمرا میں پیش آنے والا ایک قصہ سنا تھا۔ ایک بدّو کو کھلے آسمان تلے ایک راہزن ملا جو اسے اس کے اونٹ سے محروم کرنا چاہتا تھا۔ بدو نے اس سے التجا کی کہ یہ اس کا واحد اونٹ ہے اور وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنی جان پہچان کے ایک رئیس کے پاس لے جائے گا جسے اپنے اونٹوں اور بھیڑوں کے گلے کے لیے کسی گلہ بان کی ضرورت ہے۔ رئیس کے گاؤں کو جانے والے راستے پر راہزن کا پاؤں جنگ عظیم کے زمانے کی لگائی ہوئی ایک بارودی سرنگ پر پڑ گیا۔ جب اسے اپنے پاؤں کے نیچے سرنگ محسوس ہوئی تو اس میں انسانی رحم دلی بیدار ہو گئی اور اس نے بدو سے بھاگ کر جان بچانے کو کہا۔ لیکن راہزن کی اس انسانیت پر متعجب ہو کر بدو نے اس کے پاؤں کے نیچے ایک گہرا گڑھا کھودنے پر اصرار کیا۔ گڑھا کھود کر اس نے راہزن سے کہا کہ وہ اس کے دور چلے جانے کے بعد پلٹ کر اس گڑھے میں گر جائے۔ بدو بھاگ کر اتنی دور چلا گیا کہ راہزن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب راہزن نے احتیاط سے اپنا پاؤں سرنگ پر سے ہٹایا اور پلٹ کر پیچھے گڑھے میں جا گرا۔ مگر بدّو سرنگ کے ایک اڑتے ہوئے بارودی ٹکڑے کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا، جبکہ راہزن کو خراش تک نہ آئی۔ تم میری بات سمجھے، لیفٹننٹ؟''

''سمجھ گیا۔''

''ہمیشہ معصوم شخص مارا جاتا ہے اور راہزن کو خراش تک نہیں آتی۔ سمجھے تم، لیفٹنٹ؟''

''سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ زندگی... زندگی صحرا کی طرح سفاک ہے۔ صحرا میں زندگی ایک جرم ہے۔ میں نے یہ بات کوہ اکاکس کی دیواروں پر تیفیناغ☆ رسم الخط میں لکھی ہوئی دیکھی تھی اور طوارگ کے ایک عالم شیخ نے ترجمہ کر کے مجھے سنائی تھی۔''

مصباح سعید دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا رہا۔ کچھ لمحوں بعد خاموشی کی آنتوں میں سے اٹھتی ہوئی ڈھول کی دھمک سنائی دینے لگی — تیز، شوریدہ سر اور گونج دار، پھر بھی بے حد غمناک دُھن۔

دھمک مسلسل سنائی دیتی رہی، پھر اس میں گانے کی آوازیں بھی شامل ہوگئیں: ایک عجیب گیت جو ماتم کی آوازوں سے مشابہ تھا۔ اسے گانے اور ڈھول کی دھمک میں ملی جلی چیخوں اور کراہوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس نے سر جھٹک کر ان آوازوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ اپنی اس کیفیت کے باوجود اس نے پوچھا۔

''کیا تمھیں ڈھول بجنے کی آواز سنائی نہیں دیتی؟''

''کیوں نہیں۔ یہ طوارگ ناچ گا رہے ہیں۔''

''طوارگ؟''

''طوارگ ہر جمعے کو، آدھی رات کے وقت جمع ہو کر صبح تک گاتے اور ڈھول کی آواز پر رقص کرتے ہیں۔ یہ ان کا طریقہ ہے۔''

پھر وہ اٹھا اور جوتے پہننے لگا۔

''تمھیں آرام کرنا چاہیے۔ کل بہت لمبا سفر کرنا ہے۔''

وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں مصباح نے ڈھول کی آوازوں میں الجھی ہوئی لینڈ روور کے انجن کی گھرگھراہٹ سنی۔ وہ کچھ دیر سنتا رہا؛ پھر کپڑے بدل کر باہر نکل گیا۔

وہ تاریکی میں ڈوبے کھجور کے درختوں میں سے راستہ بناتا ہوا بڑھتا گیا۔ وہ قبرستان میں سے ہو کر گذرا۔ ایک ریتیلی پہاڑی کے پیچھے اس نے ڈھولوں کے گرد عورتوں کو سیاہ لباس پہنے، ایک حلقے کی شکل میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ حلقے کے درمیان نقاب پہنے ہوئے مرد بڑی بڑی سفید پگڑیاں باندھے رقص کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پکارتے تھے۔ ان کے رقص کرتے ہوئے جسم تشنج کی سی کیفیت میں تھے اور وہ

☆ تیفیناغ: طوارگ قبائلیوں کی زبان کا نام۔

مٹھیوں سے اپنے سینوں پر ضربیں لگا رہے تھے۔

وہ پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر ان کا دیوانہ وار رقص دیکھنے لگا۔ ان کے ڈھولوں کی گونج دار دھمک، ان کی کربناک چیخیں اور ان کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی، جو یوں لگتی تھی جیسے وہ کسی مرنے والے کا ماتم کر رہے ہوں۔ یہ شور تاریکی، صحرا اور رات کی خاموشی کو چیر رہا تھا۔

کھڑکی کے شیشوں اور دروازوں سے ٹکراتی ہوئی تیز ہواؤں نے اسے صبح سویرے جگا دیا۔ وہ استقبالیہ کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا؛ ریت اس کے بالوں کی جڑوں میں، گردن کے گرد اور لباس کے اندر گھسی جا رہی تھی۔

لیفٹننٹ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گرمیوں کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس سے علیک سلیک کیے بغیر اس نے پوچھا:

''تم تیار ہو؟ ہمیں طوفان کے اَور شدید ہونے سے پہلے روانہ ہوتا ہے تاکہ سہ پہر کا جہاز نہ نکل جائے۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔''

لیفٹننٹ اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھ گیا اور لینڈ روور کو بے حد تیز رفتاری سے دوڑانے لگا جو ایک ایسے دن کے لحاظ سے خطرناک تھی جب اڑتی ہوئی گرد کی وجہ سے تین میٹر کے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ان کے ایک دوسرے سے ایک لفظ کہے بغیر پندرہ منٹ گذر گئے۔ اس کے بعد لیفٹننٹ نے کہا:

''مہربانی کر کے ایک سگریٹ تو دینا۔''

مصباح نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ لیفٹننٹ کے لیے اور دوسرا اپنے لیے سلگایا۔ کش لگاتے ہوئے لیفٹننٹ نے کہا:

''آدمی کو ہر چیز کا پورا لطف اٹھانا چاہیے۔'' پھر وہ کھانسا اور بولا، ''سگریٹ پینے کا بھی۔''

''ہاں۔ ہر چیز کا لطف اٹھانا چاہیے۔'' مصباح نے طنز کے سے انداز میں تبصرہ کیا۔ پھر وہ لیفٹننٹ کی نقل اتارتے ہوئے کھانسا اور اسی کا لہجہ بنا کر بولا، ''جرم کرنے کا بھی۔''

لیفٹننٹ نے سر گھما کر تیزی سے اس کی طرف دیکھا، اس کا نچلا ہونٹ کانپنے لگا۔

''کیا؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے تمھارا؟''

''کچھ نہیں۔''

ان کے درمیان خاموشی چھا گئی اور لیفٹننٹ نے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

مصباح کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جب وہ چونکا دینے والے سکون کے ساتھ بولا:

''تم نے اسے کیوں قتل کیا؟''

''میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔''

''تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ کل لوگوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

لمحے بھر کی خاموشی کے بعد لیفٹیننٹ نے جواب دیا:

''لوگوں نے! لوگوں نے شاید تمھیں میری اور اس کی دشمنی کا قصہ بھی سنایا ہوگا؟''

''نہیں۔ انھوں نے مجھے دوسری چیزوں کے بارے میں بتایا۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

خاموشی ان کے درمیان پہاڑ کی طرح کھڑی تھی، لیکن مصباح سعید نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر لیفٹیننٹ کا بازو دبوچ لیا اور چیخ کر کہا:

''تم سمجھتے ہو... تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔''

لیفٹیننٹ کو بریک لگا کر گاڑی کو روکنا پڑا۔ اپنے تاثر سے کوئی غصہ یا برہمی ظاہر کیے بغیر اس نے مصباح کا ہاتھ اپنے بازو سے الگ کیا۔

ریت کا طوفان اس قدر شدید ہو گیا تھا کہ آنکھوں کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیفٹیننٹ نے طوفان کے تھم جانے تک انتظار کیا اور گاڑی کو سڑک کے کنارے روک لیا۔ پھر اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور مصباح کو ایک سگریٹ پیش کیا، مگر اس نے چونک کر انکار کر دیا۔ لیفٹیننٹ نے اپنا سگریٹ سلگایا اور دھویں کے بادل میں سے بڑے سکون سے بولا:

''بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں تم نہیں جانتے — بہت ساری چیزیں۔''

''لیکن بہت سی چیزیں میں جانتا ہوں۔ آج کے بعد میرا اتنا جاننا کافی ہے کہ قانون سے تعلق رکھنے والا شخص دنیا بھر کے سامنے جرم کا ارتکاب کر کے بھی بچ سکتا ہے۔''

''کیا تم اسے جرم سمجھتے ہو؟''

''ہاں، اس کی جان بچا لینا تمھارے لیے ممکن تھا۔''

''کسی کی جان بچانا قانون سے تعلق رکھنے والے آدمی کی ذمے داری نہیں ہے۔''

''ذمے داری ہے۔ بلکہ یہ تمھارا فرض ہے۔''

''ہاں، اب ہم اصل بات کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ سنو۔ غور سے سنو۔ صحرا کی زندگی کا انتخاب کرنے والے کو کسی کے بھروسے پر نہیں رہنا چاہیے۔ وہ کسی کے حکم کا پابند نہیں ہوتا، پوری طرح آزاد ہوتا

ہے، چاہے اسے معلوم نہ ہو کہ غزالوں اور سرابوں کا تعاقب کرنے کے سوا وہ اس آزادی کا کیا استعمال کرے۔ جب وہ پیاسا ہو یا مشکل میں ہو، تو اسے اپنے آپ پر انحصار کرنا چاہیے، اپنی مکمل آزادی کی، کسی کے حکم کا پابند نہ ہونے کی قیمت ادا کرنی چاہیے۔''

مصباح سعید پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ لیفٹننٹ کے قریب ہوکر بولا:

''اگر جبور ہر کسی کے حکم سے آزاد ہوتا تو تم پر انحصار نہ کرتا۔''

دونوں نے تیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا، اور پھر لیفٹننٹ نے کہا:

''اگر وہ حکم کا پابند تھا تو اس نے صرف ان احمق مقامیوں کو اپنی طرف کرنے کے لیے میرے خلاف آواز کیوں اٹھائی؟ طوارگ نے اسے سخت کوشی کی زندگی اور صحرا کا انتخاب کرنا سکھایا تھا، اس لیے اسے معلوم تھا کہ اسے بچانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا، اور اس کی موت اس کی آزادی کے دفاع کی قیمت تھی۔ اقتدار اُن کی حفاظت نہیں کرتا جو اس کی مخالفت میں آواز بلند کرتے ہیں۔ جب اقتدار تمھیں روٹی اور تحفظ دیتا ہے، تمھاری دیکھ بھال کرتا ہے، تو اگر تم اس سے دشمنی کرنے کی کوشش کرو تو وہ یقیناً تمھارا سر بھی کچل ڈالے گا۔ وہ تمھیں خاموش رہنے کا معاوضہ ادا کرتا ہے، تمھاری مستقل خاموشی کی قیمت چکاتا ہے، لیکن اگر تم نے اس سے آزادی حاصل کرلی تو پھر تمھارے پاس صحرا پر انحصار کرنے کی سوا کوئی راستہ نہیں۔''

''تمھاری توضیح وحشیانہ ہے، اس جرم سے بھی زیادہ گھناؤنی،'' مصباح نے دھمکانے والے لہجے میں کہا۔ ''مگر ٹھہرو — مجھے دارالحکومت پہنچنے دو۔ میں اخبار میں تمھارا پردہ چاک کروں گا۔ میں تمھارے جرم کی تفصیل لکھوں گا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تم پر مقدمہ نہ چلایا جائے۔''

''تمھیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا،'' لیفٹننٹ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے سزا دلوانے کے لیے تمھارے پاس ذرہ بھر بھی شہادت نہیں ہے۔ جرم تو اصل میں صحرا نے کیا ہے۔ وہ آزادی کی خواہش کے ہاتھوں قتل ہوا۔ آزادی مجرم ہے، اس پر مقدمہ چلنا چاہیے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا کہ دیر سے پہنچا۔ بس ذرا سی دیر سے، چند گھنٹے یا شاید آدھا دن، اور یہ میں نے جان بوجھ کر کیا۔ باقی کام میری طرف سے صحرا نے کرلیا۔ مجھے یہ کرنا ہی تھا — اس اقتدار کی جانب سے تھوڑی سی سزا جس کے خلاف بغاوت کی گئی تھی، جس کے ہاتھ سے روٹی قبول کرنے سے انکار کیا گیا تھا۔ جہاں تک میرے اس اعتراف کا تعلق ہے، اس کا میرے اور تمھارے سوا کوئی گواہ نہیں، اور اسے، جس کو تم میرا جرم کہہ رہے ہو، ثابت کرنے کے لیے تمھیں کسی تیسرے گواہ کی ضرورت پڑے گی۔''

''مقامی لوگ بھی تو ہیں، وہ میرے حق میں گواہی دیں گے۔ انھوں نے مجھے بتادیا کہ تم اور گورنر اور صوبائی افسر اُس سے کتنی نفرت کرتے تھے۔ وہ سب اُس سے ہمدردی رکھتے ہیں اور تمھارے خلاف گواہی

دیں گے۔ تمھیں اس سے نفرت تھی کیونکہ وہ تمھارے سچ سے واقف تھا، اور میں سب کو بتاؤں گا...''

''اب بس بھی کرو،'' لیفٹننٹ نے سرد لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ ''ہمارے زمانے میں سچ جاننا ہی سزا پانے کے لیے کافی جواز ہے۔ سنو — میرا اپنا بھائی بھی مخالفوں میں شامل تھا۔''

پھر وہ کچھ دیر خاموشی سے ریت کے جھکڑوں کو ونڈسکرین پر سے گذرتے ہوئے یکھتا رہا۔

''وہ آزادی کے شروع کے دنوں میں ضدی پن سے مخالفت پر اڑا رہا، اور بہت جلد حکام نے محسوس کرلیا کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ پھر وہ اچانک غائب ہوگیا۔''

''غائب؟'' حیرت کی ایک چیخ مصباح سعید کے ہونٹوں سے نکلی۔

''ہاں۔ اُس وقت سے آج تک غائب ہے۔''

''مگر کہاں غائب ہوگیا؟''

لیفٹننٹ نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی: ''اس دن مجھ پر سچ کا انکشاف ہوا۔ مجھے دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا — سچ کا ساتھ دوں یا اسے ہمیشہ کے لیے فراموش کردوں۔''

''یعنی اپنے ضمیر سے غداری؟''

''ہاں۔ میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے روٹی کے حق میں فیصلہ کیا۔''

''تم نے سچ کے بدلے میں روٹی لے لی،'' مصباح سعید نے حقارت آمیز لہجے میں تبصرہ کیا۔

''ہاں۔ کیوں نہیں؟''

''تم نے اپنے ضمیر سے غداری کی۔''

''کیوں نہیں؟''

خاموشی ان کے درمیان دیوار کی طرح اٹھ آئی۔ کچھ دیر بعد لیفٹننٹ نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی، پھر مصباح سعید کی طرف مڑا اور، پہلی بار درشتی سے خالی لہجے میں بولا:

''مجھے اعتماد ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہوگے۔''

اس نے چابی گھمائی اور ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔

صبح کے ہوائی اڈے کے کیفے ٹیریا میں دونوں ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مصباح اپنا سامان جمع کرا چکا تھا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے کہا:

''اس مہربانی کے لیے شکریہ۔''

لیفٹیننٹ خاموش رہا۔اس کی نگاہیں مسافروں کے درمیان بھٹکتی رہیں۔

لاؤڈ اسپیکر نے مسافروں کو جہاز کی طرف روانہ ہونے کی ہدایت کی تو مصباح اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لیفٹیننٹ کو اس سے پہلے کھڑے ہوکر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا، جیسے یہ ہاتھ نہ ہو بلکہ ریوالور ہو۔مصباح نے اس سے ہاتھ ملایا اور انھوں نے ایک دوسرے پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔

اس سے پہلے کہ مصباح دوسرے مسافروں کے ہجوم میں اوجھل ہو جائے، لیفٹیننٹ لپک کر اس کے پاس پہنچا اور ایک تیز سرگوشی میں بولا:

''مقامیوں کے بھروسے پر مت رہنا،'' اور یہ کہہ کر اس نے ایک رمزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے الوداع کہا۔

نبیل جورجی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

قاہرہ ایک چھوٹا شہر ہے

انجینئر عادل سلیم اپنے لگژری فلیٹ کی بالکنی میں کھڑا بیچ کی ایک وسیع باغ والی بے حد چوڑی سڑک کے دوسرے طرف کچھ مزدوروں کو ایک نئی عمارت بنانے میں مشغول دیکھ رہا تھا۔ تعمیر ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی، کنکریٹ سے عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی اور پہلی منزل کے چند ستون مکمل ہوے تھے۔ سریوں کا کاریگر، ایک لمبے بالوں والا نوجوان، مختلف ناپ کے سریے موڑنے میں مصروف تھا۔ عادل نے دیکھا کہ اس نوجوان نے اپنی جاوا موٹرسائیکل بڑی احتیاط سے، مستقبل میں اپنے کام میں لائے جانے کی منتظر ایک بڑی سی کرین سے ٹکا کر کھڑی کر رکھی ہے۔ ''کیسے دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدل گیا!'' عادل کو اب تک پرانے زمانے کے راج معمار یاد تھے، اور کاریگر، جو سیمنٹ کے مسالے کے بڑے بڑے تغارے اپنے سخت کندھوں پر اٹھا کر لے جایا کرتے تھے۔

سورج غروب ہونے کو تھا اور ہیلیو پولس کے اختتام پر واقع اس محلے میں نئی زیرتعمیر عمارتوں کے کنکریٹ کے ستون دھندلی روشنی کے پس منظر میں سیاہ ڈھانچوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

جیسا کہ ہر روز اس وقت ہوتا تھا، سڑک کو بیچ سے تقسیم کرنے والے باغ میں سے بھیڑوں اور بکریوں کا ایک گلّہ باغ کی گھاس چرتا چلا آ رہا تھا، اس کے پیچھے دو بدو عورتیں تھیں جن میں سے ایک گدھے پر سوار تھی اور دوسری، جو نوعمر تھی، ساتھ ساتھ پیدل چل رہی تھی۔ اپنی روز کی عادت کے مطابق عادل نے اس نوعمر عورت پر نظریں جمادیں جو ایک ایسی سیاہ عبا میں ملبوس تھی جس سے اس کی بدن کی دلکشی چھپنے کے بجاے اور نمایاں ہوگئی تھی؛ اپنی کمر میں اس نے سرخ کپڑے کا ایک پٹکا سا باندھ رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں پلاسٹک کی سبز چپلیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اپنے لگژری فلیٹ کی بالکنی میں کھڑے

ہوے عادل نے خواہش کی کہ عورت کی نظر اس پر پڑ جائے؛ لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے، وہ سوچنے لگا، تو ان بدوؤں کے طور طریقے کچھ عجیب ہی ہوتے ہیں، اور برتاؤ کے ان آداب سے الگ جن کا وہ عادی ہے، اور اسی لیے ان سے رابطہ پیدا کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے، کیا غرض ہے کہ وہ اس عورت سے بات کرنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہے؟ وہ یہی سوچتا ہوا نظروں سے اس کا تعاقب کر رہا تھا اور وہ گلّے سے الگ ہو کر سڑک پر گذرتی ہوئی گاڑیوں کے راستے میں آ جانے والی بھیڑوں یا پیچھے رہ جانے والی بکریوں کو ہانک کر درست راستے پر لا رہی تھی۔

عادل کو، جو سوسائٹی کی خواتین کو اپنی طرف راغب کرنے میں خاصا تجربہ کار تھا، اپنی روح کے اس طرح اسیر ہو جانے کا پورا احساس تھا: کتنے ہی دن گذر گئے تھے کہ وہ ہر روز مغرب کے وقت اسی طرح اپنی بالکنی پر کھڑا اس کو تکا کرتا تھا، اور اُدھر اسے اس کے وجود کی خبر تک نہ تھی۔

اگر اس روز یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا جب وہ شارع میترو پر ایک دکان سے کچھ پھل اور ترکاریاں خرید رہا تھا، اور اگر دکاندار نے، ایک اَور گلّے کے پیچھے چلتی ہوئی ایک اَور بدو عورت کو نہ دیکھا ہوتا، اور نام پکار اسے نہ بلایا ہوتا، اور اگر اس کے آ جانے پر، اس سے فحش مذاق اور تھوڑی بہت دست درازی کرنے کے بعد دکاندار نے اپنی دکان کی گلی سڑی سبزیوں کا ایک ڈھیر اس پر لاد نہ دیا ہوتا— اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا، تو عادل کے ذہن میں، اس عورت کی خاطر جس نے اس کے دل پر سحر کر دیا تھا، یہ منصوبہ جنم نہ لیتا جس پر کسی بھی قیمت پر عمل کرنے کی اس نے ٹھان لی تھی۔

جیسا کہ، عادل کے فلسفۂ حیات کی رو سے، ہر شخص کے اندر ایک شیطان ہوتا ہے، تو اسے خوش رکھنے اور اس کے جبر کو ٹالنے کے لیے کبھی کبھی اس کی بات مان لینا بہتر ہوتا ہے۔ سو انجینئر عادل سلیم نے بالآخر اس دہشت ناک، ناقابلِ یقین منصوبے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنے گذشتہ چالیس برس کے تجربے کی روشنی میں اسے یاد تھا کہ اپنے اندر کے شیطان سے اس عارضی اتحاد سے اسے ایسی جرأت حاصل ہو جاتی تھی جو دوسرے رفیقوں میں اسے بے حد ممتاز کر دیتی تھی، اور اسی جرأت سے کام لے کر وہ اس سماجی مقام تک پہنچا تھا اور اسی کی مدد سے اس نے اس فلیٹ کی ملکیت حاصل کی تھی جس کی مالیت اب اس قدر ہو چکی تھی کہ وہ اس کا ذکر اپنے کنبے والوں تک کے سامنے نہیں کرتا تھا کہ کہیں وہ حیرت یا حسد کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس طرح، شارع ترمذی پر واقع، دوسری منزل کے اس فلیٹ کی بالکنی پر سے انجینئر عادل سلیم نے گلّے کے پیچھے چلتی ہوئی عورت کو ''اے لڑکی'' کہہ کر بلند آواز میں پکارا۔ جب گلہ کوئی توجہ دیے بغیر اپنے راستے پر چلتا رہا، تو اس نے دوبارہ چلا کر آواز دی: ''اے لڑکی— اے بھیڑ بیچنے والی!'' اور اس سے پہلے کہ

لڑکی اس سے دور نکل جائے، اس نے زور سے ''بھیڑ'' کا لفظ دہرایا۔ عادل نے صدر دروازے پر پہرہ دیتے ہوئے دربان کی حیرت زدگی کی کچھ پروانہ کی جو یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ شاید اسی کو پکارا جارہا ہے۔ بلکہ اس نے دربان کو ان دو بدوعورتوں کے پیچھے دوڑ کر جانے اور انھیں یہ بتانے کا حکم دیا کہ کچھ بچی ہوئی روٹیاں ہیں جو وہ انھیں ان کی بھیڑوں کے لیے دینا چاہتا ہے۔

بالکنی پر کھڑے کھڑے عادل نے دربان کی آواز سنی جوان دونوں کو اپنے تحکمانہ، بالائی مصر کے لب ولہجے میں پکار رہا تھا، جس پر وہ رک گئیں، اور ان میں سے جو گدھے پر سوار تھی، مڑ کر دیکھنے لگی۔ جوں ہی اس نے یہ دیکھنے کو نظر اٹھائی کہ کیا معاملہ ہے، عادل کو اس کی شکل نظر آ گئی۔ مگر جہاں تک نوعمر لڑکی کا تعلق ہے، وہ گلے کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ گدھے پر بیٹھی ہوئی عورت اپنی جوانی گذار آئی تھی، اور اس کا بدن فربہ اور دیکھنے کا انداز بے باک تھا جسے اس سے چھپانے کی اس نے ذرا بھی کوشش نہ کی۔ گدھے کی رسی کھینچ کر اس نے سڑک کا وہ حصہ پار کیا جو اس کے فلیٹ والی عمارت کو باغ سے جدا کرتا تھا، اور صدر دروازے کے سامنے منتظر کھڑی ہوگئی۔ عادل نے گھر میں موجود تمام روٹیاں سمیٹیں اور انھیں پیتل کی ایک بڑی تھالی میں رکھ کر تیزی سے نیچے لے گیا۔ سڑک پر اتر کر وہ سیدھا اس عورت کے پاس گیا اور اس پر نظر ڈالی۔ جب اس نے اپنی ٹانگ کے پاس بندھے ہوئے تھیلے کا منھ کھولا، تو عادل نے ساری روٹیاں اس میں الٹ دیں۔

''شکریہ،'' عورت نے اس کی جانب رخ کیے بغیر کہا اور چل دی۔ مگر وہ اسے سنانے کے لیے اونچی آواز میں بولا: ''کل بھی لے جانا۔''

ایک وقفے کے دوران جو ایک مہینے پر پھیل گیا، عادل نے یہ معمول بنالیا کہ اتنی روٹیاں خریدتا جو وہ خود نہیں کھاسکتا تھا۔ ایسے دنوں میں بھی جب اسے شہر سے باہر سفر پر جانا پڑتا یا پورا دن گھر سے باہر گذارنا ہوتا، وہ کاغذ کے لفافے میں بندھا ہوا روٹیوں کا بڑا سا بنڈل دربان کے حوالے کر جاتا تاکہ وہ اسے اس بدو عورت کو دے دے جو گدھے پر سوار وہاں سے گذرتی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لڑکی جس کی عادل کے دل کو آرزو تھی۔

چوں کہ عادل میں متوقع اور اغلب امکانات کو جان لینے کی ایک خاص حس تھی، ایک قمری مہینہ گذرنے کے بعد، اور اپنے فلیٹ کی عمارت کے سامنے، پیتل کی تھالی میں روٹیوں کا ڈھیر لیے، اس کے ساتھ وہ واقعہ بالآخر پیش آیا جس کے پیش آنے کی وہ آرزو کرتا رہا تھا، یعنی گدھے پر سوار عورت اپنے راستے پر بڑھتی چلی گئی اور عادل نے دیکھا کہ نوعمر لڑکی، احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی، سڑک پار کر کے

اس کی طرف آ رہی ہے۔ اس سے زیادہ حسین شے کبھی عادل نے نہ دیکھی تھی۔ اس کی نبض کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایسے بے پناہ حسن کو بدصورتی کا احساس دلائے بغیر پایا جا سکے، کیونکہ اس کے بعد اس کے سوا ہر شے کو بدصورتی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے؟ جب وہ چلتی ہوئی بالکل اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی، اور اس کی کحل سے آراستہ آنکھیں اس کا جائزہ لینے لگیں، تو اسے ایک شدید خطرے کا احساس ہوا جسے اس نے لڑکی کی کم سنی پر محمول کیا، جو بیس سال سے زیادہ کی نہیں رہی ہوگی۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ اس کا قد اتنا دراز، اس کی کمر اتنی پتلی اور اس کی چھاتیاں اتنی بھری بھری تھیں، اور، جب وہ اس کے ہاتھوں سے روٹیاں قبول کر کے واپس مڑی اور جانے لگی تو چلنے میں اس کے کولھے اتنے دلکش انداز میں حرکت کر رہے تھے؟ عادل کا تخیل منجمد ہو کر رہ گیا تھا حالانکہ وہ ابھی تک اس سے زیادہ دور نہ گئی تھی: اس کا حسین چہرہ ابھی اس کی نظر کے سامنے تھا؛ اس کے رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں، اس کی دلکش ناک اور نازک ہونٹ، کانوں میں پڑے ہوئے ہلال کی شکل کے نقرئی آویزے، اور اس کے سینے کی شان بڑھاتا ہوا خوب صورت گلوبند۔ چونکہ یہ حسن اس سے کہیں زیادہ تھا جتنا کہ روا ہو سکتا تھا، اس لیے عادل کے ذہن پر سلمیٰ کا خیال مستقل مسلط رہا — اسے اس کا نام ماں کے اسے پکارنے پر معلوم ہوا تھا جو اسے اس لیے آواز دے رہی تھی کہ کہیں یہ عاشقانہ ملاقات زیادہ طویل نہ ہو جائے۔

عادل شوق کی اس منزل میں تھا، اور اس کے دل پر چاند کی شکل والی اس ہستی کا اختیار اتنا قائم ہو چکا تھا کہ اسے اب ۔ ٹک کے اس پار کام کرنے والے مزدوروں کی سیٹیوں سے کوئی الجھن نہ ہوتی تھی جو منزل بہ منزل اٹھتی ہوئی عمارت کے ساتھ ساتھ بلند ہوتے جا رہے تھے۔ اس سلسلے کے آغاز کے بعد، جو اس کے لیے جرأت کے ایک عمل کی حیثیت رکھتا تھا، اب اس کے لیے لازم تھا کہ وہ لڑکی ہر شام غروب سے کچھ پہلے اس کے دروازے پر نمودار ہو، تا کہ وہ اس کو دیکھنے سے محروم نہ رہے۔ سو اس طرح انجینئر عادل سلیم حسین بدولڑکی سلمیٰ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اور جس طرح تاریخ نویس تاریخ لکھتے ہیں، اس طرح عادل نے، اپنے مہندسی کے پیشے کی اصطلاحوں میں، ایک تعمیر ہوتی ہوئی عمارت کی شکل میں اپنے شوق کی واردات رقم کرنا شروع کی، جس کا ہر ستون ایک دن تھا اور ہر منزل ایک مہینے کے برابر تھی۔ اسے خیال آیا تھا کہ اٹھائیس دن گذرنے اور ٹھیک چاند کے مکمل ہونے پر اپنی ماں کی جگہ سلمیٰ خود اس کے ہاتھوں سے روٹی لینے آئے گی۔ اور ماہر تعمیرات کی حیثیت سے اس نے چاند کا مشاہدہ کرنا شروع کر دیا تھا؛ جب وہ گھٹ رہا ہوتا تو اس کی بے تابی بڑھ جاتی، اور جوں جوں اس کے مکمل ہونے کا دن قریب آتا گیا اس کی

روح کے انبساط میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ پورے چاند کی تاریخ کو اسے اپنی محبوب کا چہرہ دیکھنے سے تسکین حاصل ہوئی۔

سات مہینوں میں اس نے سات بار اس کا دیدار کیا، ہر بار اس کے چہرے کا تاثر پہلی بار کا سا ہوتا: اسے دیکھ کر اس کا دل پگھلنے لگتا، عزم اور حوصلہ جواب دے جاتا، اور وہی خوف جس کی وجہ وہ نہیں جانتا تھا، پھر سے بیدار ہو جاتا۔ اس خوف کا مداوا اب صرف وہی کر سکتی تھی۔ ساتویں مہینے کے بعد سلمیٰ نے، کسی طرح کی تمہید کے بغیر، اس سے تفصیل سے بات کی تھی اور اسے اطلاع دی تھی کہ وہ ہوائی اڈے سے شمال کی جانب ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ایک چشمے کے قریب اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے، اور یہ کہ یہ چشمہ کھاری پانی کا ہے مگر اس کے پاس ہی ایک اَور چشمہ میٹھے پانی کا بھی ہے اور وہ کھاری پانی کے چشمے میں نہاتی اور میٹھے پانی میں اپنے بدن کو دھو کر پاک کرتی ہے اور یہ کہ دونوں چشموں کے اردگرد کھجور کے درخت ہیں، اور گھاس اور چراگاہیں بھی ہیں۔ اس کے باپ نے، جو دونوں چشموں اور ان کے اردگرد کی زمین کا مالک ہے، عادل کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے کل ''وہ یہاں سے گذرے گا اور تمھیں بھیڑوں کی قربانی کے موقعے پر گھر آنے کی دعوت دے گا۔''

عادل کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا، کیونکہ یہ اس کے تخیل کی رسائی سے باہر کی بات تھی۔

اگلے روز عادل خوش وضع خیموں کی اس بستی میں پہنچا جہاں کھجور کے درختوں کے نیچے چشموں تک اور ان سے آگے بھی دور دور تک ریت کا ایک وسیع صحرا پھیلا ہوا تھا۔ چشمے کے گرد اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ تھا جس سے اس کے باپ کے بہت مال دار ہونے کا پتا چلتا تھا۔ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ قاہرہ کے اس قدر نزدیک ایسی کوئی جگہ واقع ہوگی۔ اگر عادل کو سلمیٰ کے باپ کے ایک نئی پوژو کار چلاتے ہوئے اپنے گھر آنے پر تعجب ہوا تھا تو چشمے کے اردگرد کے اس علاقے کے حسن کو دیکھ کر وہ اور بھی حیران ہوا۔ ''یہ مستقبل کی زمین ہے،'' عادل نے سوچا۔ اگر وہ کسی طرح ان دنوں چند ایکڑ خرید سکے تو دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی ہو جائے گا، کیونکہ یہ مستقبل کا قاہرہ ہے۔ ''یہ میری زندگی کا بہترین سودا ہوگا،'' اس نے خود سے کہا۔

راستے میں سلمیٰ کے باپ نے عادل سے اس کے کام سے متعلق، اور اس بارے میں کہ وہ پہلے کہاں رہتا تھا، اور صحرا اور اس کے باشندوں سے اس کی واقفیت کی بابت بہت سے سوال کیے۔ گو کہ عادل کو اس کے لہجے میں تجسس سے بڑھ کر کوئی چیز محسوس ہوئی، لیکن اس نے اسے بدوؤں کی فطرت اور ان کے طور طریقوں پر محمول کیا۔

جب کار خیموں کے قریب پہنچی تو عادل نے بہت سے مردوں کو ایک خیمے کے پاس جمع دیکھا جو دونوں پہلوؤں سے کھلا ہوا تھا، اور جوں ہی سلمٰی کا باپ اور اس کا مہمان کار سے باہر آئے، سارے مرد پلٹ کر گھوڑے کی نعل کی شکل میں بیٹھ گئے۔ سلمٰی کے باپ اور عادل کے ان کے ساتھ بیٹھ جانے سے نعل کا ایک طرف کا حصہ مکمل ہو گیا۔ ان کے بالکل سامنے تین ایسے مرد بیٹھے تھے جن کے چہروں پر وقت کی لکیریں الجھی ہوئی جھریوں کی صورت میں دکھائی دے رہی تھیں۔

صورت حال نے عادل کی توجہ کو یوں جذب کر لیا کہ وہ سلمٰی کے وجود سے بے خبر رہا، سوائے ایک موقعے کے جب وہ ایک خیمے سے نکل کر دوسرے خیمے میں جاتے ہوئے اس کی نظر کے دائرے میں سے گذری اور عادل نے اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔

جو شخص ان تینوں مردوں کے درمیان میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، بولنے لگا۔ عادل نے اسے صحرا، پانی اور بھیڑوں، اور نخلستانوں، بدوؤں کے قبیلوں اور خون کے رشتوں کی باتیں کرتے ہوئے سنا؛ اس نے سنا کہ وہ ان سڑکوں اور چشموں، درختوں اور کھجوروں، بکریوں اور نوزائیدہ بچوں کے کام آنے والے ان کے دودھ کی حفاظت کرنے کی اہمیت کے بارے میں بات کر رہا ہے؛ اس نے اسے یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ لاانتہا تک پھیلے ہوئے صحرا کے مقابلے میں وادی کتنی چھوٹی ہے۔

اپنی اسی حس کی مدد سے، جس سے کام لے کر عادل نے پہلے وہ سات منزلہ عمارت تعمیر کی تھی جو سات مہینوں کی نمائندہ تھی، اور ہر مہینہ اٹھائیس دنوں پر مشتمل تھا، جس کے بعد، چاند کے مکمل ہونے پر، اسے سلمٰی کا چہرہ نظر آتا تھا، اسی طرح عادل نے جان لیا کہ یہ اجتماع دراصل ایک جرگہ ہے جو اس سے اس شخص کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کے لیے بیٹھا ہے جو ایک روز اسے خرجہ اور فرشوط کے نخلستانوں کے درمیانی راستوں پر ملا تھا۔ یہ اس روز غروب کے بعد کی بات تھی جب اپنے ایک دوست کے ساتھ خرجہ کے نخلستان میں خام لوہے کی کانوں کا دورہ کر کے اس نے آسیوط جانے والی پختہ سڑک لینے کے بجائے وہ کچا راستہ اختیار کر لیا تھا جو انھیں فرشوط کی سمت قنا کے قریب لے گیا تھا جہاں اس کے دوست کو سڑکوں کی مرمت اور ریل کی پٹری کو نخلستان تک لے جانے کے امکانات کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کرنی تھی۔ ٹیلوں سے وادی میں اترتے ہوئے، جہاں سے فاصلے پر سرسبز زمین دکھائی دے رہی تھی، دو ہتھیار بند آدمی ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ عادل کو یاد آیا کہ کس طرح، خوف اور حیرت، یقین اور بے یقینی کے نرغے میں، ایک ایسی رفتار سے جو اس وقت اسے خود پر مسلط کی ہوئی محسوس ہوئی، ٹرِگر پر اس کی انگلی کے دباؤ سے وہ پستول چل گیا تھا جسے وہ پہلی بار استعمال کر رہا تھا۔ ایک شخص اس کے سامنے زمین پر گر پڑا تھا، جیسے فلموں میں دکھایا جاتا ہے، اور دوسرا بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ وہ خود اور اس کا دوست، دونوں اپنی کار کی طرف لپکے تھے

تا کہ جلد از جلد وادی میں پہنچ کر اس واقعے کی یاد کو مٹادیں۔ شاید اسی باعث کہ عادل نے ایک بار کسی شخص کو قتل کیا تھا، اس میں اتنی جرأت پیدا ہوئی کہ سلمیٰ کے باپ کی دعوت قبول کر سکے۔

"اس روز،" عادل نے اس شخص کی آواز سنی جو اس سے مخاطب تھا، "اپنے دوست کے ساتھ کار میں، جاتے ہوئے تم نے مبارک بن ربیعہ کو قتل کیا جو زیاد الحرب کے ساتھ تمھاری طرف آیا تھا۔"

انجینئر عادل سلیم کو شہر قاہرہ کے شمال مغرب میں واقع صحرا میں اس طرح سزائے موت دی گئی: ایک شخص نے اسے پکڑ کر اس کا سر، مرمرنما پتھر کی سل پر رکھا، اور دوسرے نے ایک خم دار پھل والے خنجر کی نوک اس مقام پر اتار دی جو گلے کے اختتام پر گردن کی دونوں ہڈیوں کے بیچ میں واقع ہوتا ہے۔

لیلیٰ بعلبکی

عربی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

چاند کی طرف شفقت کا سفینہ

آنکھیں بند کر لینے کے بعد بھی میں اپنے اردگرد ہر چیز کو دیکھ سکتی ہوں: مستطیل صوفہ، جو کمرے کی ایک وسیع دیوار کے سہارے اِس کونے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا ہے، بقیہ دیواروں پر شیلف، چھوٹی سی میز، قالین پر رنگین کشن، سفید لیمپ، جو بڑے سے مٹی کے تیل کے لیمپ سے مشابہ ہے اور دیوار میں ایک سوراخ سے ٹنگا ہوا، ٹائلوں سے مرصع فرش پر ٹکا ہوا ہے، حتیٰ کہ کھڑکیاں بھی، جو ہم نے بلا پردوں کے چھوڑ رکھی ہیں۔ دوسرے کمرے میں ایک کشادہ صوفہ ہے، آئینے سے مرصع میز، دیوار میں جڑی الماری، اور دو مخملیں کرسیاں۔ شادی کے دن سے اب تک ہم نے اپنے چھوٹے سے گھر میں کسی چیز کو تبدیل نہیں کیا، میں نے کسی بھی چیز کو یہاں سے منتقل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

اپنے شوہر کو یہ بڑبڑاتے سن کر کہ ''صبح ہو گئی ہے، اور شہر بھر میں صرف ہم ہی دو جگ رہے ہیں'' میں نے ذرا کی ذرا اپنے پپوٹوں کو کھولا۔ پھر اسے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا، جہاں صبح کی روشنی اس کے پورے چہرے اور اس کے ننگے جسم پر اپنی چاندی بکھیر رہی تھی۔ مجھے اس کے ننگے جسم سے عشق ہے۔

میں نے پھر سے اپنی آنکھیں موند لیں، اپنی دنیا میں لوٹ آئی، جہاں میں اس کے جسم کے ہر ذرے اور ہر مخفی، باریک ترین تفصیل کو دیکھ سکتی تھی: اس کے ملائم بال، پیشانی، ناک، ٹھوڑی، گردن پر تنی ہوئی رگیں، سینے پر پریشان اس کے بال، اس کا پیٹ، اس۔ کے پیر، حتیٰ کہ اس کے ناخن۔ میں نے پکارا کہ وہ لوٹ آئے اور میرے پہلو میں پسر جائے، کہ میں اسے چومنا چاہتی ہوں۔ وہ ساکت رہا۔ مجھ سے یوں الگ ہو کر دور جا کھڑے ہونے کے اس انداز سے میں سمجھ گئی کہ وہ کوئی بہت اہم بات کہنے کے لیے خود کو

تیار کر رہا ہے۔ اس طرح وہ بے رحم اور بڑا ہی سرکش نظر آتا ہے: فیصلے کرنے اور پھر انھیں نافذ کرنے پر قادر۔ اور ایک میں تھی، اس کی ضد — سرتاسر! اس سے جھگڑنے، بحث کرنے کے لیے میرے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہاتھ تھامے رہوں، یا اس کے کپڑوں کا لمس محسوس کروں۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں، تکیے کو، جسے میں ہنوز بھینچے ہوئے تھی، دور پھینک دیا، اور اس کی قمیص کو جھپٹ کر اپنے سینے پر پھیلا لیا۔ پھر میں نے چھت کو گھورتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا اسے سمندر نظر آ رہا ہے۔

''ہاں، نظر آ رہا ہے،'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا کہ کیسے رنگ کا ہے۔

''ایک طرف گہرا نیلا،'' اس نے کہا،''اور دوسری طرف سفیدی مائل سرمئی۔''

میں نے پوچھا کہ سرو کے درخت کیا اب بھی وہیں ہیں۔

''ہاں بالکل، ان گھروں کے درمیان جو ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں،'' اس نے جواباً کہا۔''اور عمارتوں کی چھتوں پر پانی پڑا ہوا ہے۔''

میں نے کہا کہ مجھے کھجور کے اس یکہ و تنہا درخت سے والہانہ عشق ہے جو ہمارے یہاں سے دیکھو تو ٹھیک سمندر کے بیچوں بیچ گڑا نظر آتا ہے، اور سرو میرے ذہن میں سفید قبروں کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

وہ خاموش رہا — دیر تک، اور میں چھت کو مسلسل گھورے گئی۔ پھر اس نے کہا،''مرغ اذان دے رہے ہیں!'' اور میں نے فوراً اسے بتایا کہ پرندوں میں مرغ مجھے ذرا پسند نہیں، کہ یہ فضا میں اڑنے سے قاصر ہیں؛ کہ جب میں بچی تھی تو انھیں گھر کی چھت پر لے جا کر فضا میں چھوڑ دیا کرتی تھی، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید اسی طرح انھیں اڑنا سکھا سکوں، اور خواہ مرغ ہوں یا مرغیاں، یہ سب دھپ سے زمین پر ایک غیر متحرک ڈھیر کی شکل میں جا پڑتے۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا، پھر بولا کہ سامنے والی عمارت کی ایک کھڑکی میں اسے روشنی نظر آ رہی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے باوجود شہر بھر میں صرف ہمی دو بیدار ہیں، صرف ہمی دو جنھوں نے تمام رات ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے بسر کی ہے۔ اس نے کہا کہ دیشب اس نے بہت پی لی تھی۔ میں نے یہ کہتے ہوئے جھٹ قطع کلام کیا کہ مجھے ''بہت پی لی تھی'' فقرے سے نفرت ہے، گویا وہ خواہش کی اس جنوں خیزی پر نادم ہے جس کے ساتھ وہ مجھ سے ہم جسم ہوا ہے۔ اس نے فوراً اندازہ کر لیا کہ میں بس اب برہم ہونے ہی والی ہوں، چنانچہ اس نے یکلخت موضوع بدل دیا اور بولا،''شہر مختلف رنگ اور جسامت کے جگمگاتے قیمتی پتھروں کا ڈھیر لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا اس وقت میرے تخیل میں شہر گتے کے ان رنگین ڈبوں کی مانند لگ رہا ہے جنھیں پھونک

مار وتو ڈھیر ہو جائیں، کہ تنہا ہمارا گھر اپنے دو کمروں سمیت بادل سے ٹنگا فضا میں تیر رہا ہے۔ وہ بولا کہ اس کا منہ خشک ہو رہا ہے اور وہ ایک نارنگی چاہتا ہے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا جملہ ختم کیا کہ اگرچہ اس شہر کے علاوہ میں کسی اَور شہر میں نہیں رہی ہوں، پھر بھی مجھے اس سے نفرت ہے اور اگر میں نے یہ خواب نہ دیکھا ہوتا کہ ایک دن میں ایسے آدمی سے ملوں گی جو مجھے اس شہر سے بہت دور لے جائے گا، تو میں افسردگی کے مارے بہت پہلے ہی مر گئی ہوتی۔ یوں جیسے اس نے میرا آخری جملہ سنا ہی نہ ہو، اس نے دہرایا، ''میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں اور میرا جی ایک نارنگی کھانے کو چاہ رہا ہے۔'' میں نے اس کی خواہش کو نظر انداز کر دیا اور بولے چلی گئی کہ جب وہ ساتھ ہو تو مجھے ذرا پروا نہیں ہوتی کہ کہاں ہوں: زمین اپنے درختوں، پہاڑوں، ندیوں، حیوانوں، اور انسانوں سمیت میرے لیے معدوم ہو جاتی ہے۔ مزید انتظار کی تاب نہ لا کر وہ مجھ پر استفساراً پھٹ پڑا، ''تم مسلسل بچے کی پیدائش سے انکار کیے جا رہی ہو — آخر کیوں؟''

میں اداس ہو گئی۔ محسوس ہوا کہ کسی نے میرا دل پوری شدت سے بھینچ دیا ہو۔ آنسو میری آنکھوں میں بھر آئے، مگر میں نے زبان نہ کھولی۔

''شادی کیے ہمیں کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے ایک لفظ نہ کہا، صرف آنکھوں سے اس کا تعاقب کیے گئی۔ اس نے سرد مہری سے سلسلہ کلام جاری رکھا، ''شادی کیے ہمیں ایک سال اور چند ماہ ہو چکے ہیں، اور تم ہو کہ مسلسل انکار ہی کیے جا رہی ہو، حالانکہ شادی سے پہلے تمھیں بچوں کا جنون تھا، تم ان کے لیے مری جا رہی تھیں۔''

وہ ڈگمگایا اور صوفے پر ہاتھ مارتے ہوئے برس پڑا، ''اے کرسی! کیا تجھے اس کی التجائیں یاد نہیں؟ اور اے لیمپ! کیا تو نے اس کی گریہ وزاری نہیں سنی تھی؟ اور اے تکیو! کتنی ہی بار کیا اس نے تمھیں ننھے جسموں کا نعم البدل سمجھ کر اپنے سینے سے چمٹائے طویل راتیں نہیں بسر کی تھیں؟ بولو، اے جامد چیزو، جواب دو! اسے اس کی وہ آواز جو تم میں غرق ہو چکی ہے، لوٹا دو!''

میں نے نرمی سے کہا کہ جمادات احساس اور آواز سے عاری ہوتے ہیں۔ ''اور یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ مردہ ہیں؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ اشیا مردہ نہیں ہوتیں، لیکن یہ لوگ ہی ہیں جو انھیں ان کی دھڑکن عطا کرتے ہیں... اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ فی الوقت وہ اشیا کی بابت بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، کہ میں ہمیشہ اس مسئلے کے حل کی تلاش سے بھاگتی رہی ہوں، لیکن آج وہ مجھے فرار نہیں ہونے دے گا۔ خالی خالی ذہن کے ساتھ میں نے تشریحاً کہا کہ میرے اردگرد چیزیں، بذاتِ خود یہ اشیا — یہ صوفہ، یہ قالین، یہ دیوار، یہ لیمپ، یہ گلدان، یہ شیلف، اور یہ چھت — وہ وسیع آئینہ ہیں جس میں مجھے باہر کی دنیا کا عکس نظر آتا ہے، باہر کی دنیا کا جو مکانوں، سمندر، درختوں، آسمان، سورج، ستاروں،

اور بادلوں پر مشتمل ہے۔ اس کی معیت میں میں ان میں اپنا ماضی دیکھتی ہوں: درد اور افسردگی کی ساعتیں، ملاقات اور خواہش اور لذت اور نرمی کے لمحے جن کے سہارے آج مجھے آنے والے دنوں کا تصور ملتا ہے۔ میں انھیں ہرگز تج نہ دوں گی۔

وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخا، ''وہی گھوم پھر کر اشیا کا جھگڑا۔ میں ابھی اور اسی وقت معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم بچوں کی پیدائش سے کیوں انکار کرتی ہو؟''

مزید برداشت کی تاب نہ لا کر میں چیخ اٹھی کہ کبھی خود اس نے بھی بچوں کی پیدائش سے انکار کیا تھا۔ وہ خاموش ہو رہا، لیکن بس تھوڑی ہی دیر کے لیے، پھر بولا، ''میں نے انکار کیا تھا تو شادی سے پہلے، اُس وقت جب بچوں کا ہونا نری حماقت ہوتا۔'' میں نے طنزاً کہا کہ ساری بات یہ تھی کہ وہ ان سے خائف تھا: وہ دوسرے، وہ شہر بھر کے شہدے، کہ وہ ان سے ان کی اجازت، برکت، اور موافقت کے لیے گزارش کیا کرتا تھا تا کہ وہ مجھ سے اور میں اس سے مل سکوں، تا کہ وہ مجھے اپنی بانہوں میں بھر سکے اور میں اسے اپنی بانہوں میں، تا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی محبت میں غرق کر سکیں۔ یہ وہ تھے جو ہمارے لیے ہماری ملاقاتوں کی جگہوں، ان تک ہمارے قدموں کی تعداد، اور وقت کا تعین کیا کرتے تھے، ساتھ ہی ساتھ ہماری آواز کی بلندی کی حد بندی بھی، اور ہماری سانسوں کا شمار؛ اور میں انھیں تنہائی میں، چوری چوری، ہماری محبت کا مذاق اڑاتے، اپنے محبوب جسموں کے ساتھ مباشرت کرتے، نہایت بے شرمی کے ساتھ دن میں تین بار شکم سیری کرتے، من پسند قہوے کے فنجان اور عرق کی صراحیوں کے ہمراہ سگریٹ پھونکتے، قہقہہ زن، ہماری محبت کی داستان کو نہایت سوقیانہ چٹخارے لے کر چباتے، ہمارے رویے کے لیے قواعد بناتے دیکھا کرتی تھی، وہ قواعد جنھیں آنے والی کل ہم عملی جامہ پہنا سکیں۔

اس نے گھٹی گھٹی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا، ''میں دوسروں کی کب پروا کرتا ہوں؛ میں ایک اور عورت سے بندھا ہوا تھا۔''

آہ! میں آخر کس طرح یہ عذاب برداشت کر سکتی ہوں، یہ تمام جنون جو مجھے اس سے ہے! وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی بزدلی کا اعتراف کیا کرتا تھا، کہ وہ اس دوسری عورت کو ٹھوس، بڑی کڑوی حقیقت سے کہ اسے اس سے محبت نہ رہی تھی، نہ ہرگز کبھی ہو سکے گی، آگاہ کر دینے سے عاجز ہے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا تھا کہ اس کے لیے یہ آسان نہیں، کہ اب وہ اتنا بے اعتنا اور پتھر دل نہیں کہ وہ دوسرا انسان جس کو گذشتہ نو برس تک ہر صبح اٹھنے پر اس نے اپنے پہلو میں پایا تھا، اس دن اٹھ کر، اس کی آنکھوں میں گھور کر یہ کہہ سکے: ''تماشا ختم!'' اور پھر منھ موڑ کر چل دے۔ میں نے کہا کہ وہ میرے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھے، اور پوچھا کیا میرا گرم خون اس سے اب بھی فرش پر ٹپک رہا ہے؟ ''تم پاگل تھیں،'' وہ بڑبڑایا، ''تم

پاگل تھیں، جب تم نے اپنے خیال کو پورا کرنا چاہا۔ میں نے دروازہ کھولا، اسی کمرے میں داخل ہوا اور تمھیں کاؤچ پر پڑا ہوا پایا۔ تمھارے ہاتھ کی نسیں کٹی ہوئی تھیں اور تمھاری انگلیاں خون کے سمندر میں تیر رہی تھیں۔ تم جنونی تھیں، میں نے تمھیں تقریباً کھو دیا تھا۔"

میں اداس اداس مسکرادی، اس حال میں کہ اس کی قمیص کھینچ کر اپنے سینے پر پھیلا رہی تھی، اور میرا چہرہ اس میں ڈوب کر اس کی مانوس، مردانہ بو سونگھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ ڈرامے میں میرا کردار اس کا مقتضی تھا کہ اختتام سے پہلے خود کو فنا کر دوں، اور فنا کی صورتوں میں صرف وہی موت قبول اور برداشت کر سکتی تھی جو مجھے بسرعت معدوم کر دینے کی اہل ہو، نہ کہ آہستہ خرام اور سفاک رینگ — بالکل اس کچھوے کی طرح جو "کتے کی موت" نامی فلم میں، ریگ زار میں اپنا راستہ کھو بیٹھا تھا اور اب سورج کی تمازت میں دریا کے کنارے کی تلاش میں رینگ رہا تھا۔ اس نے افسردگی سے دہرایا کہ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس سے اپنی محبت میں اس درجہ سنجیدہ ہوں۔ میں نے استہزاءً پوچھا کہ کیا میری محبت کی صداقت کے ثبوت میں وہ میرے خود کو فنا کر دینے کا منتظر تھا؟ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کی محبت میں خود کو بالکل گم کر دیا تھا، کہ ساری دنیا سے بے خبر، میں نظر نہ آنے والی آندھی تھی جو لوگوں کی انگلیوں سے دبے پاؤں پھسل کر، ان کے چہروں کو جھلساتی ہوئی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ اگر مجھے کسی چیز کا احساس تھا تو یہ جسموں کی گرانی تھی یا عمارتوں اور اس کے ہاتھوں کی بلندی۔ میں نے التجا کی کہ وہ میرے کچھ اور قریب آ جائے اور مجھے اپنے ہاتھ تھام لینے دے کہ میں انھیں تھامنے کی خواہاں ہوں۔ مگر وہ دور کھڑا رہا — جامد، بے حس — بلکہ اس نے بسرعت مجھے متہم کیا کہ اس فلاکت، اور اس کے بعد کی فتح، کے باوجود بھی میں اس سے حاملہ ہونے کی مستقل منکر ہوں، کہ وہ اس انکار کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ مجھے اب اس سے محبت نہیں رہی۔

کیا؟ میں تڑپی۔ میں نے چیخ کر کہا کہ یہ طعنہ وہ مجھے ہرگز نہیں دے سکتا۔ کل رات ہی کو لے لو: میں اس کے پہلو میں پڑی تھی اور اس نے خود کو گہری نیند کے سپرد کر دیا تھا، جبکہ میری آنکھیں کھلی تھیں، میں اپنے رخسار سے اس کی ٹھوڑی رگڑ رہی تھی، اس کا سینہ چوم رہی تھی، اس کی بانہوں میں حرارت کے لیے بھنچی پڑی تھی، اور بے کار ہی نیند کی متلاشی تھی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کا یوں پلک جھپکتے سو جانا اور میرا یوں ماہیِ بے آب اس کے پہلو میں پڑے تنہا تڑپتے رہنا میرے لیے کس قدر اذیت کا باعث تھا۔ اس نے فوراً مجھے جھٹلاتے ہوئے کہا کہ اسے راتوں میں کوئی ایسی رات یاد نہیں جو میں نے جگ کر گذاری ہو، اور اسے یقین ہے کہ اس کے سوتے ہی میں بھی سو جاتی ہوں۔ کینہ میرے دل میں اتر آیا، اور میں نے کہا کہ یہ پہلی بار نہ تھی جو اس نے مجھے یوں اپنے پہلو میں بیدار اور اکیلا چھوڑا تھا۔ پھر میں نے

گذشتہ شب کا واقعہ صراحتاً پورے کا پورا ذکر کیا۔ کس طرح وہ سو رہا تھا، کس طرح اس کا تنفس نرمی سے آ جا رہا تھا جب کہ میں، اس کے پہلو میں پسری، خاموشی سے سگریٹ پھونک رہی تھی، کہ کمرے کی خاموشی میں، دھویں کے پار، میں نے چادر سے ایک پاؤں کو اچانک پھسلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے اسے ہلانے کی کوشش کی، مگر وہ دوسرا پاؤں ٹس سے مس نہ ہوا، اور ایک سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے ہلانا چاہا، لیکن وہ ساکت ہی رہا۔ پھر میں نے اپنے چہرے کو جلدی سے اس کے بالوں میں دفن کر دیا تھا۔ میں خوف زدہ تھی۔ پھر وہ ہلا تھا اور ساتھ ہی اس کا پاؤں بھی۔ میں خاموش رویا کی۔ میں نے سوچا تھا، میں نے محسوس بھی کیا تھا، میں اس کے اور اپنے پاؤں میں فرق کرنے سے عاجز تھی۔ دبی دبی سی آواز میں اس نے کہا تھا، ''اس زمانے میں لوگ محبت کی وجہ سے نہیں مرتے!'' موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے فوراً جواب دیا کہ پھر یہ بھی درست ہے کہ اس زمانے میں لوگ بچے نہیں جنتے! پرانے زمانے میں لوگوں کو علم ہوا کرتا تھا کہ بچہ کہاں پیدا ہوگا، ممکناً کس سے مشابہ ہوگا، لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ وہ اس کے لیے اونی کرتے اور موزے بنتے، اس کے کپڑوں کے حاشیوں پر، کالروں اور جیبوں پر کشیدہ کاری سے رنگین پھول اور چڑیاں بناتے، اس کے لیے تحفتاً طلائی صلیبیں اور ''ماشاء اللہ'' کی الواح، نیلے پتھر سے مرصع کھلی ہتھیلیاں اور ایسے آویزے جمع کرتے جن پر اس کا نام کندہ ہوتا۔ ولادت سے پہلے ہی وہ اس کے لیے ایک دایہ مخصوص کر رکھتے، ولادت کا دن مقرر کرتے، اور بچہ ٹھیک وقتِ معینہ پر کوکھ کے اندھیروں سے خود کو روشنیوں کی دنیا میں پھینک دیتا۔ تب وہ بچے کے نام پر زمین کا ایک ٹکڑا درج کراتے، اس کے لیے کرائے پر مکان لیتے، اس کے لیے اس کے ساتھیوں کا انتخاب کرتے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ اسے کس اسکول میں پڑھنے بھیجیں گے، اور یہ بھی کہ وہ کس پیشے کے لیے تعلیم حاصل کرے گا، اور یہ بھی کہ وہ ممکناً کس شخص سے حبت کرے گا اور، انتہائے کار، اس کی قسمت سے اپنی تقدیر جوڑے گا۔ لیکن یہ سب بہت پہلے کی بات ہے، تمھارے اور میرے والدین کے زمانے کی بات۔ وہ بولا، ''تمھارے خیال میں کیا واقعی بیس سال کی مدت ایک زمانے کے مساوی ہے؟ بیس برسوں میں بدلا ہی کیا ہے؟ کیا تم اور میں مل کر بچے کی حاجتوں کو پورا نہیں کر سکتے؟'' ضرب کی شدت کو کم کرنے کے خیال سے میں بول اٹھی کہ شادی سے قبل میں اس ننھے بچے کے مانند تھی جو اپنی پشت پر پڑے پڑے کھڑکی سے باہر پھیلے ستاروں کو ٹکر ٹکر دیکھے جاتا ہے، اور انھیں چن لینے کی خواہش سے مغلوب ہو کر ان کی جانب اپنے ننھے منے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ اس خواب، اس ناقابلِ تعبیر خواہش سے اپنی دل جوئی کیا کرتی تھی، اس سے چمٹی رہتی اور اس کے حقیقت بن جانے کی تمنا کرتی۔ اس نے پوچھا، ''گویا تم مجھے مسلسل دھوکا دے رہی تھیں؟''

کیا؟ معاً مجھے محسوس ہوا کہ اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا ہے، کہ وہ معرکہ سر کرنے کے لیے مجھ پر

حملہ آور ہوا ہے۔ میں کہہ اٹھی کہ وہ عورت، صرف وہی عورت جو اپنے مرد سے نا آسودہ ہو، نہایت بے تابانہ اشتیاق سے بچے کی خواہش کرتی ہے، تاکہ اپنی دنیا میں سمٹ جائے اور اپنے بچے کے وجود سے مسرور ہو کر خود کو آزاد محسوس کر سکے۔ اس نے فوراً قطع کلام کیا، ''تو کیا تم نا آسودہ تھیں؟'' میں نے جواباً کہا کہ ہم دونوں ہراساں تھے، ہم نرمی کی نامعلوم گذرگاہوں کی انتہا تک کبھی سفر نہ کر سکے تھے۔ ہم خوف سے لرزاں تھے، اور ہم ہمیشہ اجنبی چہروں سے ٹکراتے رہے ہیں اور ان کی آواز سنتے رہے ہیں۔ اس کے لیے، اپنے لیے میں نے موت کا مقابلہ کیا ہے، تاکہ زندہ رہ سکوں۔ وہ غلطی پر ہے۔ وہ مجنونانہ محبت جو مجھے اس سے ہے، اس پر شک کر کے وہ غلطی کر رہا ہے۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں تمھیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' میں حملہ آور ہوئی اور بولی کہ ساری مصیبت کی جڑ اس کی یہی نافہمی ہے؛ اور اگر میں نے کبھی اسے بتا بھی دیا کہ کیوں مجھ میں حاملہ ہونے کی جرأت نہیں، اور میں ایسی غلطی کی مرتکب کبھی نہیں ہوں گی— تو یہ بھی وہ نہ سمجھ سکے گا۔

''غلطی،'' وہ چیخا، ''غلطی؟'' میں اس کی قمیص سے کچھ اور چمٹ گئی تاکہ اس سے توانائی حاصل کر سکوں، اور پھر آہستہ آہستہ، بہت ہی مدھم لہجے میں میں نے اسے بتایا کہ میں اس بچے کی قسمت کے بارے میں کس قدر خوف زدہ ہوں جسے ہم اس دنیا میں لا پھینکیں گے۔ آخر میں کس طرح تصور کر سکتی ہوں کہ میرا بچہ، ایک وجود جس نے میرے خون سے غذا حاصل کی ہو، اپنی کوکھ کے اندھیروں میں جسے میں نے چمٹائے رکھا ہو، اپنے تنفس، اپنے دل کی دھڑکنوں اور اپنے یومیہ کھانے میں اپنا شریک کیا ہو، ایک وجود کہ جسے میں نے اپنے خدوخال اور یہ زمین دی ہو، مستقبل میں ایک دن وہ مجھے اپنے پیچھے چھوڑ کر، راکٹ میں بیٹھ کر، چاند پر جا بسے گا؟ اور کسے معلوم کہ وہ خوش بھی رہ سکے گا یا نہیں؟ میرے تصور میں میرا بچہ سفید ربنوں سے سج دھج کر آتا ہے، اپنے تروتازہ چہرے کی بشاشت کے ساتھ ایک کرسی سے بندھا ہوا، جو شیشے کے ایک گولے میں رکھی ہوئی ہے، اور یہ گولا خاکی رنگ کے ایک طویل عمود کے بالائی سرے سے جڑا ہے، اور یہ عمود جو میرے شارلستونی سائے کی سلوٹوں میں جا کر گم ہو جاتا ہے۔ وہ بٹن دباتا ہے، غبار کا ایک بادل بتدریج اٹھتا ہے، اور تیر سے مشابہ وہ شے خود کو فضا میں پھینک دیتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔

وہ دیر تک چپ رہا۔ دریں اثنا صبح کا اجالا اس کے چہرے سے چھن کر کمرے کے گوشوں میں پھیلنے لگا۔ اس کا چہرہ کسی تاثر سے خالی تھا، اور وہ دور کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی فضا میں یونہی خالی پن سے ایک تیر نما شے اور ایک ننھے سے چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی بھنوؤں کے مابین پھیلی ہوئی رگ میں گرہیں سی پڑ گئیں۔ تشویش اور بوجھ کے آثار اس کے چہرے سے مترشح تھے۔ خود میں بھی خاموش تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

اسے اپنے بے حد نزدیک، فضا میں راکٹ پھینکنے والے بلند مینار کی طرح کھڑے پا کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور میں نے بڑبڑاتے ہوئے اس سے کہا کہ مجھے اس کے برہنہ جسم سے والہانہ محبت ہے، اور جب وہ اس جسم کو کپڑوں سے ڈھک دیتا ہے، بالخصوص جب وہ اپنی ٹائی کی گرہ لگاتا ہے، تو مجھے بے حد اجنبی لگتا ہے، وہ اجنبی جو ہمارے گھر، خاندان کے بزرگ سے ملنے آیا ہو۔ اس نے اپنی بانہیں وا کردیں اور مجھ پر جھک گیا۔ میں جلدی سے اس کی بانہوں میں سمٹ آئی اور دیوانگی سے بڑبڑانے لگی:

''مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے...'' اور اس کی سرگوشی میرے بالوں سے چھن کر ابھری:

''تم میرا موتی ہو!''

پھر اس نے اپنی ہتھیلی میرے لبوں پر پھیلا دی، اور دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنے حلقے میں کچھ اور تنگ کرتے ہوئے حکم دیا:

''آؤ چاند کو چلیں — تم اور میں!''

اُدوردالخراط

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

چار دیواروں میں

"ہانیہ!... ہانیہ!"

اس کی آنکھ اس بوڑھی، کم زور آواز پر کھلی جو ماممتا کی دردمندی، بڑھاپے کی خستہ جانی اور ایک طویل، تھکا دینے والی زندگی سے بوجھل تھی۔ یہ آواز اَدھ کھلے دروازے سے داخل ہوئی اور کمرے کی فضا اور اس میں پھیلی ہوئی صبح کے اوّل وقت کی غنودہ نیم تاریکی میں سے ہوکر اس تک پہنچی۔ باہر گلی میں لگے ہوے بلب کی ہلکی، دھندلی روشنی کمرے کی دیوار پر لرز رہی تھی۔ کمرے میں ابھی رات کا سانس باقی تھا اور اس کی گرم، گھنی اور بند بندسی بو میں نیند کی بو ملی جلی تھی۔

وہ پرانے گدے پر کروٹیں بدلتے ہوے اس کھردرے، مانوس کمبل کو اپنی رانوں کے گرد کسنے لگی جو اس کے بدن سے متواتر مس ہوتے رہنے کی وجہ سے یوں ہوگیا تھا گویا اسی کا کوئی اندرونی حصہ ہو۔ جب اس نے بازو اپنے گرد کس کر ٹانگیں وہاں تک موڑیں کہ وہ اس کے سینے کو بھینچنے لگیں، تو اسے یہ کمبل اپنے گرد لپٹے ہوے غلاف کی طرح محسوس ہونے لگا۔ اسے اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو اپنے گرد یوں لپیٹ کر بڑی تسکین ہوئی، جیسے انھوں نے اس کے بدن کو حصار میں لے لیا ہو، اور اس کا بدن اپنے ہی مانوس اور مطیع لمس میں سکون پا کر پوری طرح حفاظت میں آ گیا ہو: اس حصار میں کسی خطرے کا گذر نہ تھا، بلکہ صرف تحفظ اور محبت کا لمحہ تھا۔ اپنے آپ سے مکمل لطف لیتے ہوے اپنے گرد اس کھردرے اور آرام دہ کمبل کو لپیٹ کر، اس نے اپنے منھ اور ٹھوڑی کو اپنی ٹانگوں سے بھینچ لیا؛ اس کے ہونٹ گھٹنوں اور رانوں کو چھونے لگے اور چہرہ اس کے بدن میں چھپ گیا۔ اس کے اندر سے حرارت کا جوار پھوٹا اور اس کا بدن پرسکون ہوگیا؛ ایسی قربت، ایسی سپردگی، ایسی سادہ تسکین اسے کسی اور چیز یا کسی اور فرد سے حاصل کرنے کا موقع کبھی نہیں ملا تھا۔ کوئی

چیز اس سے مشابہت نہیں رکھتی تھی۔ کوئی چیز اس مکمل اور خالص قربت تک نہیں پہنچتی تھی۔ باقی سارے نشوں میں کوئی ایسی علیحدگی، کوئی ایسی رکاوٹ تھی جو ہر تسکین، ہر تکمیل کو غارت کر دیتی تھی۔

یہ بات اس کی ماں کے معاملے میں بھی صادق آتی تھی جو اس وقت اسے جگا رہی تھی؛ اس کی آواز بڑھاپے سے کم زور ہو کر ایک یاس انگیز، کوشش کر کے پیدا کی ہوئی دردمندی تک رہ گئی تھی۔

اب اس کے دل کو ایک بیٹی کی نرمی نے جکڑ لیا جسے اپنی ماں سے محبت تھی اور جو ایک ایسے پُرخطر کام میں اس کی شریک تھی جس کی حدیں جرم سے جا ملتی تھیں۔ اسے اس مبہم خطرے کی وجہ سے اپنی ماں پر ترس آنے لگا جو ان دونوں پر منڈلا رہا تھا، ایک خطرہ جو نامعلوم اور غیر واضح ہوتے ہوئے بھی ان سے باہر چاروں طرف، اور ان کے اندر بھی، ان کا منتظر تھا۔

اس کے باوجود اس کی ماں اس سے فاصلے پر تھی، دوسرا فرد تھی۔ بڑھاپے کی جھریوں نے اس کے چہرے کی نرم جلد کو اپنے ہل سے کھود ڈالا تھا، اس کی دھندلی، کم زور آنکھوں کو سیال کر دیا تھا، اور اس کے سر کے نمک کے رنگ کے بالوں کو، جو ایک پرانی بدرنگ اوڑھنی میں چھپے ہوئے تھے، خشک کر ڈالا تھا۔ ان سب نے ان دونوں میں پار نہ ہو سکنے والی دُوری پیدا کر دی تھی، اور ماں کے واسطے اس کے نازک جذبے کو زیریں سطح پر پہنچا دیا تھا جیسے یہ جذبہ کسی محبوب شخص کی طرف سے آنے والے پیغام میں جھلک رہا ہو مگر وہ شخص بہت دور، کسی اور ملک میں رہتا ہو۔

اس نے بستر پر لیٹے لیٹے انگڑائی لی، پھر ایک لذت انگیز حرکت سے اپنے بازو اور ٹانگیں سکیڑ لیں؛ اس نے اپنا سر رانوں پر سے اٹھایا اور، آنکھیں میچے میچے، تکیے کی گود میں رکھ دیا جو اس کے رخسار کے رات بھر کے لمس سے نم اور گرم ہو رہا تھا۔ وہ کمبل لپیٹے، گدے اور تکیے کے گداز میں سے اپنے بدن کی خوشبو میں سانس لینے لگی جو نیند اور گرمی سے بوجھل ہو رہی تھی؛ بدن کی کروٹوں اور رات کے پسینے سے گندھی ہوئی خوشبو جو آنتوں کی اور مدفون خواہش کی چکناہٹ اور گاڑھے پن سے بھاری ہو رہی تھی۔ ہاں، اس کے پاس اس کے بدن اور اس کے گھیر میں آنے والی چیزوں کے سوا کچھ اور نہیں تھا، اس کا بدن جو پوری دنیا پر محیط تھا اور جس کے باہر کوئی چیز وجود نہیں رکھتی تھی: کمرہ، گلی، لوگ، آسمان، ان سب کا اسے احساس تو تھا — اور اس کا احساس مبہم ہونے کے باوجود گہرا تھا — لیکن یہ سب اسے اپنے بدن کی سرحدوں پر محسوس ہوتے تھے، اُن حدوں پر جہاں اس کے بدن کا اختتام ہوتا تھا۔ ان حدوں سے باہر کسی چیز کا وجود نہیں تھا؛ ساری دنیا اس چیز کی حدوں میں تھی جو اس کے پاس تھی۔ اس کے پاس اس چیز کے سوا کچھ نہیں تھا اور وہ چیز صرف اس کی تھی، اور وہ اسے چادروں میں لپیٹ کر اس کی گرم، گھنی خوشبو میں سانس لے سکتی تھی، اس کی سب سے اندر کی تہوں میں خود کو لپیٹ سکتی تھی۔

اس کے باہر کبھی کسی چیز کا وجود نہیں رہا تھا۔ اس کا شوہر، جو کسی زمانے میں اس کے پاس راتوں میں آیا کرتا تھا، کھردرا اور سوکھا ہوا تھا، اس کی عمر ڈھل رہی تھی، اس کی بو میں کچی پیاز، گودام کے گرد و غبار اور خشک بوریوں کی چبھن ملی ہوئی تھی، کیونکہ وہ پیاز کی آڑھت کرتا تھا۔ اسے اپنے شوہر کی دست اندازی بھی اپنے اوپر تجاوز محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اسے کچھ محسوس ہوتا تھا تو اس تنہا مخلوق کے لیے بس تھوڑا سا ترس جو اس کے پہلو میں، اس کے بازوؤں میں پناہ ڈھونڈتا تھا۔ اس کا بے جان سر اس کے سینے پر تقریباً گر پڑتا تھا، اس کے جسم سے زندگی کی قوت زائل ہو چکی ہوتی اور وہ سوکھی ہوئی، عمر رسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچا سا رہ جاتا جو کبھی کا مر چکا ہو۔

وہ درحقیقت دو سال پہلے مرا تھا۔ وہ اس کی موت پر کبھی غم کا احساس نہیں کر پائی تھی، کیونکہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کا نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے کفن میں اس کے معمر، سوکھے ہوے، کم قامت جسم اور زردی مائل سفید جھاگ میں لتھڑے ہونٹوں پر نظر ڈالی تو اسے محض رحم کا ہلکا سا احساس ہوا اور وہ اس سے کچھ دور کھڑی ہوئی اسے جیسے بہت فاصلے سے دیکھتی رہی۔

وہ اپنی ماں کے گھر لوٹ آئی تھی۔ چند قیراط زمین سے آنے والی قلیل سی آمدنی پر وہ بالائی مصر کے علاقے میں ایک جوان بیوہ کی زندگی گذارنے لگی تھی؛ قدیم دیواروں میں بند، چھت پر بنے ہوے کمرے اور زینے کے اوپر والے باورچی خانے کے درمیان آتی جاتی ہوئی۔

لیکن اس کا بدن اس سے بغاوت میں اٹھ کھڑا ہوتا اور پوری دنیا تسکین نہ پانے والی خواہش سے دھڑکنے لگتی۔ اس کی اندرونی خواہشوں کی اس پُراسرار سرکشی نے اسے ایسی چیزیں کرنے پر اکسایا جو کوئی لڑکی خاندان میں اس قسم کی صورت حال میں نہیں کرے گی — اور ان چیزوں کے لیے وہ خود کو یہی جواز دیتی کہ اب وہ کنواری نہیں ہے۔

وہ سرکاری اہلکاروں کی شہر میں پلی بڑھی بیویوں یا جدید زمانے کے اسکول کی طالبات کی طرح چہرہ بےنقاب کیے باہر آتی جاتی تھی۔ اس نے وہ بھاری برقع اتار پھینکا تھا جس میں دیہات کی عورتیں خود کو سر سے پیر تک ملفوف رکھتی ہیں اور جسے پہنے پہنے وہ گلیوں میں سے گذرتی ہیں اور ان چلتے پھرتے، سیاہ اور پھڑپھڑاتے ہوے خیموں میں سے ان کی آنکھوں کی چمکتی ہوئی پتلیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، جیسے وہ ممنوعہ اشیا ہوں جن پر نظر نہیں ڈالی جانی چاہیے، جیسے وہ دہشت ناک، غیر انسانی قوتوں کی حامل کوئی ملعون چیز ہوں۔

اگرچہ قصبے میں بھی یہ بات اہمیت رکھتی تھی لیکن اتنا سنگین مسئلہ نہیں تھی، کیونکہ وہاں سرکاری اہلکاروں کی بیویاں اور کچھ اَور عورتیں یورپی لباس پہنے دکھائی دے جاتی تھیں؛ ان کا انداز کچھ کچھ دیہاتی سا ضرور

ہوتا لیکن لباس کی حد تک وہ بالکل شہر کی عورتیں دکھائی دیتیں۔ اصل سنگین بات یہ تھی کہ وہ کبھی کبھی اسی طرح بے نقاب حالت میں گاؤں میں بھی چلی جاتی تھی جہاں خاندانی زمینیں واقع تھیں، اور اس بات نے بے حد سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ لیکن اس کی طبیعت میں ضد تھی، اور ایک بار کوئی راہ اختیار کر لینے کے بعد کوئی چیز اس کی راہ تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا گھرانہ — وہ لوگ قبطی تھے — باقاعدہ کسانوں کے پیشے سے تعلق نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ اپنے بیٹوں کو اسکول اور کالج بھیجتے تھے، اور ان میں سے کئی اپنی تعلیم ختم کر کے اب قاہرہ میں ڈاکٹروں، انجینئروں اور کیمیادانوں کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ لیکن دیہات کی بات اَور تھی اور یہاں ہانیہ کا یہ طرزِ عمل سخت نامناسب تھا: خاندان کے ڈاکٹروں اور وکیلوں تک کی بیویاں اس دیہاتی قانون کی خلاف ورزی کی ہمت نہیں کرتی تھیں کہ بالائی مصر میں — اور خصوصاً کسی گاؤں میں — کوئی عورت سر سے پیر تک برقعے میں ملفوف ہوئے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گی۔

خاندان کے وکیل بھی، سرکردہ پڑھے لکھے لوگ بھی اسے اس طرزِ عمل سے باز رہنے پر مجبور نہیں کر سکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں للکار کی چمک تھی، سرکشی کی مسرت تھی، جبکہ اس کے پتلے، نازک ہونٹوں کے کناروں پر خفیف تمسخر سے ملتی جلتی کوئی چیز کھیلتی رہتی تھی، جیسے وہ — جس کی تعلیم پرائمری اسکول سے آگے نہ بڑھی تھی — ایسی چیزوں سے واقف ہو جن سے واقف ہونے کا کسی اور میں حوصلہ نہیں، اور اپنی اس آگاہی میں ایسی سچائیوں کا سامنا کر رہی ہو جن سے سب لوگ ہمیشہ نظریں چراتے رہے ہوں۔ تقریباً بے بس کر دینے والی تعجیل سے تنے ہوئے اپنے بدن کی تیز، چونکتی ہوئی حرکت سے، اپنی بے باک ہنسی سے اور اپنی پراعتماد اور پروقار نسوانی چال سے وہ سب کا منھ بند کر دیتی؛ اس میں اسے کوئی لفظ ادا کرنے کی ضرورت نہ پڑتی، صرف اس کی موجودگی، اور اس کی جانداری کی مہک یہ کام کر دیتی۔ دراصل وہ ان کو خوف اور بے اطمینانی میں مبتلا کر دیتی تھی، جیسے اس نے ان زخموں کو چھو لیا ہو جو بھر چکے ہونے کے باوجود ابھی تک حساس ہوں اور اس کے لمس سے پھر ہرے ہو جائیں، تقریباً کھل جائیں اور ان لوگوں پر سوچ کی ایسی پرصعوبت راہوں کے دروازے وا کرتے ہوں جنھیں بند رکھنا ان کی زندگی کی مسلسل جدوجہد رہی تھی۔ لوگوں کی طرف وہ، فرعونوں کے زمانے کے مصر کی کسی بلی کی طرح، تیز، بے پروا، بے تعلق انداز سے نظر ڈالتی تھی، بدن کے افق پر کھلتی ہوئی اس کی کالی آنکھیں بدن کی پوری دنیا کو دیکھتی تھیں اور اس میں کہیں کوئی خرابی نہ پاتی تھیں، اس کا پورا بدن جو اپنے آپ سے آگاہ تھا اور خوف زدہ نہیں تھا — اصل میں انھی سب میں ان لوگوں کو دہشت زدہ کرتا ہوا وہ خطرہ جھلکتا تھا، اسی لیے وہ اس خطرے کا سامنا ہونے پر اپنی آنکھیں ڈھانپ لیتے تھے، اور انھی سب میں وہ خطرہ بھی موجود تھا جس نے خود اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور اس کی زندگی کی حدوں تک پہنچنے کی جستجو میں تھا۔

اس کا سب سے داخلی، نجی تجربہ اب راز نہیں رہا تھا؛ یہ خبر اس کے خاندان تک پہنچ گئی تھی، اور باہر بھی پھیل گئی تھی، کہ اس کا اس مسلمان کسان سے تعلق ہوگیا ہے جو گاؤں میں ان کی زمینوں پر کام کرتا تھا۔ یہ خبر متواتر اور ضرر رساں تھی اور ضدی مکھیوں کی طرح لوگوں کے سروں میں بھنبھناتی پھر رہی تھی۔

کیا یہ واقعی درست ہے کہ وہ کسان کبھی کبھی پوری رات اس کے گھر پر گذارتا ہے؟

ناممکن — اور اس کی ماں؟

کیا واقعی اسے فجر کے وقت، سوتے ہوئے قصبے کی تنگ گلی سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا؟

اور اس کا کیا سبب ہے کہ وہ گاؤں سے مشتبہ طور پر قصبے کا چکر لگاتا رہتا ہے اور بار بار اس کے گھر جایا کرتا ہے؟

حساب کتاب کے لیے؟ فصلوں کا حال بتانے کے لیے؟

یہ باتیں کرنے کے لیے وہ خاندان کے بڑوں کے پاس کیوں نہیں جاتا جو دراصل ان معاملوں کی دیکھ بھال کے ذمے دار ہیں؟ ان کے لیے اسے ان دونوں عورتوں کے پاس اس دور افتادہ، شہتیروں والے مکان میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیا درحقیقت وہ وہاں جاتا بھی ہے جیسا کہ افواہیں مشہور ہوگئی ہیں؟

ماں نے اپنی کم زور، کوشش سے نکالی ہوئی آواز میں ان افواہوں کے ایک ایک لفظ کی تردید کی، لیکن لڑکی یہ باتیں سنتے ہی اپنی گھبرائی ہوئی، اشتعال انگیز ہنسی ہنسنے لگی، اور سارے معاملے کو سرسری سے انداز میں رد کردیا، ان کے اس الزام کو بے پروائی اور بے احتیاطی سے ایک طرف کردیا۔

''ہانیہ! اٹھ جاؤ بیٹی، دیر ہو رہی ہے۔''

اس نے تکیے پر سے سر اٹھایا اور اس کے گھنے بال اس کے چاروں طرف پھیل گئے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گندمی چہرے کے نازک نقوش کے ساتھ اس کے سر پر ایسے گہرے سیاہ اور بے پناہ گھنے بال کہاں سے چلے آئے جن کی وجہ سے وہ قدیم مصر کی کوئی دوشیزہ دکھائی دیتی تھی۔

اس نے کمبل کو اپنے بدن سے جدا کیا اور کمرے کی گرم ہوا کا جھونکا اس کی ٹانگوں کے درمیان چڑھ آیا جو اس کے لمبے شب خوابی کے لباس کے نیچے برہنہ تھیں۔ وہ بدن کو پھرتی سے حرکت دے کر بستر سے اتر آئی اور نرم لچک دار انداز میں کھڑی ہوگئی؛ قالین کی کھردری اون اس کے پیروں کے تلووں کو گدگدا رہی تھی۔ وہ خود پر ایک عجیب، مخصوص انداز میں مسکرائی۔

''ماں، کیا بجا ہے؟''

ہاں، اسے جلدی کرنی ہوگی، کیونکہ دن کی حدت ابھی سے اپنے عروج کو پہنچ رہی ہے۔ وہ بہت دیر تک سوتی رہی۔

جب وہ اوپر چھت پر گئی تو بالائی مصر کا آسمان، سیسے کی گہری نیلی چادر کی طرح، بھاری اور دیر سے منتظر اچانک پن کے ساتھ اس پر آ گرا۔ برداشت سے باہر۔ اس آسمان کے نیچے ہوا بالکل رکی ہوئی تھی، جیسے اس کی لگام کھینچ لی گئی ہو، جیسے وہ اس آسمان کے وزن کے نیچے حرکت کرنے کی کوشش ہی کے ہاتھوں فنا ہوگئی ہو؛ ہوا اپنا پورا زور لگا کر بھی اس وزن کو اپنے اوپر سے دور کرنے اور ذرا سی حرکت کرنے کے قابل نہ رہی تھی، جیسے کسی کے بازو کے عضلات اپنی پوری قوت سے کوئی بہت بڑا بوجھ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہوں جس کے تلے انھیں ایک لمحے کے لیے خود کو ڈھیلا چھوڑنے کی مہلت نہ مل رہی ہو۔

وہ حدت اور مشقت کی ایک لہر میں سے، گویا بہاؤ کے خلاف راستہ بناتی ہوئی، چھت پار کر کے تنور والی کوٹھری تک پہنچی۔

اسے اپنی ماں تنور کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھی، اس میں لکڑی کے کندے ڈالتی اور اسے روشن کرتی دکھائی دی؛ اس کی حرکات کے پیچھے اس کی چھوٹی سی محدود زندگی کا زور تھا جو لگتا تھا کہ اپنے اندر قید ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ اس نازک جذبے کے ہاتھوں اداس ہوگئی جو اس کے دل کو کسی بہت تیز دھار والے چاقو کی طرح کونچ رہا تھا اور اس میں ایک ناگوار ترحم پیدا کر رہا تھا جو شدید ملائمت کے زخم کی طرح محسوس ہوتا تھا۔

لیکن، اس کے باوجود، وہ کوٹھری کے دروازے ہی پر رک گئی اور اپنی ماں سے دور ہی سے سلام دعا کی۔ اس سے یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنی ماں کے قریب جا کر اس کے کم زور کندھوں کو اپنے بازوؤں میں لے لے اور اسے بوسہ دے، حالانکہ اس وقت وہ ایسا کرنے کی خواہش کے ہاتھوں اذیت اٹھا رہی تھی۔ ایسے لوگوں میں ماں بیٹی کے درمیان یہ محبت بھری حرکات عام نہیں ہیں؛ اس کے علاوہ اسے ان کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے اس نازک جذبے کا پیغام اپنی ماں تک کس طرح پہنچائے جو اس کی روح میں زخم ڈالے دے رہا تھا۔ اس کی ماں اس سے واقف ہوئے بغیر ہی دنیا سے چلی جائے گی۔

وہ مڑی اور آسمان کی بھاری، خارش زدہ لہر میں سے راستہ بناتی ہوئی واپس چلنے لگی جو کسی بہت بڑے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی قوت کی طرح تناؤ کی آخری حد پر تھا۔

جس وقت وہ قصبے کی بڑی سڑک کے کنارے بنے ہوئے پرانے، ایک دوسرے میں گھسے ہوئے مکانوں کے سائے میں، چھڑکاؤ کی ہوئی زمین پر چل رہی تھی تو آسمان کا بوجھ کچھ کم ہوگیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس نے اپنے دل سے اپنی ماں کی محبت کا اور آسمان کا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس کیا۔ وہ اپنے چھریرے، مضبوط بدن پر تنگ یوروپی وضع کا لباس پہنے، خوش طبعی کے ساتھ، تیز قدموں سے پتلی، پیچ دار گلیاں طے کرتی رہی جن کے کناروں پر بنے ہوئے مکان سر پر جھکے آ رہے تھے۔ اس کا ذہن اپنے سفر کے مقصد پر لگا ہوا تھا۔

پچھلے روز اسے ذکری کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ آج باغ پر پہنچ جائے تاکہ موسم کے پھلوں کا حساب کر سکے اور زمین وغیرہ کے معاملات پر اپنے عم زاد بکتور اور بزرگ شفیق سے بات چیت کر سکے۔

خاندانی زمین پر لگے ہوئے باغ پر جانا ہمیشہ اس کے لیے خوشی اور دلچسپی کی بات ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہاں اس کی بچپن کی آوارہ گردیوں کا جادو ابھی تک باقی ہے۔ اسے یقین تھا کہ آج واپسی پر وہ اپنے ساتھ پھلوں کا تحفہ لا سکے گی اور شاید اسے اپنے اور اپنی ماں کے حصے کی کچھ رقم بھی مل جائے۔ یہ درست ہے کہ وہ لوگ اس حساب کتاب کے لیے اس کے گھر بھی آ سکتے تھے، لیکن باغ میں گھومنے پھرنے کا خیال، بڑے بڑے پرانے پیڑوں کا ٹھنڈا سایہ، رہٹ سے بل کھا کر آتے ہوئے نالے کے پانی کی گنگناہٹ — باہر سے آتی ہوئی کھلی ہوا میں کھیلتی ہوئی گنگناہٹ — ان سب چیزوں نے اس کے وجود کی گہرائیوں میں پرانے دنوں کی کسک اور آرزو جگا دی، اور ساتھ ہی اس کے مبہم سے خوف کا بھی منھ بند کر دیا۔ اگرچہ وہ ان لوگوں سے، جو اس کے رشتے دار تھے، خوف زدہ نہیں تھی، پھر بھی ان کی موجودگی میں اسے کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی جیسے ان کے درمیان ایک ہی گھرانے کے خون کا بندھن نہ ہو، جیسے وہ بالکل نہ جانتی ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھا ہو اور ان میں ایک ایسی دنیا کی جھلک نہ پائی ہو جو اس سے بہت دور اور اس کے لیے بند تھی، ایسی دنیا جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ان کے طویل، ختم نہ ہونے والے حساب کتاب اور ہند سے؛ فصلوں اور ان کی فروخت سے، اور بٹائی اور رہن کے معاملات سے ان کا شغف؛ اس نے کبھی ان کو سمجھنے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ان کی یہ تمام فکریں اسے احمقانہ، بے کار کی مشقت معلوم ہوتی تھیں جن کی ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں تھی۔ اسے حساب کتاب کا کام اکتانے اور تھکانے والا لگتا تھا، اور اگرچہ وہ لوگ یقیناً اس کے ساتھ دھوکا کر رہے تھے، اسے اس کی کوئی فکر نہیں تھی، حالانکہ بلاشبہ ان ماں بیٹی کے لیے ایک ایک پیاستر بہت کام کا تھا۔

اچانک اس نے خود کو نیل کے روبرو پایا۔ وہ سڑک سے اتر کر دریا کے کنارے کنارے اس گودی کی طرف چلنے لگی جہاں سے اسے کشتی میں بیٹھ کر دریا کے دوسرے کنارے پر اپنی زمینوں اور باغ تک پہنچنا تھا۔ گودی پر آفندی طبقے کے کئی لوگ کھڑے تھے؛ ان میں سے ایک نے سیاہ سوٹ اور سر پر طربوش پہن رکھا تھا اور کاغذوں کا ایک پلندا اٹھا رکھا تھا — شاید وہ عدالت کا ناظر یا انتظامیہ کا کارندہ تھا۔ ان کے علاوہ باقی لوگ تاجر، کاشتکار اور کسان وغیرہ تھے۔ کسانوں میں سے ایک اپنے پیچھے پیچھے اپنی بھینس کو رسی سے کھینچے لیے آ رہا تھا تاکہ اسے دریا پار لے جا سکے۔ وہ سب اس گاؤں کو جا رہے تھے جو اس کے باغ سے کچھ دور پر واقع تھا۔ دو عورتیں بھی تھیں جن کے بھاری، سیاہ برقعے بھری دوپہر کی گرمی میں بھی ان کے جسموں کے گرد لپٹے ہوئے تھے، اور برقعوں کے اندر وہ سیاہ رنگ کے بھاری کپڑے پہنے تھیں تاکہ کوئی اجنبی نگاہ ان

تک نہ پہنچ پائے۔

کشتی آئی تو اس نے اس پر قدم رکھا اور کنارے کے پانی میں آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتے ہوئے اس کے تختے کو اپنے پیروں کے نیچے ڈولتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے کوشش سے توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنے بدن کے نیچے کشتی کے ہچکولوں کو محسوس کیا اور اسے اس خفیف سے خطرے سے لطف آیا جو نیل کے پانیوں پر پتلی سی لیکن تنی ہوئی جھلی کی صورت میں تیرتا رہتا ہے۔

کشتی کے حرکت میں آتے ہی ہوا دریا کے وسیع پھیلاؤ سے اٹھتی ہوئی چلنے لگی اور اس کے نیچے پانی پُرسکون وقار کے ساتھ بہتا رہا۔ آسمان کے بوجھ کے پوری طرح دور ہو جانے سے اس پر بہت خفیف، تقریباً غیر محسوس ہیبت سی چھا گئی جیسے دریا کسی قدیم، دیوتاؤں کی سی طلسمی قوت کا مالک ہو جس سے کام لے کر لوگوں کے کندھوں کو آسمان کے بوجھ سے آزاد کر دے — اتنے عرصے کے لیے جب تک وہ دریا کے بازوؤں میں رہیں، جب تک وہ اپنے آزاد کردہ، افق کے سامنے کھلے ہوئے سینوں کو دریا کی ہوا سے بھرتے رہیں اور ان کے اندر آزادی کا وسیع میدان سانس لیتا رہے۔

چوڑی کشتی نے دریا کے بھرپور بہاؤ پر سے گذرتے ہوئے جھٹکا کھایا جس پر بھینس نے اچانک نیچے کی طرف جاتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر آسمان کے نیچے کی حدت کی طرف دیکھا، پھر اطمینان سے جگالی کرنے لگی اور اس کے منھ میں سے سفید دودھ جیسا لعاب بہہ کر کشتی کی سطح پر گرنے لگا۔

جب دوسرا کنارہ قریب آیا اور کھجور کے اور دوسرے پیڑوں کے گھنے جھنڈ آہستہ آہستہ بڑے اور زیادہ واضح دکھائی دینے لگے، اس کے دل کو ایک بار پھر خوف جیسی کسی چیز نے جکڑ لیا: وہ اپنی مانوس دنیا سے ایک اجنبی زمین پر جا رہی تھی جہاں کے گھنے پیڑ اسے کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھنے والی بھوکی آنکھوں سے گھور رہے تھے اور اپنے اندر اس کے لیے ان جانے خطرے چھپائے ہوئے تھے۔ اسے لگا کہ دریا اسے دوسرے کنارے پر اگل کر اس سے بے نیاز ہو جائے گا؛ دریا اس سے وہ آزادی، وہ طمانیت اور کشادگی کا وہ احساس واپس لے لے گا جو اس نے عارضی طور پر اسے بخشا تھا، اور ایک بار پھر، بے لگام، اپنی تقدیر کی جانب روانہ ہو جائے گا جو انسانوں کی تقدیر سے مختلف ہے۔

وہ کنارے پر اپنے چھوٹے سے بدن کے ساتھ اتری جو دنیا میں، یا کہیں بھی، اس کی واحد ملکیت تھا؛ اس کا نازک، دھڑکتا ہوا بدن جس نے ایک بار پھر دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا، گھیر لیا، محدود کر دیا۔ اسے اچانک آسمان کے دوبارہ نمودار ہونے اور اپنے پر حاوی ہو جانے کا احساس ہوا۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ باغ کی طرف جانے والے کچے راستے پر چلتے ہوئے، آسمان کسی بھاری ہاتھ کی طرح اس پر آ پڑا اور اس کے کندھوں پر زور ڈال کر اسے جیسے زمین میں دھنس جانے پر مجبور کرنے لگا۔ ہاں، وہ دیر سے پہنچی تھی:

دوپہر کی گرمی شدید ہوگئی تھی، اور ہوا، اپنی سنسناتی ہوئی شدت میں، مکئی کے کھیتوں کے درمیان چکر کھا رہی تھی جو اس کے دونوں طرف گنجان سبزے کی دیواروں کی طرح اٹھے ہوئے تھے اور ان کے اوپر دھول اڑ رہی تھی۔ زمین اور بھاری آسمان کے درمیان مقید اس دھول بھری ہوا نے تقریباً اس کا دم گھونٹ دیا۔

کسان اپنے زردی مائل مٹیالے چہروں کے ساتھ کچھ دور تک اس کے ساتھ ساتھ چلتے آئے؛ ان کی بھوکی زخمی آنکھیں، جو اپنے اندر تمام بدحالی کو سمیٹے ہوئے تھیں، باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں؛ آنکھیں جنھیں کبھی کسی اور شے کی موجودگی کا گمان تک نہیں ہوا تھا؛ وہ ایسی بدحالی تھی جو بہت لمبے عرصے تک جمے رہنے کی وجہ سے غبی پن میں تبدیل ہوگئی تھی، وہ اتنے عرصے سے موجود تھی کہ گویا زندگی کا بنیادی آسرا بن کر رہ گئی تھی۔ اسے ان کی تعاقب کرتی ہوئی نگاہوں کا احساس ہو رہا تھا جن میں ایسی خشک اور سخت افسردگی تھی جس نے الزام رکھنے، سمجھنے یا توجیہہ کرنے کی ہر خواہش کو خیرباد کہہ دیا تھا، جس میں ایک ٹھوس، تھکا دینے والے بوجھ کے سوا کچھ نہ تھا جو ناقابلِ برداشت ہونے کے باوجود ہمیشہ ساتھ رہتا ہے اور ہمیشہ برداشت کیا جاتا ہے؛ اس سے امید کی ذراسی رمق بھی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ یہ ایک خالص اور بےآمیز افسردگی ہے جو اپنی سخت جانی کے سوا ہر چیز سے بےنیاز ہے۔

راستے پر ایک دوراہا آیا تو کسان گاؤں کی طرف مڑ گئے اور ہانیہ نے باغ کی سمت جانے والا تنگ راستہ لے لیا۔ وہ اب ان نگاہوں کی زد سے دور تھی جو اس پر یوں پڑتی رہی تھیں جیسے وہ کوئی عجیب جانور ہو، ہر چیز کی طرح ناقابلِ فہم، کیونکہ ان کے اردگرد کی ہر چیز ان کی سمجھ سے باہر تھی، اور انھیں اس بات کی کوئی شکایت بھی نہ تھی، جس طرح اس بوجھ کی کوئی شکایت نہیں تھی جو گویا ان کی زندگیوں کا پیمانہ تھا۔

ہاں، اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تعاقب کرتی ہوئی نگاہیں اس کے لیے ان دبلے، زرد، سنولائے ہوئے چہروں سے وابستہ تھیں؛ اب آسمان کے اس ڈرا دینے والے بوجھ سے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اس کا بدن بھی نہیں جس کی جان اس شدید گرمی میں پیدل چلنے کی مشقت نے نکال لی تھی۔ اس کے خون کا دوران سست پڑ گیا تھا اور بہتے ہوئے پسینے پر دھول اڑ اڑ کر چپک گئی تھی اور پسینہ اس کی بغلوں کو بھی گیلا کیے دے رہا تھا۔ اس کے اندر ایک خوف تھا، بےشکل سا، غیرواضح، لیکن پھر بھی اس کی آنتوں میں چھوٹی سی سخت گرہ ڈالے دے رہا تھا: گھنی گنجان فصلوں کا خوف جن کے درمیان بہت تنگ پگڈنڈیاں تھیں؛ ڈاکوؤں کے جتھوں، قتل و خون اور اغوا اور تاوان کی طلبی کی ان وارداتوں کا خوف جو کھیتوں کے درمیان کی ان تنگ پگڈنڈیوں پر روز کا معمول تھیں؛ ان آدمیوں کا خوف جو وہاں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے اور موقع پاتے ہی قدیم، سفاک غضب کے ساتھ، مکمل انکار کی سرکشی کے ساتھ، اور ہمیشہ کی بندگی سے انکار کرنے والی مایوسی میں، زمین اور آسمان کی بازی لگا دینے والے خون

کے زور میں، اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

یہ مایوسی اور آدمیوں کی خواہشیں اب بھی وہیں کہیں تھیں۔ وہ انھیں مکئی کی الجھی ہوئی، گرد آلود شاخوں سے چمٹا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ تباہ کن، بے قابو خواہشیں آدمیوں کے وجود سے الگ ہو کر دوپہر کی حدت میں گھل گئی ہوں: کبھی سیراب نہ ہونے والی تمنائیں، سرکش ہوس، جھپٹ پڑنے اور زیر کرنے کی، لُوٹنے اور خون بہانے کی بے لگام وحشی خواہش، روح کے تاریک کونے کھدروں سے اٹھتی ہوئی جہاں جانے کا ہر راستہ بند ہے؛ جیسے بے عصمتیوں کو الگ آزاد، بے شکل اور سخت جان وجود مل گیا ہو اور وہ دوپہر کی اس حدت کو اپنی دم گھٹ کر دینے والی، غراتی ہوئی غیر انسانی سانسوں سے معمور کر رہی ہوں۔

اپنے اندر گہرے گڑے ہوئے اس خوف کے اثر میں جب اس نے کھیتوں کی طرف چور آنکھوں سے دیکھا تو اسے اپنا وجود بالکل بے حقیقت اور اپنی نظر میں بے قدر معلوم ہونے لگا۔ وہ اپنی پچھلی ہمت کے دامن کا سرا تھام کر آگے بڑھتی گئی، جیسے ڈوبتا ہوا شخص سطح پر تیرتی ہوئی لکڑی سے چمٹ جاتا ہے۔

وہ اس خاموش دل گرفتگی کے عالم میں آگے بڑھتی گئی جو کسی کھلی جگہ کو، کسی ہوا کو راہ نہیں دیتی تھی، وہ اس گرم بھاری پن میں سے دقت کے ساتھ اپنا راستہ بناتی آگے بڑھتی گئی جو اس کے گذرتے ہی اس کے آگے، پیچھے، ہر طرف سے پھیل کر بند ہو جاتا تھا؛ اسے لگا کہ جب وہ رینگ رینگ کر اس کے وسط میں پہنچے گی تو یہ بھاری پن اسے چاروں طرف سے گھیر لے گا، اسے پہچاننے سے انکار کر دے گا، مسلسل اسے ٹھکراتا اور رد کرتا رہے گا اور بالآخر اسے مٹا ڈالے گا۔

اچانک، غیر متوقع طور پر، اس نے خود کو باغ کی دیوار کے سامنے پایا؛ یوں جیسے وہ دیوار، گذرتے وقت سے متاثر نہ ہونے والی پتھر کی سلوں سمیت، اس کے سامنے گرد آلود راستے سے اٹھ کر ایک آن میں بلند ہو گئی ہو۔ باغ بہت زمانے پہلے دست بہ دست اس کے خاندان تک پہنچا تھا؛ شاید اس کے کسی پرکھے نے اسے بہت پہلے کسی بڑے جاگیردار سے خریدا تھا۔ ابھری ہوئی زمین کی سطح پر لگا ہوا اور اس اونچی ٹھوس دیوار سے گھرا ہوا یہ وسیع و عریض، قدیم اور بھرا پرا باغ پورے خاندان کے لیے عزت اور فخر کا سرمایہ تھا۔

اس نے پرانے چوبی دروازے کا پٹ بند کیا تو وہ اپنے زنگ لگے قبضوں پر جھول کر چرچرایا۔ اس کے قدم تنگ اور دم گھونٹنے والی پگڈنڈی کی دھول کو چھوڑ کر گھنے، سرسبز اور مضبوط پیڑوں کے سائے میں بنی ہوئی چوڑی روش پر چلنے لگے جس کے دونوں جانب گھاس لگی ہوئی تھی۔

دور تک پھیلا ہوا باغ خاموش اور سنسان تھا۔ اس کے آخری گوشے میں پیڑوں کے اونچے، گٹھیلے تنوں کے درمیان سے دیوار کے پرانے پتھریوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی ان کہے، پراسرار پیغام کا اشارہ دے رہے ہوں۔ ایک دم پتلی جھاڑیوں میں سے کسی کوے کی آواز آسمان میں بلند ہوئی اور اس کے

بعد پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔

اس نے اردگرد کے پھیلاؤ پر نظر ڈالی اور باغ کے کونے میں بنے ہوئے کمرے کی طرف بڑھتی گئی۔ وہ خود کو دنیا میں تنہا محسوس کر رہی تھی؛ تنہا، کسی خوف، کسی امید، کسی خواہش کے بغیر؛ بالکل تنہا، جیسے زمین کی سطح پر ابھی کسی انسان کے قدم نہ پڑے ہوں، جیسے انسان محض گمان ہو جو ابھی خیال میں بھی نہ آیا ہو، ایسا عنصر جو زمین کے لیے اجنبی، غیر متعلق ہو۔

تنہائی؛ زمین کا سکوت، جس سے ایک خاص طرح کی گرد آلود گرمی اٹھ رہی تھی؛ روشیں جو یوں بنی ہوئی تھیں جیسے چلنے کے لیے نہ بنائی گئی ہوں؛ آپ ہی آپ گھومتا ہوا رہٹ؛ آنکھوں پر پٹی باندھے اس کے گرد ازل سے گھومتا ہوا بیل، جیسے وہ کسی کے عمل کے بغیر خود بخود وجود میں آ گیا ہو اور اس بند دائرے میں چکر کاٹنے لگا ہو۔

کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے سکون جیسی کوئی چیز محسوس ہوئی؛ اس وسیع وعریض باغ پر تسلیم اور اطمینان کا سا احساس ہوا جو ازل سے سنسان پڑا تھا، قدیم پیڑوں اور ان کے تنوں کی گانٹھوں، چوڑی کچی روشوں، ناہموار میدان، مٹی کے ٹیلوں، تاڑ کے اونچے، خم دار درختوں، دور کے نیلے، فطری آسمان اور اس دیوار سمیت، جس پر آ کر ہر چیز ختم ہو جاتی تھی۔

وہ مڑی اور راستے پر چلتے ہوئے — گویا وہ اس کا حصہ نہ ہو — کمرے کی طرف بڑھتی گئی جہاں اس کے رشتے دار اس کے منتظر تھے۔

بکتور، اس کا سگا عم زاد، اس سے دس برس بڑا تھا؛ وہ اس بات کو جانتی تھی اور اسے ذہن میں رکھتی تھی، جیسے یہ کوئی فخر کی بات ہو، کوئی ایسا رشتہ ہو جو انھیں ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہو۔ اس کا جسم بہت مضبوط اور طاقت ور تھا، جلد شان دار گندمی رنگت کی تھی اور چہرے کے نقوش سے بے باکی اور سختی ظاہر ہوتی تھی؛ اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی اور اختیار کی چمک تھی؛ قد لمبا اور بے عیب تھا۔ وہ خاندان کے مردوں میں سب سے ممتاز اور وجیہہ لگتا تھا۔ ان میں وہ واحد مرد تھا جس نے اس کی صورتِ حال کی بابت اس سے کبھی ایک لفظ تک نہ کہا تھا: نہ کوئی سوال کیا تھا نہ نصیحت یا ملامت کی تھی۔ ان میں سب سے کم گو ہونے کے باوجود وہی تھا جو چھا جانے والی، حقیر کر دینے والی نگاہوں کے ذریعے سے اس کو سب سے بڑھ کر ملامت کرتا تھا۔ وہی تھا جس کا سامنا ہونے پر خوف کا اور ساتھ ہی بے پناہ تحسین کا احساس اس کے بدن میں سرایت کرنے لگتا تھا۔

جہاں تک شفیق کا تعلق ہے، وہ چند سال پہلے یونیورسٹی سے لوٹا تھا۔ اس نے یوروپی لباس پہننا ترک کر دیا تھا اور اپنے گھر، اپنی زمینوں اور اپنے گھیر دار جلابے میں سکون پا لیا تھا۔ اس کی کمر کے گرد اور ٹھوڑی

کے نیچے فربہی کے آثار نمودار ہو گئے تھے جس نے اس کی شخصیت میں کچھ زنانہ پن پیدا کر دیا تھا؛ اس کے گورے، بھرے بھرے چہرے کے خطوط ذرا لٹک آئے تھے اور ان میں سے اس کی چھوٹی چھوٹی خمار آلود آنکھیں چمکتی تھیں۔ ہانیہ نے ہمیشہ محسوس کیا تھا جیسے اس کی آنکھیں اسے بے لباس کر رہی ہیں، اس کی خواہش کر رہی ہیں، اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہیں، اس کے بدن کی سطح کے آس پاس بھٹک رہی ہیں، لیکن اسے چھونے یا اس میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر پا رہیں۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور بچپن میں، اس کے قاہرہ جانے سے پہلے، ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ مگر پھر اس نے اس دبلی، سوکھی عورت سے شادی کر لی تھی اور ہانیہ کو اس کے عمر رسیدہ شوہر کے واسطے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے بڑے سے مکان میں اپنے لیے سکون اور آسائش کا پورا انتظام کر رکھا تھا؛ اس کی راتیں شراب نوشی میں گذرتی تھیں جو صبح ہونے تک جاری رہتی تھی۔ جب کبھی ہانیہ کا ذکر آتا تو اس کا مزاج بگڑ جاتا اور وہ اسے گالیاں اور دھمکیاں دینے لگتا۔

تیسرا شخص ذکری تھا۔ وہ خاندان کا حقیقی سربراہ تھا، سب مردوں سے عمر میں بڑا۔ وہ مستقل مصروف رہتا تھا: کبھی آدمیوں کو کام پر رکھتا، کبھی بٹائی کے موسمی ٹھیکے دیتا، کبھی دوسروں کے بندوبست اور نائبی کے کام لیتا، ہمیشہ مصروف، ہمیشہ زمین پر بھاری قدم رکھتا ہوا۔ پستہ قد اور فربہ جسم کے باوجود اس کی مضبوط شخصیت کا احترام کیا جاتا تھا اور اس کی سرگرمی میں کبھی کوئی فرق واقع نہ ہوتا تھا؛ اس کی بھاری، گونج دار آواز میں ذہانت کی گہرائی محسوس ہوتی تھی اور اپنے منافعے اور مفاد کو دیکھنے میں اس کی آنکھیں کبھی خطا نہ کرتی تھیں۔ وہی تھا جو ہانیہ سے سب سے زیادہ نرمی سے بات کرتا تھا؛ اسے نصیحت کرتے ہوئے اس کی آواز میں پدرانہ شفقت ہوتی اور وہ اسے لوگوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں اور خاندان کی شہرت پر ان سے پڑنے والے اثرات کا خیال کرنے کی تاکید کرتا۔ اس کی گفتگو میں یسوع کا نام، آبا واجداد کا ذکر، قبطیوں کا مقام، سب کچھ پرویا ہوا ہوتا تھا اور یہ سب جھنڈے اس کی بھاری آواز کے اوپر پھڑ پھڑاتے رہتے اور اس کے لفظ رفتہ رفتہ اکتاہٹ اور بے تعلقی کا شکار ہو جاتے۔

ان تینوں کو اسے اپنے اپنے تعلق سے موسم کی فصل کا حساب دینا تھا۔ ہاں، وہ حساب کتاب کو جلدی سے نمٹا لے گی اور چند انار اور کھجوروں کے کچھ گچھے لے کر باہر نکل آئے گی اور پھر اکیلی باغ میں گھومتی اور سہ پہر کی ہوا کا لطف اٹھاتی رہے گی۔

اسے اس بات پر ہلکی، بہت ہلکی سی حیرت ہوئی کہ اس نے آج تک اس کمرے کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا جس کی لکڑی کی شکستہ، نیچی دیواریں، کھجور کی سوکھی شاخوں، چٹائیوں اور کپاس کے ڈنٹھلوں سے ڈھکی ہوئی، اس وقت اس کے سامنے تھیں۔ اس نے کبھی خیال نہیں کیا تھا کہ یہ ٹوٹی پھوٹی دیواریں کسی کمرے کی ہو سکتی ہیں۔

آسمان کی طرف فخر سے بلند ہوتے ہوئے پیڑ، اور ازل سے متواتر گھومتا ہوا خاموش رہٹ، وہ باغ کی ان سب نعمتوں پر نظر ڈالے بغیر، انھیں اپنے پیچھے چھوڑ کر کمرے میں داخل ہوگئی۔

جوں ہی اس نے اندر قدم رکھا، ایک منتشر سی افسردگی نے، جس میں مٹی اور نم سائے کی بو ملی جلی تھی، اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

اسی خاکی اور نم افسردگی کی حالت میں اس نے اپنے سامنے ان تین عفریت نما انسانوں کو کھڑے دیکھا اور اچانک منجمد ہوگئی۔ حرکت کرنے، یہاں تک کہ ایک قدم آگے رکھنے تک کی قوت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی اور اپنے اوپر تمام اختیار کھو چکی تھی: اس وقت بھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے خود پر دور سے نظر ڈال رہی ہو۔

ان تینوں پر ایک بے حد مہیب سنجیدگی طاری تھی جو مہلک، حتمی اور ناقابل فرار معلوم ہوتی تھی: شفیق کے بھاری، پسینے سے تر چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھیں، گویا بہت طویل انتظار کے بعد، اس کے بدن کو تاراج کر رہی تھیں۔ ذکری دور کونے میں کھڑا یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس وسیع، قدیم اور مضبوط عمارت کا پشت کا مینار ہو جو اس وقت اس کے سامنے تھی اور جس میں اس کا داخل ہونا لازم تھا۔ بکتور، گویا اس عمارت کا مرکزی ستون، ان دونوں کے درمیان کسی عجلت کے بغیر کھڑا تھا اور اپنے بازو کی طویل، سست حرکت سے اپنا سگریٹ زمین پر گرا رہا تھا۔ اس کا لمبا قد کسی قدیم کلیسا کے نوعمر، طاقت ور راہب کی طرح ایستادہ تھا اور گندمی چہرے پر مذہبی جنگ جوئی جیسا مقدس عزم جھلک رہا تھا، اس پر فیصلے کی سنگینی اور ناگزیریت کی ایسی مہیب پرچھائیں تھی کہ اس سے فرار کا خیال بھی ہانیہ کے ذہن میں نہ آسکتا تھا کیونکہ اس نے، بغیر کسی کشمکش کے، مزاحمت کی تمام قوت کو سلب کر کے، اس کی ذات کے اس حصے پر حتمی غلبہ پا لیا تھا جسے وہ ابتدا سے اپنی ملکیت سمجھتی آئی تھی۔

اس کی آواز ایک عجیب مدھم روشنی سے پارہ پارہ ہوتی ہوئی اس افسردگی کے کنارے سے، گویا کسی خواب میں، ہانیہ تک پہنچی:

''یہاں آؤ، ہانیہ!''

وہ نہ اپنا منھ کھول سکی اور نہ قدم بڑھا سکی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی لمحے زمین پر ڈھیر ہو جائے گی: اس کی تمام ہمت جواب دے گئی، جیسے وہ کبھی وہ پُراعتماد، بے پروا لڑکی تھی ہی نہیں جو قصبے میں سب لوگوں کی مخالفت کے باوجود اپنے راستے پر بڑھی چلی جاتی تھی۔ لیکن وہ گری نہیں، اور زمین پر گر پڑنے کے اس شدید انتظار نے اس پر حاوی ہو کر ہر دوسرے خیال کو معدوم کر دیا۔ مگر لمحے گذرتے رہے، وہ اس انتظار کے سرے پر کھڑی کپکپاتی رہی اور اس تناؤ نے اس کی جان نکال کر اسے کچھ بھی کر پانے کی

قوت سے محروم کر دیا۔

اس نے بکتور کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنی جانب آتے دیکھا؛ اس کے قدم اٹھانے کے انداز میں کسی عجلت کا نشان نہ تھا لیکن اس سے ایک مضبوط عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ ہانیہ نے اس کے چہرے کے خدوخال کو اچانک اپنی آنکھوں کے بالکل قریب محسوس کیا؛ وہ چہرہ اصل سے ہزار گنا بڑا معلوم ہو رہا تھا اور اس کی تیز نگاہ بے حد گہری تھی۔ اسے اپنے بدن میں ایک بے بس حرکت کا احساس ہوا اور پھر دو ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو گرفت میں لے لیا، دو ہاتھوں نے اس کا منھ بند کر دیا، دو ہاتھوں نے اس کی گردن جکڑ لی؛ پھر اس کا چہرہ ایک طاقت ور سینے پر رگڑ کھانے لگا، اس کے ہونٹ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے، اور دو ہاتھوں نے اس کے پیروں کو قابو میں کر کے اسے ان تین مردانہ جسموں کے درمیان زمین سے اٹھا کر ہوا میں بلند کر دیا؛ اس کا بدن مضبوط ہاتھوں اور انگلیوں کے جال میں پھڑ پھڑانے لگا، کلائیوں کی قینچیاں اس کے اعضا کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگیں، بازوؤں اور سینوں کی دیواروں نے چاروں طرف سے اسے بھینچنا شروع کر دیا۔

تب، اس خاص لمحے پر آ کر، اس کے بدن میں چکر کاٹتی ہوئی وہ گرہ ڈھیلی ہو کر کھل گئی اور اس کے اندر سے زندہ رہنے کی بے تاب آرزو ایک روشن جھلسا دینے والے جنونی شعلے کی صورت میں بھڑک اٹھی۔ یہ وجود کو برقرار رکھنے، اپنے بدن پر اختیار قائم رکھنے کی آرزو تھی جو اس وقت سفاک، بے رحم ہاتھوں کے شکنجے میں تھا۔ اس کے بدن نے بے قرار لاوے کی شکل اختیار کر لی جو ان مردوں کے سینوں سے ٹکرا ٹکرا کر ان زندہ ہاتھوں اور بازوؤں سے رہا ہونے کی جدوجہد کرنے لگا، اس سے بے خبر کہ فرار کی یہ طاقت ور خواہش، آزاد ہونے کی یہ بے تابی، ان بازوؤں اور سینوں کی قید سے فرار ہو کر کھلے آسمان تلے پہنچنے کی یہ شدید آرزو کس مقام سے پھوٹی تھی۔

اس کی آواز، جو اپنی چیخ سے پوری دنیا کو بھر دینا چاہتی تھی، اس کے گلے میں محض ایک گھٹی ہوئی منمناہٹ کی شکل میں پیدا ہوئی۔ اس کے ہاتھ ذکری کے ہاتھوں کی گرفت میں ٹوٹے جا رہے تھے جو اس کی پشت کو اپنے پیٹ کے زور سے دبا کر قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ اب اس کے گلے پر فولادی انگلیوں کا بڑھتا ہوا بھیانک دباؤ پڑنے لگا اور اس کی آنکھوں کے بالکل پاس بکتور کے چہرے کے وحشی نقوش اینٹھ کر سیاہ پڑنے لگے۔ بکتور کے چہرے کی رگیں کھنچ کر ابھر آئی تھیں اور اس کے پورے جسم کے شدید زور نے اسے کسی غیر انسانی چہرے میں منقلب کر دیا تھا، اور اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گویا دنیا بھر کے، تمام زمانوں کے تمام انسانوں کو اپنے دباؤ سے بے جان کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ ہر لمحہ ہانیہ کی سانس کی نالی پر سخت ہو رہی تھیں، ان کی طاقت ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھی اور دباؤ میں ہر لمحے اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک ہانیہ کو اپنی ہوا میں بلند برہنہ ٹانگوں کے درمیان کسی کے قدم رکھنے کا احساس ہوا اور پھر کسی کے دو ہاتھوں نے اس

کے کندھوں کو سختی سے جکڑ لیا اور ان کی سختی اس پر کسی اجنبی اور مہلک نشے کی طرح چھانے لگی۔ اس کا بدن، جسے وہ اپنی پوری جان کے زور سے اس قید سے رہا کر کے باہر آسمان تلے لے جانا چاہتی تھی، ایک دوسرے جسم کے قابض دباؤ سے نڈھال ہو کر ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا، خود کو اس دوسرے جسم کے سپرد کرتا چلا جا رہا تھا جس کی نگاہیں اسے بے لباس کرتی رہی تھیں۔

اس کے باوجود وہ چلّا رہی تھی، اگرچہ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی: ایک بے آواز چیخ جس نے پوری دنیا کو اپنی سرکشی سے تہہ و بالا کر دیا اور اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں سے وہ پتھر کی ان دیواروں پر ضربیں لگاتی رہی جو اسے نکلنے کی راہ نہیں دے رہی تھیں اور باہر کی کھلی ہوا سے ہم آغوش ہونے کی خواہش کے راستے میں کھڑی تھیں۔ اس کے پیر کبھی ہار نہ ماننے والی ضد سے بار بار زمین پر ٹھوکریں مارتے رہے۔

مردوں نے اس کے جسد کو زمین پر گر جانے دیا اور خود کھلی ہوا میں سانس لینے اور بند اور بے نیاز آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر سگریٹ پینے کی غرض سے باہر نکل آئے۔

طیب صالح

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

قبرصی

جولائی میں نکوسیا یوں لگ رہا تھا جیسے خرطوم کو اکھاڑ کر دمشق میں بسا دیا گیا ہو۔ انگریزوں کی بچھائی ہوئی سڑکیں خوب چوڑی تھیں، صحرا خرطوم سا تھا، لیکن مشرقی اور مغربی ہواؤں میں وہی کشمکش تھی جو مجھے دمشق کی یاد دلاتی تھی۔

یہ مقام سر سے پیر تک برطانوی تھا، اُس خون کے باوجود جو یہاں بہہ چکا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ میں یونانی کردار والے کسی شہر کی توقع کر رہا تھا۔ مگر اس آدمی نے مجھے اتنی دیر تک اپنے خیالوں کا تعاقب کرنے کی مہلت نہ دی کہ کسی نتیجے تک پہنچ سکوں؛ وہ آیا اور سوئمنگ پول کے کنارے پر میرے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور اس کے لیے قہوے کی پیالی آ گئی۔

''ٹورسٹ؟'' وہ بولا۔

''ہاں۔''

اس نے عجیب سی آواز نکالی جس کی معنویت میں نہ سمجھ سکا۔ وہ گویا یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ جیسے لوگ نکوسیا میں سیاح کی حیثیت سے آنے کے مستحق نہیں، یا پھر یہ کہ نکوسیا اس کا مستحق نہیں کہ مجھ جیسے لوگ یہاں سیاحت کی غرض سے آئیں۔

میں نے اپنی توجہ اس پر سے ہٹالی اور ایک عورت کو دیکھنے لگا جس کا چہرہ رافیل کے فرشتوں سے مشابہ تھا اور بدن گوگیں کی تصویروں کی عورتوں جیسا۔ کیا یہ بیوی ہے یا دوسری عورت؟ ایک بار پھر اس نے میرے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا:

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''سوڈان کا۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''سرکاری ملازمت۔''

میں ہنسا کیونکہ درحقیقت میں حکومت کا ملازم نہیں تھا؛ بہرکیف، حکومتوں کے کندھے بہت چوڑے ہوتے ہیں۔

''میں کوئی کام نہیں کرتا،'' وہ بولا، ''میں ایک کارخانے کا مالک ہوں۔''

''اچھا؟''

''عورتوں کے لباس بنانے کا کارخانہ ہے۔''

''کیا بات ہے!''

''میں نے بہت پیسہ بنایا ہے۔ حبشیوں کی طرح کام کیا ہے۔ خوب دولت کمائی ہے۔ اب میں کام نہیں کرتا — سارا وقت بستر میں گذارتا ہوں۔''

''سوکر؟''

''مذاق کر رہے ہو؟ مرد بستر میں کیا کرتا ہے؟''

''تم تھکتے نہیں؟''

''مذاق کر رہے ہو۔ ذرا مجھے دیکھو — کیا عمر ہوگی میری؟''

کبھی پچاس کا لگتا تھا، کبھی ستر کا، مگر میں اس کی ہمت افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ستر،'' میں نے اس سے کہا۔

میرے مفروضے کے برخلاف اسے صدمہ نہیں پہنچا۔ اس نے ایک گونج دار قہقہہ لگایا اور بولا:

''درحقیقت پچھتر سال، مگر کوئی شخص مجھے پچاس سے زیادہ کا نہیں سمجھتا۔ سچ سچ کہو۔''

''ٹھیک ہے، پچاس۔''

''تمھارے خیال میں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''

''کسرت۔''

''ہاں، بستر میں۔ یہی کام ہے — کالی اور گوری، لال اور پیلی: سب رنگ۔ یوروپی، نیگرو، انڈین، عرب، یہودنیں؛ مسلمان، عیسائی، بدھسٹ: سارے مذہب۔''

'بہت لبرل معلوم ہوتے ہو۔''

''ہاں، بستر میں۔''

''اور بستر سے باہر؟''

''مجھے یہودیوں سے نفرت ہے۔''

''کیوں نفرت ہے؟''

''بس یوں ہی۔ وہ کھیلتے بھی مہارت سے ہیں۔''

''کیا؟''

''موت کا کھیل۔ صدیوں سے کھیل رہے ہیں۔''

''اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟''

''کیونکہ میں... کیونکہ میں... اس کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''کیا انھیں شکست نہیں ہوتی؟''

''آخر میں سب ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔''

''اور ان کی عورتیں؟''

''بستر میں ان سے بہتر کوئی نہیں۔ ان سے جتنی شدید نفرت ہو، ان کی عورتوں کے ساتھ اتنا ہی مزہ آتا ہے۔ وہ میرے منتخب لوگ ہیں۔''

''اور امریکی حبشنیں؟''

''ان سے میرا تعلق ابھی نفرت کی حد کو نہیں پہنچا۔ مجھے ان پر اَور توجہ دینی ہوگی۔''

''اور عرب؟''

''ان پر ہنسی آتی ہے یا رحم۔ آسانی سے ہار مان لیتے ہیں، کم از کم آج کل۔ ان کے ساتھ کھیلنے میں لطف نہیں۔ کھیل یک طرفہ رہتا ہے۔''

مجھے خیال آیا: کاش انھوں نے قبرص کو قبول کرلیا ہوتا، کاش بالفور میں ان سے اس کا وعدہ کرلیا گیا ہوتا۔

قبرصی نے پھر ایک گونج دار قہقہہ لگایا اور کہا:

''عورتیں مرد کی عمر بڑھاتی ہیں۔ آدمی کو اپنی عمر سے کم از کم بیس سال کم نظر آنا چاہیے۔ چابک دستی اسی کو کہتے ہیں۔''

''کیا تم موت کو فریب دیتے ہو؟''

''موت کیا ہے؟ اتفاق سے مل جانے والا ایک شخص جو تمھارے برابر میں آکر بیٹھ جائے، جیسے اس وقت میں بیٹھا ہوں؛ تم سے بے تکلف بات کرے، مثلاً عورتوں کے بارے میں یا اسٹاک ایکسچینج کے بارے

میں۔ پھر تمھیں احترام کے ساتھ دروازے تک لے جائے۔ دروزہ کھول کر تمھیں باہر جانے کا اشارہ کرے۔اس کے بعد کی تمھیں کیا خبر؟''

ایک مٹیالا بادل کچھ دیر اوپر رکا رہا، مگر اس لمحے مجھے خبر نہ تھی کہ خدائی تیر چھوڑا جا چکا ہے اور قبرصی میرے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔

ہنسی کی لہر نے پھیل کر مجھے گھیر لیا۔ وہ ایک حسین خاندان تھا جو آ کر بیٹھتے ہی مجھے پسند آ گیا: باپ جس کا چہرہ نیک طینتی کا اظہار کرتا تھا، ماں جس کی برطانوی آواز کسی قدیم بربط کے تاروں پر چھڑی ہوئی کوئی الز بتھن گت تھی، اور چار بیٹیاں، جن میں سب سے بڑی بارہ سال سے زیادہ کی نہ تھی، جو قہقہے لگاتی، ماں باپ کو چھیڑتی، سوئمنگ پول میں آ جا رہی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے اور اپنی مسرت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے کہ میں بھی اس کے محیط میں آ جاتا۔ ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھے باپ کے قیافے سے معلوم ہوا کہ وہ مجھے مدعو کرنے کو ہے؛ عین اسی لمحے قبرصی مجھ پر نازل ہو گیا۔ بڑی لڑکی اٹھی اور وقار سے قدم رکھتی ہوئی پول کی طرف جانے لگی۔ پھر وہ ایک دم رکی جیسے کسی پراسرار قوت نے اسے پکڑ لیا ہو، اس کے ساتھ ہی قبرصی بولا:

''اس کے لیے میں سو پاؤنڈ اسٹرلنگ دینے کو تیار ہوں۔''

''کس لیے؟'' میں نے چونک کر اس سے کہا۔

قبرصی نے اپنے بازو سے ایک فحش اشارہ کیا۔

اسی لمحے لڑکی منھ کے بل پتھر پر گری اور اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ نیک دل خاندان ڈرے ہوئے پرندوں کی طرح بھرّا مار کر اٹھا اور لڑکی کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ میں اس شخص کے پہلو سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا— مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی— اور اس سے بہت دور کی میز پر جا بیٹھا۔ مجھے اپنی بیٹیاں اور ان کی ماں یاد آئیں جو بیروت میں تھیں، اور میں طیش آ گیا۔ میں نے مسرور خاندان کو اداسی سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا، لڑکیاں ماں سے لپٹی ہوئی تھیں، ماں باپ کو ملامت کر رہی تھی، اور میرا غصہ اَور شدید ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ میں پرسکون ہو گیا اور میرے اردگرد کی سب چیزیں پرسکون ہو گئیں۔ شوروشغب تھم گیا اور میرا دوست طاہر وَدرداسی آ کر میرے پاس بیٹھ گیا: سعید کی دکان کے سامنے پڑی ہوئی بنچ پر۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا، تندرستی اور توانائی سے بھرپور۔

''واقعی، یہ کیا بات ہے،'' میں نے اس سے کہا، ''کہ تم نہ بوڑھے ہوئے ہو اور نہ کم زور، حالانکہ تمھاری عمر ان سب سے زیادہ ہے؟''

''جب سے مجھے دنیا کا شعور ہوا ہے،'' وہ بولا،''میں متواتر حرکت میں ہوں، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی کسی مقام پر ٹھہرا ہوں۔ میں گھوڑوں کی طرح کام کرتا ہوں، اور جب کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو خود کو مصروف رکھنے کے لیے کام ایجاد کر لیتا ہوں۔ میں کسی بھی وقت سویا ہوں، جلدی یا دیر سے، مگر موذن کی آواز آتے ہی فجر کی نماز کے لیے جاگ اٹھتا ہوں۔''

''مگر نماز تو تم نہیں پڑھتے؟''

''میں اذان ختم ہوتے ہی کلمہ پڑھ کر استغفار کر لیتا ہوں اور میرے دل کو سکون ہو جاتا ہے کہ دنیا ہمیشہ کی طرح چل رہی ہے۔ پھر میں کوئی آدھ گھنٹے کو سو جاتا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اذان کے بعد کی آدھ گھنٹے کی جھپکی میرے لیے رات بھر کی نیند کے برابر ہوتی ہے۔ پھر میں یوں جاگ اٹھتا ہوں جیسے الارم کی آواز سے آنکھ کھلی ہو۔ میں چائے بنا کر فاطمہ کو جگاتا ہوں۔ وہ فجر کی نماز پڑھتی ہے۔ پھر ہم چائے پیتے ہیں۔ میں نیل کی سطح پر سورج کی کرنوں سے ملاقات کو جاتا ہوں اور خدا کی صبح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں کتنی دیر بھی باہر رہوں، ناشتے کے وقت واپس آ جاتا ہوں۔ ہم ناشتے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں، میں اور فاطمہ اور خدا کے خادموں میں سے کوئی بھی جو قسمت کی مہربانی سے ہمارے ہاں مہمان ہو۔ پچاس سال سے یہی معمول ہے۔''

کسی روز میں طاہر ودرواسی سے، محجوب کی چار بہنوں میں سے ایک، فاطمہ بنت جبرالدار سے اس کی شادی کا قصہ دریافت کروں گا۔ وہ اپنی ذات کا بھی اتنا وفادار نہیں تھا جتنا محجوب کا۔ کیا وہ سورماؤں کی سی ناموری حاصل کر لے گا؟ یہ بات واضح تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ محجوب کے لیے خود کو بھی قربان کر دے گا۔ کیا میں اس سے ابھی پوچھ لوں؟ مگر، اس نے خود ہی ایک چھوٹا سا فقرہ کہہ دیا جو اس کی تمام زندگی کے تانے بانے کا خلاصہ تھا:

''فاطمہ بنت جبرالدار — واللہ کیا لڑکی ہے!''

''اور محجوب؟''

طاہر ودرواسی نے قہقہہ لگایا جس میں انھی گذرے ہوئے دنوں کی مہک تھی؛ اس سے اس کی محجوب سے محبت کا اشارہ ملتا تھا۔ اس کا نام سن کر ہی وہ مسرت سے مغلوب ہو جاتا، جیسے اس کے نزدیک دنیا میں محجوب کی محض موجودگی ہی اسے کم خشمگیں اور بہتر بنانے کے لیے کافی ہو۔ وہ ہنسا اور ہنستے ہنستے بولا:

''محجوب کی بات ہی اور ہے؛ محجوب کسی اور مٹی کا بنا ہوا ہے۔''

پھر وہ خاموش ہو گیا اور مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس وقت وہ اس موضوع پر کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔ کچھ

وقفے کے بعد میں نے اس سے پوچھا:

''عبدالحفیظ کا کہنا تھا کہ تم نے زندگی میں ایک بار بھی مسجد میں قدم نہیں رکھا۔ کیا یہ درست ہے؟''

''صرف ایک بار میں ایک مسجد میں داخل ہوا تھا۔''

''کیوں؟ کس لیے؟''

''صرف ایک بار۔ جاڑے کا موسم تھا، مہینہ خدا جانے طوبیٰ کا تھا یا عمشیر کا۔''

''عمشیر تھا،'' میں نے کہا، ''رات میں مریم کی تدفین کے بعد۔''

''ہاں۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں تمھارے ساتھ تھا۔''

''کہاں؟ میں نے اس صبح تمھیں نہیں دیکھا، حالانکہ اس روز پورا گاؤں مسجد میں جمع تھا۔''

''میں کھڑکی کے پاس تھا، آتا جاتا رہا، یہاں تک کہ تم نے کہا: ولاالضالین، آمین۔''

''اور پھر؟''

''الحمدللہ۔ بے چارہ حمید پکار کر بولا: وہ کہاں گیا جو یہاں کھڑا تھا؟''

''اور پھر؟''

اچانک خواب کا طائر اڑ گیا۔ وَد رواسی اسی طرح غائب ہوگیا جیسے وَد حامد کا گاؤں، اپنے تمام امکانات سمیت۔ جہاں میں پہلے بیٹھا تھا وہاں میں نے قبرصی کو دیکھا، اس کی آواز سن کر میرا دل تنگ ہونے لگا۔ میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی، اور شوروغل، اور سوئمنگ پول میں پانی کے پہلو کی دیواروں سے ٹکرانے کی آوازیں سنیں، اور مجھے ہیولے نظر آنے لگے جو برہنہ عورتوں اور مردوں اور چھلانگیں لگاتے اور چیختے چلاّتے بچوں کی شکل کے تھے۔ قبرصی کی آواز کہہ رہی تھی:

''اس کے لیے میں پچاس پاؤنڈ اسٹرلنگ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''

میں نے اور زیادہ بیدار ہونے کے لیے اپنی آنکھوں کو زور سے ملا۔ میں نے بازار میں فروخت کے لیے رکھی ہوئی چیزوں پر نظر ڈالی۔ یہ وہ عورت تھی۔ جس لمحے قبرصی نے یہ بات کہی، وہ نارنگی کا رس پی رہی تھی۔ اچانک اسے پھندا لگا اور اس کی سانس رک گئی؛ ایک آدمی اس کی مدد کو لپکا، پھر ایک عورت؛ ملازم اور ویٹر آ پہنچے، لوگ اکٹھے ہوگئے، اور تاریکی بھی فوراً ہی اتر آئی جیسے پاس ہی کھڑی کسی کے اشارے کی منتظر تھی۔ پانی کی سطح پر کھیلتی روشنیوں کے قریب بس میں اور قبرصی رہ گئے۔ روشنی اور تاریکی کے درمیان وہ مجھ سے بولا:

''دو امریکی لڑکیاں آج صبح نیویارک سے آئی ہیں۔ بہت حسین اور بے حد مالدار۔ ایک اٹھارہ سال کی ہے اور وہ میری ہے؛ دوسری پچیس کی ہے اور وہ تمھارے لیے ہے۔ دونوں بہنیں ہیں؛ کیریبنیا میں ایک وِلا کی مالک ہیں۔ میرے پاس کار ہے۔ اس ایڈونچر پر کچھ خرچ نہیں ہوگا۔ آؤ۔ تمھاری رنگت سے وہ فوراً متاثر ہوجائیں گی۔''

سوئمنگ پول میں روشنی اور تاریکی میں زور آزمائی ہو رہی تھی، اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قبرصی کی آواز تاریکی کی افواج کو اسلحہ فراہم کر رہی ہو۔ اس لیے میں اس سے کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے، چلتا ہوں، لیکن غیر ارادی طور پر میرے حلق سے اَور ہی آواز نکلی، اور میں پانی کی سطح پر ہوتی ہوئی جنگ پر نظریں جمائے جمائے بولا:

''نہیں، شکریہ۔ میں نکوسیا اس جستجو میں نہیں آیا۔ میں اپنے دوست طاہر ودرواسی سے ایک خاموش گفتگو کرنے آیا تھا کیونکہ اس نے مجھ سے ملنے کے لیے لندن آنے سے انکار کردیا تھا اور بیروت میں میں اس سے نہ مل سکا۔''

تب میں اس کی طرف مڑا — اور میری نظر کیسے دہشت ناک منظر پر پڑی۔ کیا میں تخیل سے چیزیں ایجاد کر رہا تھا، یا خواب دیکھ رہا تھا، یا پاگل ہو چکا تھا؟ میں بھاگا، کہ بھاگ کر ہوٹل کے بار میں ہجوم کے ساتھ پناہ لوں۔ میں نے پینے کے لیے کچھ طلب کیا؛ میں اسے پہچانے یا اس کا ذائقہ کا احساس کیے بغیر پینے لگا۔ مجھے کچھ سکون ہوا۔ مگر قبرصی آکر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ بیساکھیوں پر تھا۔ اس نے وسکی کا ایک ڈبل منگوایا۔ کہنے لگا کہ اس کی ایک ٹانگ جنگ میں ضائع ہوگئی تھی۔ کون سی جنگ؟ ایک جنگ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون سی؟ اس کی لکڑی کی ٹانگ آج صبح ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایک پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اسے لندن سے نئی ٹانگ کے آنے کا انتظار تھا۔ کبھی اس کی آواز برطانوی لگتی، کبھی اس کا لہجہ جرمن ہوتا؛ کبھی وہ مجھے فرانسیسی بولتا معلوم ہوتا؛ وہ امریکی الفاظ استعمال کر رہا تھا۔

''کیا آپ...''

''نہیں۔ بعض لوگ مجھے اطالوی سمجھتے ہیں، بعض روسی؛ کچھ لوگ جرمن... اسپانوی۔ ایک بار ایک امریکی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کہیں میں بسوتولینڈ کا رہنے والا تو نہیں۔ ذرا سوچو تو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کہاں کا ہوں؟ اور حضور والا؟''

''آپ مجھے حضور والا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''کیوں کہ آپ بے حد نفیس آدمی ہیں۔''

''ایسی کیا خاص بات ہے مجھ میں؟''
''آپ آج ہیں اور کل نہیں ہوں گے— اور پھر آپ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔''
''یہ تو ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے— اس میں کیا خاص بات ہے؟''
''ہر شخص اس کا شعور نہیں رکھتا۔ آپ، حضور والا، زمان و مکاں میں اپنی حیثیت سے آگاہ ہیں۔''
''میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔''

اس نے اپنا جام ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا، اپنی دونوں سالم ٹانگوں پر، یا پھر میرا تخیل چیزوں کو ایجاد کر رہا تھا، یا میں خواب دیکھ رہا تھا، یا پاگل ہو چکا تھا، اور یوں لگا جیسے وہ قبرصی ہو۔ وہ بے حد متواضع شائستگی سے جھکا، اور یوں لگا جیسے پول کے کنارے دیکھا ہوا اس کا چہرہ یہ احساس دلا رہا ہو کہ زندگی بے مایہ ہے۔
''میں خدا حافظ نہیں کہوں گا،'' وہ بولا، ''بلکہ الوداع، حضور والا۔''

دس بجے تھے جب میں بستر پر گیا۔ میں نے نیند لانے کی ہر ممکن تدبیر کی تھی، میں سارے دن تیرتا رہا تھا اور تھکا ہوا تھا۔ میں نے طاہر ودرواسی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی فاطمہ بنت جبرالدار سے شادی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اس یادگار دن فجر کی نماز میں اس کی حاضری کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے اُس نغمے کے بارے میں پوچھا جو دونوں کناروں کو رشؔ میں دھاکوں سے ملا رہا تھا، جبکہ بے چارہ مجیمید لہروں میں مریم کے ہیولے کے تعاقب میں ہاتھ پیر مار رہا تھا، مگر اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ موسیقی نے بھی میری کوئی مدد نہ کی، اور نہ مطالعے نے۔ میں باہر جا سکتا تھا، کسی نائٹ کلب میں یا یوں ہی چہل قدمی کے لیے۔ مگر میں کچھ نہ کر سکا۔ پھر درد شروع ہوا: پہلے پیروں کی انگلیوں کے سرے سن ہوے، پھر لہریں رفتہ رفتہ اوپر کی طرف بڑھیں یہاں تک کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے خوفناک پنجے میرے پیٹ، سینے، پیٹھ اور سر کو ادھیڑ ڈال رہے ہوں: جہنم کی تمام آگ گویا مجھ پر لوٹ پڑی۔
میں غشی کے عالم میں درد اور آگ کے بھنور میں جا گرتا؛ بے ہوشی اور نیم بیداری کے درمیان وہ خوفناک چہرہ میرے سامنے آ جاتا، کبھی ایک کرسی پر کبھی دوسری پر، پورے کمرے میں نمودار اور غائب ہوتا ہوا۔ میری سمجھ میں نہ آنے والی آوازیں کسی نامعلوم مقام سے آ رہی تھیں، اور ان جانے چہرے، تاریک اور چڑھی ہوئی تیوریوں والے۔ میں کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔ گو میں کسی نہ کسی طور پر ایک قسم کے شعور کی حالت میں تھا، لیکن ہاتھ بڑھا کر رسیور اٹھانا اور ڈاکٹر کو طلب کرنا، یا نیچے ہوٹل کے استقبالیے تک جانا، یا مدد کے لیے پکارنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ میرے اور نامعلوم تقدیروں کے درمیان ایک خاموش جنگ جاری

تھی ۔ مجھے ایک طرح کی فتح ضرور نصیب ہوئی، کیونکہ جب گھنٹے کی صبح چار بجے کی آواز پر مجھے ہوش آیا تو ہوٹل اور شہر پر سکوت طاری تھا۔ درد ختم ہو چکا تھا۔ صبح نو بجے مجھے بیروت لے جانے والا جہاز نکوسیا کے اوپر چکر کاٹ رہا تھا؛ اوپر سے وہ مجھے کوئی قدیم گورستان معلوم ہوا۔

اگلے روز شام کو بیروت میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ ایک عورت ایک بچے کو لیے کھڑی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور پہلا فقرہ جو اس نے کہا یہ تھا:

''میں فلسطینی ہوں— میری بیٹی مرگئی ہے۔''

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں: لیکن وہ گھر میں داخل ہوئی، بیٹھ گئی اور بولی:

''کیا مجھے تھوڑا سا آرام اور بچے کو خوراک مل سکتی ہے؟''

وہ مجھے اپنی کہانی سنا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے ٹیلیگرام کھولا؛ فلسطینی عورت مجھے اپنی بدنصیبیوں کی داستان سنا رہی تھی جبکہ میں خود اپنی بدنصیبی میں غرق ہو چکا تھا۔

میں نے سب سے بڑھ کر یہ معلوم کرنے کی بے تابی میں سمندر اور صحرا عبور کیے کہ اس کی موت کب اور کیوں کر واقع ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس روز صبح معمول کے مطابق اس نے اپنے باغ میں کام کیا تھا اور دن بھر اپنے سب معمولات جاری رکھے تھے۔ اس نے کسی چیز کی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ رشتے داروں کے گھر گیا تھا، راستے میں ادھر ادھر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا؛ واپسی میں وہ آدھی پکی ہوئی کھجوریں گھر لایا تھا اور سب کے ساتھ بیٹھ کر قہوہ پیا تھا۔ اس کی گفتگو میں کئی بار میرا نام آیا تھا۔ وہ میرے آنے کا بے تابی سے منتظر تھا کیونکہ میں نے خط میں اسے اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ رات کا کھانا اس نے ہلکا کھایا تھا، عشا کی نماز پڑھی تھی، اور دس بجے کے قریب موت کا فرشتہ اس کے پاس آیا؛ اور فجر کی نماز سے پہلے وہ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا، اور جب جہاز مجھے نکوسیا سے بیروت لے جا رہا تھا، وہ اس کی تدفین سے اسی وقت فارغ ہوے تھے۔

تیسرے پہر کو میں اس کی قبر کے پاس کھڑا تھا، اور قبرصی اپنے رسمی لباس میں قبر کے پہلو پر بیٹھا تھا اور میری فاتحہ اور دعاؤں کی آواز سن رہا تھا۔ ایک ایسی آواز میں جو مجھے زمین اور آسمان سے آتی محسوس ہوئی اور جس نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا، وہ مجھ سے بولا:

''تم مجھے اس روپ میں دوبارہ نہیں دیکھو گے، آخری لمحے کے سوا جب میں تمھارے لیے دروازہ کھولوں گا، احترام سے جھکوں گا اور تم سے کہوں گا: پہلے آپ، حضور والا! مگر میں تمھیں کسی نہ کسی روپ میں نظر آتا رہوں گا۔ تم سے میری ملاقات کسی حسین لڑکی کے روپ میں ہو سکتی ہے، جو آ کر تم سے کہے گی: میں

آپ کے خیالات اور رائے کی قدر کرتی ہوں، اور کسی اخبار یا رسالے کے لیے تمھارے انٹرویو کی خواستگار ہو گی۔ یا کسی صدر مملکت یا حکمراں کے روپ میں جو تمھیں کسی ایسے عہدے کی پیشکش کرے گا جس کا نام سن کر تمھاری سانس رکنے لگے۔ یا زندگی کی کسی ایسی دلکشی کی صورت میں جس سے تمھاری کسی کوشش کے بغیر تمھیں بہت سی دولت ہاتھ آجائے گی۔ یا شاید کسی بہت بڑے ہجوم کی شکل میں جو تمھیں کسی ایسی خصوصیت کی بنا پر سراہ رہا ہوگا جس سے تم خود واقف نہ ہوگے۔ یا پھر تم مجھے اپنے سے بیس سال چھوٹی لڑکی کے روپ میں دیکھو گے؛ تم اس کی خواہش کرو گے اور وہ تم سے کہے گی: چلو پہاڑوں پر کسی الگ تھلگ کٹیا میں چلیں۔ خبردار رہنا۔ اگلی بار تمھارا باپ تمھاری جگہ اپنی جان دینے کے لیے موجود نہیں ہوگا۔ سو خبردار رہنا۔ زندگی کی میعاد طے شدہ ہے، لیکن ہم کھیل میں دکھائی جانے والی مہارت کا لحاظ کرتے ہیں۔ خبردار رہنا کیونکہ اب تم پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ رہے ہو۔“

محمد خضیر

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

گھوڑوں جیسی گھڑیاں

ممکن ہے اس سے ملاقات ہو ہی جائے۔ میں اپنی گھڑی کی مرمت کراؤں گا اور بندرگاہ کی گودی کی طرف نکل جاؤں گا، پھر رات کے پچھلے پہر اپنے ہوٹل واپس پہنچوں گا اور اپنے بستر پر اسے، دیوار کی طرف منھ کیے، سوتا ہوا پاؤں گا، اس کا سرخ عمامہ کپڑوں کی کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہوگا۔

میرے پاس پرانی گھڑیوں کا ایک ذخیرہ آج تک موجود ہے؛ میں نے اسے اپنے ایک چچا سے پایا تھا جو کبھی اینڈریو ویر کمپنی کے جہازوں پر ملاح کی حیثیت سے ملازم تھا؛ زنجیروں اور چاندی کے رنگ کی ڈبیوں والی پرانی جیبی گھڑیاں، سب چمکدار نیلے کپڑوں کے بٹوؤں میں بند، ایک چھوٹے سے لکڑی کے ڈبے میں رکھی ہوئی ہیں۔ اب کچھ عرصے سے ان سے میری دلچسپی بہت کچھ کم ہوگئی ہے، مگر اسکول کے زمانے میں یہ مجھے بے حد مسحور رکھتی تھیں۔ میں انھیں ان کے نیلے بٹوؤں سے نکال نکال کر غور سے دیکھتا اور ان کے چلنے کے طریقے کا معائنہ کر کے ان میں وقت سے ماورا کسی بات کو دریافت کرنے کی دھن میں لگا رہتا تھا، وقت جس کے بارے میں میں نے ایک دن اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ وہ ''کسی چھوٹی سی تکیہ میں روئی کی طرح ٹھونس کر بھرا ہوا ہے۔''

اسکول کی بہار کی چھٹیوں میں ایک دن مجھے سوجھی کہ ان میں سے ایک گھڑی کو ڈبے میں سے نکال کر اپنے سیاہ لباس کی جیب میں رکھ لوں، اور اس کی زنجیر اپنی واسکٹ کے کاج میں اٹکا لوں۔ میں بہت دیر مرغی بازار میں گھومتا پھرا اور پھر ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھا۔ ویٹر آیا اور اس نے مجھ سے وقت پوچھا۔ میں نے اطمینان کے ساتھ نیلے بٹوے میں سے گھڑی نکالی۔ ڈبے کی دوسری گھڑیوں کی طرح، میری گھڑی وقت نہیں بتا سکتی تھی؛ اس کا کوئی بھی پرزہ کام نہیں کرتا تھا، سوائے ڈبیا میں لگے ہوئے اسپرنگ کے، جسے

دباتے ہی ڈھکنا کھٹ سے کھل جاتا اور اجلے سفید ڈائل اور اس پر بنے ہوئے رومن ہندسوں میں سے دو کی طرف اشارہ کرتی ہوئی سوئیوں کو سامنے کر دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ویٹر کو بتاؤں کہ گھڑی بند ہے، اس نے جھک کر چھوٹی سی زنجیر کو اپنی طرف کھینچ لیا؛ گھڑی کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے ڈھکنا بند کر دیا جس پر ایک بادبانی کشتی کے نقش کے گرد دائرے میں کسی غیر زبان کے حروف کھدے ہوئے تھے۔ پھر گھڑی مجھے لوٹاتے ہوئے، وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''یہ تمھارے ہاتھ کہاں سے لگی؟''

''ایک عزیز سے ترکے میں ملی تھی۔''

میں نے گھڑی کو دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ لیا۔

''کیا تمھارا عزیز کوئی جہازی تھا؟''

''ہاں۔''

''اب مشہور جہازیوں میں سے بس تین چار ہی زندہ ہیں۔''

''میرے عزیز کا نام مغامس تھا۔''

''مغامس؟ میں اس سے واقف نہیں۔''

''وہ ایک جگہ ٹکتا نہیں تھا۔ اس کی موت بحرین میں ہوئی۔''

''جہازی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تمھیں ایک اَور جہازی یاد ہے، جس کا نام مرزوق تھا؟ آخری بار ساحل پر آنے کے بعد سے وہ فاؤ میں رہ رہا ہے۔ اس نے وہاں گھڑیوں کی مرمت کی دکان کھول رکھی ہے؛ یہ کام اس نے پرتگالیوں سے سیکھا تھا۔ ایسی پرانی گھڑی کی مرمت صرف وہی کر سکتا ہے۔''

میں نے چائے کا گلاس ختم کیا اور پیسے ادا کرتے ہوئے ویٹر سے کہا، ''تم نے کیا بتایا، کہ وہ فاؤ میں رہتا ہے؟''

''ہاں، ہوٹل کے پاس۔''

فاؤ جانے والی سڑک کیچڑ سے بھری ہوئی ہے اور میں اپنے سفر کو ٹالتا رہا، مگر ایک دھوپ بھری صبح کو ایک بس میں، جو اسباب سے لدی ہوئی روانہ ہو رہی تھی، مسافروں کے درمیان جا بیٹھا۔ بس کے بیچ میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر، جاڑوں میں سفر اور اس بار کی کم سردی کے بارے میں عام سے تبصروں اور سڑک کے گڑھوں کے متعلق اکا دکا فقروں کے سوا، آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ جوں ہی وہ خاموش ہوئے میں نے اپنی گھڑی نکالی۔ ان کی نظریں اس پر جم گئیں، لیکن نہ کسی نے مجھ سے اس کے بارے میں کوئی سوال کیا اور نہ وقت دریافت کیا۔ پھر ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے لگے

اور اپنی توجہ کھلے وسیع دیہات اور دور دکھائی دیتی ہوئی کھجور کے درختوں کے قطار کی طرف کر لی جو ہماری گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور شط العرب کے کنارے کے گاؤں کو اپنے پیچھے چھپائے ہوئے تھی۔

ہم دو پہر کے وقت وہاں پہنچے اور کسی نے مجھے ہوٹل تک پہنچا دیا جو سیدھی سڑکوں کے سنگم پر واقع تھا، اور اس کے سامنے چوک تھا جس کے بیچ میں جنگلے سے گھرا ہوا ایک گول باغ تھا۔ ہوٹل دو نیچی منزلوں پر مشتمل تھا اور چوک کی طرف کھلنے والی بالکنی اتنی نیچی تھی کہ کوئی شخص گلی میں سے اس پر چڑھ سکتا تھا۔ مجھے ہوٹلوں کی بو اور اس سیلی ہوئی تاریکی سے وحشت ہوتی ہے جو ہوٹلوں میں داخل ہونے کے برآمدوں میں دن کے وقت بھی چھائی رہتی ہے، اس لیے میں نے جلدی سے اس کے مالکوں کو آواز دی۔ میرے دوبارہ پکارنے پر ایک لڑکے نے پہلو کے ایک دروازے میں سے نیچے جھانکا اور پوچھا، ''سونے کی جگہ چاہیے؟''

''ہے جگہ؟'' میں نے کہا۔

لڑکا کمرے میں چلا گیا اور اندر سے ایک آدمی نکلا جس سے میں نے بالکنی والے ایک کمرے کی درخواست کی۔ جو لڑکا مجھے ہوٹل کا راستہ بتانے آیا تھا، اس نے اطلاع دی کہ ہوٹل دن میں خالی اور رات کو بھرا ہوا رہتا ہے۔ جس طرح ہوٹل کا زینہ انتہائی تنگ اور بالکنی انتہائی نیچی تھی، اسی طرح میرا کمرہ انتہائی چھوٹا تھا اور اس میں ایک تنہا بستر تھا، مگر سورج کی روشنی بالکنی کے راستے وہاں داخل ہوتی تھی۔ میں نے اپنا بیگ بستر پر ڈال دیا اور لڑکا میرے برابر میں بیٹھ گیا۔ ''دروازوں میں تالے نہیں ہیں،'' لڑکا بولا۔ ''تالوں کی ضرورت بھی کیا ہے— مسافر ایک ہی رات تو ٹھہرتے ہیں۔''

پھر وہ جھک کر میرے کان میں بولا، ''کیا تم ہندوستانی ہو؟''

مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی، گہری رنگت، تیل میں چپڑے ہوئے گھنے بالوں اور چمکدار آنکھوں والے اس لڑکے کے ہندوستانی ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ میں نے اس سے سرگوشی میں کہا، ''کیا تمھیں کسی نے بتایا ہے کہ بصرہ کو ہندوستان کا پیڑو کہا جاتا تھا اور انگریزی فوج کے ہندوستانی حملہ آور، جو سب سے پہلے فاؤ کی زمین پر اترتے تھے، صرف بصرہ کی عورتوں کی خواہش کرتے تھے؟''

لڑکے نے شہوتوں کے ملاپ اور نسلوں کی آمیزش کے بارے میں میرے پوشیدہ اشارے کو نظر انداز کر دیا اور مجھ سے پوچھا کہ اگر میں ہندوستانی نہیں تو پھر کہاں کا رہنے والا ہوں۔

''میں اشعر سے آیا ہوں،'' میں نے اسے بتایا، ''مجھے گھڑی ساز سے ملنا ہے۔ کیا تم مجھے لے چلو گے؟''

''شاید تم اس بوڑھے کی بات کر رہے ہو جس کے گھر میں بہت سی گھڑیاں ہیں،'' لڑکا بولا۔

''ہاں، وہی ہوگا،'' میں نے کہا۔

''اس کا گھر ہوٹل کے پاس ہی ہے،'' اس نے کہا، ''وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی گھر سے نہیں نکلتا۔''

لڑکا ایک ریستوران سے کھانا لے آیا اور ہم دونوں بستر پر بیٹھ کر کھانے لگے اور وہ مجھے اس آدمی کے بارے میں بتانے لگا جسے میں نے نیچے دیکھا تھا۔ ''وہ ہوٹل کا مالک نہیں ہے، بس یہاں مستقل رہتا ہے۔''

پھر منھ میں نوالہ بھرے بھرے، سرگوشی میں بولا، ''اس کے پاس پستول ہے۔''

''تمھیں بہت کچھ معلوم ہے، ہندوستانی،'' میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔

اس نے احتجاج کیا کہ وہ ہندوستانی نہیں بلکہ حاسہ کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ بصرہ سے کھجوریں خلیج اور ہندوستان کے ساحلی شہروں تک لے جانے والے جہازوں پر ملازم تھا۔

لڑکے نے مجھے گھڑی ساز کے گھر کے دروازے پر چھوڑ دیا۔ چوکھٹ سے اوپر کی دیوار میں سے نکالی ہوئی پتھر کی ایک سِل کی خالی جگہ نے دروازے کو ناقابلِ فراموش بنا دیا تھا۔ جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں استوائی برسوں میں ایک دن بیماری سے لرزتا ہوا کوئی جہازی، یا خواہش سے مغلوب کوئی سکھ سپاہی، رکا تھا اور پتھر کی اس سل پر نظر ڈال کر جس پر کوئی تاریخ یا کوئی فقرہ کھدا ہوا تھا، پھر اپنے نامعلوم سفر پر چل دیا تھا۔ اور ان دونوں کے بعد شاید کوئی غیر ملکی ماہرِ آثار آیا تھا جس کی کشتی ساحل کی ریت میں پھنس گئی تھی اور وہ پانی کی سطح کے ابھرنے کے انتظار میں شہر میں ٹھہر گیا تھا؛ پھر مشرقی چیزوں کے بارے میں تجسس نے اسے اس سل پر کھدے ہوئے حروف کے دائروں کی طرف مائل کیا تھا اور وہ اسے اکھاڑ کر اپنے ساتھ کشتی میں لے گیا تھا۔ اب میں، اسی کی طرح، سمندر کے اس دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

لڑکے کی ہدایت پر عمل کرتے ہوے میں نے ہچکچائے بغیر دروازے کو دھکیل کر کھولا اور اس جگہ میں داخل ہو گیا جو ڈیوڑھی معلوم ہوتی تھی اور جہاں دھوپ چھت کے پاس بنے ہوے روزنوں کے راستے سے اندر آ رہی تھی، اور مجھے ڈیوڑھی کے دونوں طرف سے دکھائی نہ دینے والی گھڑیوں کی متواتر ٹک ٹک اور گھنٹوں کے شور سے وقت بتانے والے کلاکوں کی ہتھوڑیوں اور پنڈولموں سے نکلتی ہوئی مسلسل آوازوں نے گھیر لیا۔ جوں ہی میں آگے بڑھا، ایک یا زیادہ کلاکوں کے گھنٹے ایک ساتھ بج اٹھے۔ تمام کلاکوں کی جسامت، چوکھٹوں کی لکڑی کی کہنگی، اور ان کے گول ڈائلوں کی شکل، ان پر بنے ہوے رومن ہندسے اور نازک، تیر جیسے سوئیاں بالکل یکساں تھیں — فرق صرف یہ تھا کہ یہ سوئیاں مختلف وقتوں کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

ڈیوڑھی کے ہلکے سے خم سے گذرتا ہوا میں اچانک اس آخری عظیم جہازی کے سامنے جا پہنچا جو اپنے دالان میں ایک میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا جس پر گھڑیوں کے بے کار کل پرزے ڈھیر کی صورت میں پڑے

تھے۔ وہ چھت سے اپنے سفید بالوں والے سر کے بالکل پاس لٹکتے ہوئے ایک لیمپ کی روشنی میں کسی گھڑی کے حرکت کرنے والے پرزوں کو کھول رہا تھا۔ اس نے ایک آنکھ سے جس پر عدسہ جما ہوا تھا اور دوسری آنکھ سے جو عدسے کے بغیر تھی مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر گھڑی کی کلوں کو الگ الگ کرنے میں لگ گیا۔ وہ مختصر نگاہ دیواروں پر لگی ہوئی اور کونوں میں رنگ اور گرد دکھاتی ہوئی گھڑیوں کے پیچوں، دندانوں اور سوئیوں سے اس آہنی چہرے کا ربط واضح کرنے کے لیے کافی تھی۔ بعض گھڑیاں رکی ہوئی تھیں اور بعض چل رہی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی وہ تھی جو گھڑی ساز کے سر کے پاس کی دیوار پر آویزاں تھی؛ یہ دراصل پیتل کے بنے ہوئے ایک بہت بڑے گرینڈ فادر کلاک کی اندرونی مشین تھی جس کا ڈائل نکال دیا گیا تھا اور چوکھٹا الگ کر دیا گیا تھا تاکہ وقت اس کے دندانے دار پہیوں پر سے ہموار میکانکی تسلسل کے ساتھ پھسلتے ہوئے، خود کو اپنی خیرہ کر دینے والی عریانی میں ظاہر کر سکے: گھومتے ہوئے اسپرنگ سے لے کر پنڈولم تک، جو یکسانی سے حرکت کر رہا تھا اور سوئیوں میں بے حد ست اور غیر محسوس سی لرزش پیدا کر رہا تھا۔ جب گھڑی کے دندانے دار پہیے سوئیوں کو وقت کے ایک معینہ فاصلے تک لے جاتے تو گھنٹے والا دندانے دار پہیا گھوم کر ہتھوڑی کو اوپر اٹھا دیتا۔ میں نے اس سے پہلے کسی گھڑی کو عریاں، دھڑکتی ہوئی حالت میں نہیں دیکھا تھا اس لیے اس ہموار دھڑکن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا جو جھولتے ہوئے پنڈولم اور مختلف گولائیوں کے دندانے دار پہیوں کی حرکت سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔ میں گھنٹے پر ہتھوڑی کی چوٹ پڑنے سے چونک اٹھا، دالان تین گھنٹوں کی آوازوں سے گونجنے لگا اور ان آوازوں کی تھرتھراہٹ بہت دیر باقی رہی، جبکہ دوسری گھڑیاں اپنے شیشے دار چوکھٹوں کے پیچھے یکساں آواز میں ٹک ٹک کرتی رہیں۔

گھڑی ساز نے اپنا سر اٹھایا اور مجھ سے پوچھا کہ آیا اس کے سر کے پاس والے کلاک نے تین بجائے ہیں۔

پھر گھڑی کے کل پرزوں کو کھولنے میں دوبارہ منہمک ہوتے ہوئے بولا، ''گھوڑوں کی طرح؛ سمندر کی سطح پر دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی طرح۔''

ڈیوڑھی میں لگے ہوئے کسی کلاک نے چھ بجائے تو اس نے کہا، ''چھ؟ امریکا میں چھ بجے ہیں۔ وہاں لوگ سو کر اٹھ رہے ہیں، جبکہ برما میں سورج ڈوبنے کا وقت ہے۔''

کمرہ ایک بار پھر پُرشور گونج سے بھر گیا۔ ''سات؟ انڈونیشیا میں رات ہو گئی۔ تم نے اس سے پہلے بارہ بجے کی آواز سنی تھی؟ دنیا کے انتہائی مغرب میں لوگ گہری نیند سو رہے ہیں۔ چند گھنٹے بعد انتہائی مشرق میں سورج طلوع ہو گا۔ کیا وقت ہوا ہے؟ تین؟ یہ ہمارا وقت ہے، یہاں، خلیج کے پاس کا۔''

ایک کلاک آپ ہی آپ بجنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس کی گونج کئی گھنٹوں پر ایک ساتھ پڑتی ہوئی

ہتھوڑیوں کی آواز میں مل گئی اور کچھ اور کلاکوں کی آواز ان آوازوں کے درمیانی وقفے کو قطع کرتی ہوئی بلند ہونے لگی، اور یوں اس ملے جلے شور میں گھنٹوں کی آوازیں دیر دیر میں اٹھنے لگیں، یہاں تک کہ صرف ایک کلاک باقی رہ گیا، آخری کلاک جس نے ابھی اپنا وقت بتانا ختم نہیں کیا تھا اب اسے ایک تنہا، اونچی گونج کے ساتھ باہر انڈیلنے لگا۔

وہ میری گھڑی کو ہاتھ میں لیے ہوے تھا۔ ''کئی کلاک ایک ساتھ بجنے لگتے ہیں،'' وہ بولا، ''جیسے بھی ان کے جی میں آتی ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کو صرف ان میں چابی دینے کا کام سونپ رکھا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گھوڑوں کی طرح دوڑ کرتے ہیں۔ میرے پاس ان لوگوں سے خریدی ہوئی گھڑیاں ہیں جنھوں نے انھیں بصرہ پر قبضہ ہونے کے بعد شہر سے بھاگتے ہوے ترک ملازموں کے گھروں سے لُوٹا تھا۔ ایسی گھڑیاں بھی میرے ہاتھ آئیں جو بعد میں ہجرت کرنے والے یہودی چھوڑ گئے تھے۔ میرے دوست، جہازوں کے کپتان، جو یہاں مجھ سے ملنے آتے، یوروپ کی بنی ہوئی گھڑیاں میرے ہاتھ بیچتے تھے۔ وہاں راہداری میں لگے ہوے اس کلاک کو دیکھ رہے ہو؟ وہ فاؤ کے قلعے کی گیریزن کے ترک کمانڈر کے گھر میں لگا ہوا تھا۔''

میں نے ڈیوڑھی میں رکھی ہوئی گھڑیوں کی الماریوں کی تاریکی میں شیشے کے پیچھے تیزی سے ہلتے ہوے پنڈولم کی دھندلی چمک دیکھی۔ پھر اس سے اپنی گھڑی کے بارے میں پوچھا۔ ''تمھاری گھڑی؟ بہت نادر ہے۔ اب ایسی گھڑیاں نہیں بنتیں۔ میں نے بہت عرصے سے ایسی گھڑی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا، مگر اسے کھول کر دیکھوں گا۔ تم شہر کا ایک چکر لگاؤ اور رات کو پھر آنا۔''

میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ میں رات سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ کلاکوں کے ایک ایک کرکے بجتے ہوے گھنٹوں نے مجھے الوداع کہا۔ فاؤ میں چار گھنٹے— کلکتے کی پرہجوم گلیوں میں شام کے سات بجے ہیں۔ چار گھنٹے— بیونس آئرس کے جنگلوں میں صبح آٹھ بجے کا وقت... کارگاہ کے باہر شور تھم گیا تھا، مشین کے تیل اور پرانی لکڑی کی بو بھی اب نہیں تھی۔

میں مغرب کے وقت واپس پہنچا۔ میں نے پرانی بیرکوں میں گھوم کر وقت گذارا تھا جو برطانوی قابض فوجوں کا مسکن رہی تھیں: پھر میں مچھلی بازار کے پاس کے ایک قہوہ خانے میں بیٹھا رہا تھا۔

میں نے گھڑی ساز کو اس کی پہلی جگہ پر نہ پایا۔ پھر مجھے ایک بڑی سی خالی الماری کا احساس ہوا جسے دھکیل کر کلاکوں کے درمیان کی خالی جگہ میں رکھ دیا گیا تھا۔ گھڑی ساز ایک صحن میں مٹی کے کوزوں سے بنی ہوئی ایک کل کے سامنے کھڑا تھا، جو میرے اندازے کے مطابق کسی قسم کی پانی کی گھڑی تھی۔ جب اس

نے مجھے دیکھا تو آواز دی، ''ادھر آؤ۔ آجاؤ، میں تمھیں ایک چیز دکھاؤں۔''

میں لمبے سے شہتیر سے لٹکتے ہوئے کوزوں کی طرف بڑھا: پانی ان میں سے ایک نچلے شہتیر میں لگے ہوئے کوزوں میں قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور وہاں سے دھات کے ایک ڈھلواں تختے پر بہتا ہوا زمین کی طرف آرہا تھا جس پر پانی کی سطح کی بلندی ناپنے کے نشان لگے ہوئے تھے۔

''تم نے ایسی گھڑی پہلے کبھی دیکھی ہے؟''

''میں نے ان کا ذکر پڑھا ہے۔ یہ قدیم لوگوں کی ایجاد تھی۔''

''فارس کے لوگ انھیں بنجان کہتے تھے۔''

''میں نہیں سمجھتا یہ درست وقت بتاتی ہوگی۔''

''بالکل نہیں۔ اس کے حساب سے دن بیس گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے میری عمر نوے نہیں بلکہ ایک سو آٹھ سال ہے، اور انگریزوں کو بصرہ میں داخل ہوئے ساٹھ کے بجائے اُٹھتر سال ہو چکے ہیں۔ میں نے اسے مسقط کے ایک ملّاح سے بنانا سیکھا تھا، جس کے ساحل کے پاس کے گھر میں ایسی ہی ایک گھڑی تھی۔''

چھوٹے سے صحن پر اندھیرا اترنے لگا تھا، میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا، صحن کے دو بند دروازوں کے پاس سے مڑ کر اندر آیا۔ وہ خالی الماری کو گھسیٹ کر اپنی پچھلی جگہ پر لے گیا اور کرسی پر آ بیٹھا۔ بہت سے لباس پہنے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ کم بوڑھا معلوم ہو رہا تھا؛ اس کا بدن ایک کے اوپر ایک پہنے ہوئے کپڑوں میں گم ہو گیا تھا اور سر پر بہت بڑا طربوش بندھا ہوا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ تمھاری ساری زندگی سمندر میں گذری ہے۔''

''ہاں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ہماری زندگیاں ہمیشہ پانی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ میں برطانوی ہند کے ایک جہاز پر گھوڑوں کی تجارت کرنے والے ایک انگریز کے پاس سائیس کے طور پر ملازم تھا۔''

وہ اپنے سامنے پڑے ہوئے گھڑیوں کے پرزوں سے کھیلنے لگا، پھر بولا، ''اس نے اپنا ایک عربی نام رکھ لیا تھا۔ ہم اسے سرور صاحب کہتے تھے۔ وہ جنوب کے دیہات سے نجدی گھوڑے خریدتا تھا جنھیں بعد میں سمندر کے راستے بمبئی لے جایا جاتا اور وہاں انھیں جمع کر کے انگلستان کے گھڑ دوڑ کے میدانوں میں بھیجا جاتا۔ اس سفر میں ہمارے پندرہ دن سمندر میں گذرتے؛ ہم صرف خلیج کی بندرگاہوں میں رکتے ہوئے جاتے تھے۔ مسقط میں ہم چند دن ٹھہرتے تھے۔ جب کبھی مخالف ہوائیں تیز ہوتیں، ہمیں مہینہ بھر سمندر میں رہنا پڑتا۔ کپتان، باورچی اور جہاز چلانے والے ہندوستانی تھے، جبکہ دوسرے لوگ، جہازی اور سائیس،

مسقط، حاسہ اور بحرین کے رہنے والے تھے: باقی لوگ بحرِ ہند کے جزیروں کے تھے۔ ہمارے غوطہ خور کویتی ہوا کرتے تھے۔ مجھے ساحل پر گھوڑوں کو نہلاتے یا انھیں جہاز پر لے جاتے ہوئے ان غوطہ خوروں کے چھوٹے قد، سیاہ جسم اور گندھے ہوئے بال اب تک یاد ہیں۔ میں سائیسوں میں سب سے کم عمر تھا۔ میں اپنے باپ کے ساتھ جہاز پر ملازم ہوا تھا جو کپتان کا نائب تھا اور ذخیرے اور مشینوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ میرے باپ کو ملا کر ہم تین تھے جو اسٹور روم میں بوریوں اور کولتار، مچھلی کے تیل، رسیوں اور خشک مچھلی کے پیپوں کے درمیان ناریل کی چھال کے بنے ہوئے بستروں پر سوتے تھے۔''

''کیا تم نے بہت کمایا؟''

''ہم نے؟ نہیں، ہم نے کچھ خاص نہیں کمایا۔ تاجر نے بہت کمایا۔ ایک گھوڑے کی قیمت بمبئی میں آٹھ سو روپے ملتی تھی، اور ہمارے بنگال پہنچنے تک پندرہ سو روپے ہو جاتی تھی۔ گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے کی اجرت ہمیں واپس بصرہ پہنچنے پر ملتی تھی۔ ہم میں سے بعض لوگ واپسی کے سفر میں بیچنے کے لیے ہندوستان سے چیزیں خرید لیتے تھے: کپڑا، مسالے، چاول، شکر، عطر، اور لکڑی، اور کبھی کبھی مور اور بندر بھی۔''

''کیا تم لوگ گھوڑوں کو جنگ میں بھی استعمال کرتے تھے؟''

''میں نے خود جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ ویسے بے شک گھوڑوں کو جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جب ترکوں نے ہماری گھوڑوں کی تجارت پر پابندی لگا دی کیونکہ انھیں جنگی استعمال کے لیے ان کی ضرورت تھی، تو ہم دریا کی دوسری طرف چلے گئے۔ خرم شہر میں ایک اصطبل اور ایک کارواں سرائے ہماری ملکیت تھی۔ ہم وہاں سے گھوڑوں کو اسمگل کر کے ترک کسٹم والوں کی گرفت سے دور لے جانے لگے۔ جس رات ہمیں سفر کرنا ہوتا، ہم گھوڑوں کو خوب کھلاتے پلاتے اور منھ اندھیرے اصطبل میں جا کر ہر سائیس اپنے اپنے گھوڑے کو باہر نکالتا۔ مجھے چارہ اور ساز و سامان لے جانے کا کام سونپا گیا تھا، اور جو لڑکے مجھ سے عمر میں ذرا بڑے تھے انھیں پانی، رسیوں، زنجیروں اور دوسرے اوزاروں کو لے جانے کا۔ اصطبل ساحل کے بہت قریب تھا، مگر جب گھوڑوں کو لگام سے گھسیٹ کر جہاز کی طرف لے جایا جاتا، جو ساحل سے بندھے ہوئے لنگر کے دوسرے سرے پر کھڑا ہوتا تھا، تو وہ بہت شور مچاتے اور دھول اڑاتے تھے۔ جہاز ڈولنے لگتا اور جس وقت سائیس گھوڑوں کو ان کے نام سے پکار کر خاموش کراتے ہوئے انھیں رسیوں سے ان کی جگہ پر باندھ رہے ہوتے، پیال کے چھوٹے چھوٹے تنکے اڑ کر ہمارے سروں پر چپک جاتے۔ کام آسان نہیں تھا؛ سفر کے دوران لہروں یا نظر نہ آنے والے سمندر سے کسی گھوڑے کو جوش آ جاتا یا وہ بیمار پڑ جاتا اور اس کے سائیس کو نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے رات بھر اس کے پاس رہنا پڑتا۔ اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے ہمیں کسی سائیس کے اپنے گھوڑے کو اس طرح کے فقروں سے تسلی دینے کی آواز آتی: ''چپ ہو جاؤ، چپ ہو جاؤ،

جانِ عزیز۔ وہاں کھانے کو اچھی گھاس ملے گی۔'' مگر یہ گھوڑا، جس کا نام جانِ عزیز تھا، عدن کے آس پاس چل بسا۔ فجر کے وقت جہازیوں نے اسے اٹھا کر لہروں کے سپرد کر دیا۔ وہ بڑی کہر آلود صبح تھی اور میں نے ایک لالٹین اٹھا رکھی تھی؛ مجھے اس کے بڑے سے جسم کے لہروں سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی، لیکن وہ مجھے نظر نہ آیا؛ البتہ میں نے اس کے سائیس کا چہرہ اپنے قریب دیکھا— وہ اپنے سفر سے خالی ہاتھ لوٹے گا۔''

دو یا تین کلاک ایک ساتھ بج اٹھے۔ میں نے اس سے کہا:

''کیا تم مسقط میں ٹھہرا کرتے تھے؟''

''ہاں۔ کیا میں نے تمھیں اپنے مسقطی میزبان کے بارے میں بتایا ہے؟ اس کا لکڑی کا مکان ایک کھاڑی کے کنارے تھا جس کے دوسرے کنارے پر پتھر کا بنا ہوا پرانا قلعہ تھا۔ ہم کشتی میں بیٹھ کر اس کے مکان پر جاتے۔ وہ پیدائش کے اعتبار سے کوہستانی تھا اور کھاڑی کے مقابل کے پہاڑوں کے ایک قبیلے کا فرد تھا۔ وہ سپیرا بھی تھا۔ سرور صاحب کا وہ بہت قریبی دوست تھا اور اسے پہاڑی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا ہوا ایک مرہم مہیا کرتا تھا جسے لگاتے ہی انگریز کے چہرے کا رنگ گہرا سبز ہو جاتا اور وہ لیمپ کی روشنی میں چٹانوں کے درمیان ہچکولے کھاتی ہوئی لہر کی طرح جھلملانے لگتا۔ اس کے بدلے میں مسقطی کو تمباکو ملتا تھا۔ تمباکو نوشی میں میں ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا، مجھے ایک طرح کا بخور چبانے کی عادت تھی جو ساحلی بازاروں میں عام ملتا تھا۔ میں کمرے میں اونچائی پر بنے ہوئے ایک بستر پر چڑھ کر بیٹھ جاتا اور ان کو اپنی اپنی خنجروں کی پیٹی اتار کر اپنے سامنے اپنی پگڑیوں کے پاس رکھ کر، آگ کے پاس آرام سے لیٹے ہوئے، نارجیلوں سے تمباکو کے کش لے کر ہوا میں دھواں اڑاتے دیکھا کرتا۔ ان کی داڑھیوں میں دھواں بھر جاتا اور جب وہ خیالوں میں گم، سر گھما کر تاجر کی طرف دیکھتے تو ان کے کانوں کے پاس، کنگھی کیے ہوئے بالوں کی لٹوں میں، دھویں کے چھلے اٹک جاتے۔ پروں کی تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے تاجر نے ہندوستانی کپڑے کی شوخ رنگوں والی شلوار پہن رکھی ہوتی تھی اور بدن کشمیری اون کی عبا میں لپٹا ہوا ہوتا تھا؛ جہاں تک اس کے ریشمی صافے کا تعلق ہے، وہ جہازیوں کی پگڑیوں کی طرح، اس کے سامنے، پستول کے پاس دھرا ہوتا تھا۔''

''تم نے کہا کہ مسقطی سپیرا بھی تھا؟''

''اس کے پاس سانپوں کی ایک بڑی سی ٹوکری تھی جس میں وہ جہازیوں میں سے کسی کو لٹا دیتا اور پھر زندہ باہر نکال لیتا تھا۔ اس کا منحنی سا بدن اس کی چمکیلی عباؤں میں گم معلوم ہوتا تھا جس طرح اس کا چھوٹا سا سر پھندنوں والی زعفرانی پگڑی میں غائب ہو جاتا تھا۔ ہمیں اس کی حریصانہ بھوک کو دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی تھی، وہ رات بھر میں ٹوکری بھر کھجوریں کھا جاتا اور اتنا پانی پی لیتا کہ دس گھوڑوں کے لیے کافی ہو۔ وہ

بہت حیران کن آدمی تھا: عجیب حرکتیں کیا کرتا تھا؛ تمبا کو کا ایک کش لے کر وہ تھوڑی دیر بعد اپنے منھ اور ناک سے دھواں نکالنے لگتا اور متواتر پانچ منٹ تک نکالتا رہتا۔ تم نے اس کا پتھریلا چہرہ نہیں دیکھا جس کے اردگرد دھویں کے بادل سانپوں کی طرح لہراتے اور ناچتے تھے۔ اس کی سات بیویاں تھیں جن کے لیے اس نے پہاڑ کے قدموں میں زمین کھود کر سات کمرے بنائے تھے جن کا رخ کھاڑی کی طرف تھا۔ اسے ان عورتوں کے نام لینے میں کوئی حیا نہیں آتی تھی: کوہستانی پھول، دوپہر کی دھوپ، سمندر کا موتی، ستارۂ صبح۔ وہ مزے دار قصوں اور عجیب سفری داستانوں کی کان تھا اور اس کی باتوں سے ہم اپنے گھوڑوں کے نام اخذ کیا کرتے تھے۔ رات کے ختم ہوتے وہ ہمیں سوتا چھوڑ کر پہاڑ پر چلا جاتا۔ ایک بار سفر کے خاتمے پر ہم سات راتوں تک مسقطی کے مہمان رہے، اور اس دوران اس کے قبیلے کے لوگ تمبا کو پینے کے لیے ہمارے پاس آتے رہے؛ وہ بہت کم بولتے، تاجر کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھتے، اور اپنی قدیم رائفلیں اٹھائے خاموشی سے رخصت ہوتے۔

''رات کے وقت ہمارا کھانا مسالے دار چاولوں اور بھنے ہوئے گوشت یا مچھلی پر مشتمل ہوتا۔ پینے کے لیے ہمیں پیتل کے کٹوروں میں میٹھا شربت دیا جاتا۔ رہا مسقط کا باداموں والا حلوہ، جو منھ میں رکھتے ہی گھل جایا کرتا تھا، تو تلخ قہوہ بھی اس کی خوشبودار مٹھاس ختم نہیں کرسکتا تھا۔ صبح لوٹ کر وہ جہازیوں کے سروں پر سے دھویں کے بادل ہٹاتا اور ہمیں ایک شربت دیتا جسے پی کر ہمارے رات کے کھانوں کی مار کھائے ہوئے معدوں کا فعل درست ہو جاتا۔

یکا یک کلاکوں کی آوازوں کے شور نے اسے مزید تفصیل میں جانے سے عارضی طور پر روک دیا۔ مگر اپنی بات دوبارہ شروع کرنے کے لیے اس نے گھنٹوں کے شور کے تھمنے کا انتظار نہیں کیا:

''آخری رات کو اس کے کرتبوں نے خاصی خوفناک صورت اختیار کرلی۔ سائیس اس سے اپنے گھوڑوں کی بیماریوں کے جادوئی علاج طلب کیا کرتے تھے، اس کے باوجود انھیں خوف تھا کہ اس کے جادو کا برا اثر پھیل جائے گا اور ان کے گھوڑوں کی جان لے لے گا۔ اور ہوا بھی یہی کہ ہوا کے شدید جھکڑوں کی زد میں آکر ہمارا جہاز کھاڑی میں داخل ہونے کی جگہ کے پاس ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ ڈوبنے سے بچ گئے لیکن مسقط کا سپیرا ان میں نہیں تھا۔ وہ بمبئی کی ایک عورت سے شادی کرنے کے ارادے سے جہاز کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا، مگر اونچی لہروں نے اس کی چیخوں کو دبا لیا اور جادو کو مٹا ڈالا۔''

''اور گھوڑے؟''

''انھوں نے لہروں کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ وہ ساحل کی چٹانوں کی طرف تیرنے لگے — گھوڑے

لہروں کے سفید گھوڑوں سے زور آزمائی کررہے تھے۔ سب کے سب ڈوب گئے۔ وہ گھوڑوں والے جہاز میں میرا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد، جنگ سے پہلے کے چند سال، میں ڈاک کے جہازوں پر کام کرتا رہا۔"

اس نے ذہن پر بڑا زور دے کر یاد کیا اور کہا:

"بحرین میں میں نے ایک عورت سے شادی کی جس سے میری تین بیٹیاں ہوئیں جنھیں میں نے سمندر کے بیٹوں سے بیاہ دیا۔ میں جنگ کے بعد تک وہاں کشتیاں بنانے والوں کے ساتھ رہتا رہا۔ پھر سن تیس کی دہائی میں بصرہ لوٹ آیا اور وہاں سے گھڑیاں خرید کر فاؤ میں آ بسا اور یہاں کی ایک عورت سے شادی کر لی۔"

"تم جیسے جہازی اب اکا دکا ہی رہ گئے ہیں۔"

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں اور میں نے بتایا کہ میں ہوٹل میں رکا ہوں۔ وہ بولا:

"میرا ایک دوست بھی وہاں رہتا تھا۔ پتا نہیں اب زندہ ہے یا نہیں۔ میں بیس سال سے باہر نہیں نکلا۔"

پھر گھڑیوں کے ٹوٹے ہوئے پرزوں کے ڈھیر میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے اس نے کہا:

"کیا تم صرف اپنی گھڑی کی مرمت کرانے فاؤ آئے ہو؟"

میں نے اسے جواب دیا کہ بعض شہر ایسے ہوتے ہیں جہاں آدمی کو جانا ہی ہوتا ہے۔ اس نے میری گھڑی مجھے دے دی۔ وہ چل رہی تھی۔ اسے میرے ہاتھ پر رکھنے سے پہلے اس نے ڈھکنے کا معائنہ کیا جس پر ایک جہاز کا نقش اس کے تکونے بادبان سمیت کھدا ہوا تھا؛ اس قسم کے جہاز کو سنبک کہا جاتا ہے، اس نے بتایا۔

میں نے ڈھکنا کھولا۔ سوئیاں اپنی سست رفتار سے گھوم رہی تھیں۔ میری ہتھیلیاں گھڑی کے گرد بند ہوگئیں اور ہم وہاں لگے ہوئے کلاکوں میں سمندر کو گونجتا ہوا سننے لگے۔ گھڑیوں کے چہروں کی گلیوں میں گھوڑوں کی چھریری ٹانگیں دوڑتی ہیں، بڑے گرینڈ فادر کلاک کے شیشے میں انھیں اغوا کرلیا جاتا ہے۔ گھڑیاں ٹک ٹک کررہی ہیں اور گھنٹے بجارہی ہیں: گونجتی ہوئی ٹاپیں، لہروں کی طرح بڑھ کر آتی ہوئی گھنٹوں کی آواز۔ ایک گھنٹا: گیلی لکڑی کے ساتھ رسیوں اور زنجیروں کی رگڑ۔ دو گھنٹے: لنگر کا نیلے گہرے سمندر میں گرنا۔ تین: چٹانوں سے لہروں کا ٹکراؤ۔ چار: اُمڈتا ہوا طوفان۔ پانچ: گھوڑوں کی ہنہناہٹ۔ چھ... سات... آٹھ... نو... دس... گیارہ... بارہ...

پیچ دار گلی کی چوڑائی اتنی نہیں ہے کہ کوئی لاری گذر سکے، لیکن ایک بھاری نم رات اور اپنے گھوڑوں کو

باگیں تھام کر لاتے ہوئے جہازی اور ایک سمندر زدہ شخص جس نے اپنی مٹھی میں ایک جیبی گھڑی اب بھی مضبوطی سے دبا رکھی ہے، اور پانی سے اور گلی کی ڈھلان سے اور خم کھاتی ہوئی دیواروں سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے— یہ سب اس گلی میں داخل ہوجاتے ہیں۔ روشنی سامنے والے موڑ سے آرہی ہے جس کی طرف میرے قدم تیز ہوجاتے ہیں۔ اپنے رس رس کر آنے کے انداز اور اپنی شعاعوں کی قوت کے باعث یہ روشنی یوں لگتی ہے جیسے دیوار سے لگ کر چل رہی ہو اور ان چہروں اور جسموں کی نم اینٹوں جیسی جلد میں نقش کاڑھتی جارہی ہو جو مختلف نسلوں کے ان جہازیوں اور تاجروں کی نقابیں ہیں جو مجھ سے پہلے یہاں سے گذرے تھے اور جو صرف اپنے سروں کی پوشش سے پہچانے جاسکتے ہیں: نجد اور جنوبی دیہات کے بدو اپنے کفیے اور عقال سے، عراق کے شہری آفندی اپنے سداروں سے، فارس سے آنے والے بکری کی کھال کے بنے ہوئے طربوشوں سے، عثمانی افسر، فوجی اور اہلکار اپنی پھندنے دار ٹوپیوں سے، ہندوستانی اپنی سرخ پگڑیوں سے، یہودی اپنی سپاٹ سرخ ٹوپیوں، راہب اور مشنری اپنے سیاہ سرپوشوں سے، یوروپی جہازوں کے کپتان اپنی بحری ٹوپیوں سے، بھیس بدلے ہوئے محقق... وہ سب گلی کے آخری موڑ سے آتی ہوئی سرسراتی آواز، پراسرار گڑگڑاہٹ، اونچے جنگلے کے پیچھے سے سنائی دیتی ہوئی لہروں کی دبی دبی بےچینی کی طرف تیزی سے بڑھ گئے... سامنے فاؤ کی بندرگاہ کی گودیاں ہیں؛ پانی میں کچھ فاصلے تک بڑھتے ہوئے لکڑی کے پلوں کو راہ دکھاتی ہوئی روشنیاں؛ ان کے درمیان کی خالی جگہوں میں کشتیاں پہلو بہ پہلو لنگر انداز ہیں اور ان کی بتیاں ہچکولوں سے ہل رہی ہیں؛ بیچ کی دو گودیوں کے درمیان ایک مال بردار جہاز کھڑا ہے جس کی بتیاں روشن ہیں۔ میرے لیے دریا کے بیچ میں ادھر ادھر بہتی ہوئی بتیوں کو ایک دوسرے سے جدا پہچاننا ممکن تھا۔ میں گودیوں کے زیادہ قریب نہیں گیا، بس ان سے اِدھر دریا کے تاریک اور خالی پھیلاؤ کے سامنے کھڑا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی جب ایک آدمی نے، جو شاید بندرگاہ پر چوکیدار یا قلی کے طور پر کام کرتا ہوگا، میرے پاس آکر وقت پوچھا۔ گیارہ۔

ہوٹل کی طرف واپسی کے لیے میں دوسرا راستہ اختیار کرکے بند دکانوں کے پاس سے ہوکر گذرا۔ میں انتہائی چوکنا تھا۔ ہوٹل کے داخلے کے برآمدے میں چمکدار روشنی ہورہی ہوگی۔ بیچ میں تیل کا ہنڈا رکھا ہوگا، اور ایک کونے میں سامان، سوٹ کیس، پانی ٹھنڈا کرنے کی مشین اور ایک الماری رکھی ہوگی۔ بنچ پر ایک آدمی بیٹھا اونگھ رہا ہوگا، اور اپنی انگلیوں میں دبے سگریٹ کو بھول چکا ہوگا۔ ہوگا یہ کہ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھوں گا، دروازہ کھولوں گا، اور اپنے بستر پر اسے سوتا ہوا پاؤں گا؛ اس کا منھ دیوار کی طرف ہوگا اور اس کا سرخ عمامہ کپڑوں کی کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہوگا۔

غسان کنفانی

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

بندے کا قلعہ

اگر وہ بری طرح پھٹے حالوں نہ ہوتا تو کوئی بھی اس کے بارے میں یہی کہتا کہ وہ شاعر ہوگا۔ اس نے اپنی ٹین کے ڈبوں اور لکڑی سے بنی کٹیا کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ حقیقتاً شاندار تھی۔ چوکھٹ کے پاس ہی سمندر کٹیلی چٹانوں کے قدموں میں اپنی بیٹھی ہوئی یکساں آواز کے ساتھ ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا۔ اس کا چہرہ سوکھا مرجھایا ہوا اور داڑھی سفید تھی جس میں یہاں وہاں کوئی کوئی سیاہ بال بھی جھلکتا تھا۔ آنکھیں اس کی گھنی گھنی پلکوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور اس کے رخسار کی ہڈیاں دو چٹانوں کے مانندیوں ابھری ہوئی تھیں جیسے اس بڑے ابھار کو جو کہ اس کی ناک تھی، دونوں جانب سے سہارا دے رہی ہوں۔

ہم اُس طرف کس لیے گئے تھے؟ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ اپنی چھوٹی سی کار میں ہم ایک بے ہنگم دلدلی سی سیدھی سڑک پر پڑ لیے تھے۔ ہم کو چلتے چلتے تین گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے جب ثابت نے کھڑکی میں سے اشارہ کرتے ہوئے ایک فلک شگاف نعرہ مارا:

''وہ رہا بندے کا قلعہ!''

بندے کا یہ قلعہ ایک لحیم شحیم چٹان تھی جس کے نچلے حصے کو سمندر کی لہروں نے کچھ اس طرح چاٹ ڈالا تھا کہ اب وہ کسی ایسے دیوقامت پرندے کے پروں کی طرح نظر آتی تھی جس نے اپنے شہپروں کو سمندر کے شوروغل پر تان رکھا ہو۔

''لوگ اس کو بندے کا قلعہ کیوں کہتے ہیں؟''

''پتا نہیں۔ شاید اس کے پیچھے کوئی تاریخی واقعہ ہو جس سے یہ نام پڑا۔ وہ کٹیا دیکھ رہے ہو؟''

ایک بار پھر ثابت نے اشارہ کیا۔ اس بار یہ اشارہ اس کٹیا کی طرف تھا جو اس دیوقامت چٹان کے

سائے میں واقع تھی۔ اس نے انجن بند کر دیا اور ہم سب کار سے اتر پڑے۔

''لوگ کہتے ہیں ایک نیم پاگل بڈھا اس میں رہتا ہے۔''

''اکیلا کیا کرتا ہوگا اس خرابے میں؟''

''وہی کچھ جو کوئی نیم پاگل بڈھا کرے۔''

دور سے ہم نے بڈھے کو اپنی چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ وہ اپنا سر دونوں ہتھیلیوں کی رکاب میں رکھے سمندر کو تک رہا تھا۔

''کیا خیال ہے، بڈھے کی کوئی خاص داستان ہوگی؟ تم اسے نیم پاگل کہنے پر کیوں مصر ہو؟''

''پتا نہیں۔ میں نے یہی سنا ہے۔''

ثابت نے اپنی پسندیدہ جگہ پہنچ کر ریت کو ہموار کیا، پانی کی بوتلیں پٹخیں، تھیلے میں سے کھانے پینے کی چیزیں نکالیں اور بیٹھ گیا۔

''کہتے ہیں اس کے چار بیٹے ہیں جن کی قسمت نے یاوری کی اور اب وہ ضلعے کے امیر ترین لوگوں میں سے ہیں۔''

''پھر؟''

''بیٹوں میں اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ کون باپ کے لیے بسیرا مہیا کرے۔ ہر ایک کی بیوی اپنی الگ رائے رکھتی تھی اور اپنی چلانا چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے میاں نکل بھاگے اور یہاں آن بسے۔''

''یہ تو عام سا واقعہ ہے۔ اس بات سے تو بڈھے کو نیم پاگل نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

ثابت نے میری طرف ہونقوں کی طرح دیکھا۔ پھر اپنی اکٹھا کی ہوئی تھوڑی سی چھپٹیوں کو آگ دکھائی، جگ میں پانی بھرا اور اسے آگ پر رکھ دیا۔

''کہانی میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ آیا راہ فرار اس کے نیم پاگل دماغ نے اختیار کی یا اس کے ہوش مند ذہن نے۔''

''وہ چند قدم دور ہی تو ہے۔ کیوں نہ چل کر اس سے پوچھ لیں؟''

ثابت نے آگ پر پھونکیں ماریں، پھر دو زانو ہو کر سیدھا ہوا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

''اس کو دیکھ کر جو خیال میرے دل میں آتا ہے میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

''کیسا خیال؟''

''یہی کہ آدمی ستر برس تک اپنی زندگی سیدھے سبھاؤ گزار دے، ایک ایک دن بلکہ ایک ایک گھنٹا جی جان سے جتا رہے، اپنی جان کھپا دے۔ پورے ستر برس، ہر رات بہتر کل کی امید میں سونے کے لیے وہ

اس طویل مدت کا ہر دن اپنے گاڑھے پسینے سے روزی کمانے میں بتادے، اور کس لیے؟ تا کہ انجام کار وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کسی دھتکارے ہوئے کتے کی طرح اکیلے یوں بیٹھ کر کاٹے۔ ذرا دیکھو تو، بالکل اس قطبی جانور کی طرح دکھتا ہے جس کا سارا فر ادھڑ چکا ہو۔ کیا تم مان سکتے ہو کہ کوئی بندہ یہ سب حاصل کرنے کے لیے ستر برس گذارے؟ اپنے حلق سے تو اترتا نہیں۔''

ایک بار پھر اس نے ہمیں گھور کر دیکھا اور اپنی ہتھیلیوں پر نظر جما کر اپنی پر جوش خطابت جاری رکھی۔

''ذرا غور کرو، ستر بے مصرف بے معنی سال! ذرا سوچو تو، ستر برس تک اسی ایک ڈگر پر چلے جانا، ایک ہی سمت، ایک ہی حد، وہی ایک سا افق، وہی یکساں باتیں — نا قابل برداشت!''

''بے شک بوڑھے کو تمھارے نقطۂ نظر سے اختلاف ہوگا۔ ممکن ہے وہ اس انجام کو اپنی زندگی کے اصل انجام سے مختلف سمجھتا ہو؛ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسی انجام کا خواہاں ہو۔ کیوں نہ اسی سے پوچھ لیں؟''

ہم اس کے پاس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں وہ بیٹھا تھا تو اس نے نظریں اٹھائیں، سرد مہری سے ہمارے سلام کا جواب دیا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ اَدھ کھلے دروازے میں سے ہم اس کی کٹیا میں دیکھ سکتے تھے۔ ایک کونے میں ایک پھٹا چیتھڑا بچھونا پڑا تھا جب کہ اس کے سامنے والا کونا ایک مربع چٹان تھی جس پر بند سیپیوں کی ڈھیری لگی تھی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی جسے بوڑھے کی نحیف آواز نے توڑا۔

''سیپیاں خریدو گے؟ میں سیپیاں بیچتا ہوں۔''

چوں کہ ہمارے ذہن میں اس سوال کا جواب تیار نہیں تھا، اس لیے ثابت نے سوال کر دیا، ''کیا آپ انھیں خود اکٹھا کرتے ہیں؟''

''میں پانی کے اترنے کا انتظار کرتا ہوں تا کہ دور تک انھیں تلاش کر سکوں۔ میں ان کو جمع کر لیتا ہوں اور ان لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں جنھیں ان کے اندر موتیوں کی تلاش ہوتی ہے۔''

ہم نے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ثابت نے وہ سوال کیا جو ہمارے ذہنوں میں اٹکا ہوا تھا۔

''آپ خود ان سیپیوں میں موتی کیوں تلاش نہیں کرتے؟''

''میں؟''

اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے پہلی مرتبہ اسے اپنے وجود کا احساس ہوا ہو، یا جیسے یہ خیال اس کو پہلے کبھی نہ آیا ہو۔ پھر اس نے اپنے سر کو ہلایا، مگر خاموش رہا۔

''ایک ڈھیری کتنے کی دیتے ہیں؟''

''سستی۔ دو ایک نان کے عوض۔''

''چھوٹی چھوٹی سیپیاں ہیں۔ ان میں موتی تو کیا ہوں گے!''

بوڑھے نے ہماری طرف اپنی گھنی گھنی پلکوں میں دھنسی بجھی بجھی آنکھوں سے دیکھا۔

''سیپیوں کے بارے میں تم کیا جانو!'' اس خوف سے وہ فوراً ہی خاموش ہوگیا کہ کہیں بات بڑھانے سے سودا ہی موقوف نہ ہو جائے۔

''آپ بتا سکتے ہیں؟''

''نہ! کوئی نہیں بتا سکتا۔'' اور اپنے سامنے بڑی ایک سیپی سے کھیلنے لگا جیسے ہماری موجودگی سے بے خبر ہو۔

''ٹھیک ہے، ہم ایک ڈھیری لے لیتے ہیں۔''

بوڑھے نے مڑ کر مربع چٹان پر رکھی ڈھیری کی طرف اشارہ کیا۔

''دو نان لے آؤ'' اس کی آواز میں خوشی لہرا رہی تھی، ''اور وہ ڈھیری تمھاری!''

جب وہ ڈھیری لے کر ہم اپنے مقام پر آئے تو ہماری بحث پھر چل نکلی۔

''میرے خیال میں وہ آنکھیں کسی پاگل ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اگر نہیں تو وہ موتی مل جانے کی امید میں ان سیپیوں کو کھول کر کیوں نہیں دیکھتا؟''

''شاید کوشش کر کر کے وہ اُوبھ گیا ہو اور اب تماشا کرنا اور تھوڑا بہت کمانا چاہتا ہو۔''

تمام سیپیوں کو کھول کھول کر دیکھنے میں آدھا دن نکل گیا۔ ہم نے چاروں طرف چپچپاتے ماڈے اور کھلی سیپیوں کا ڈھیر لگا دیا اور پھر سب اپنے جنون پر قہقہے لگانے لگے۔

سہ پہر کو ثابت نے رائے دی کہ میں بوڑھے کے پاس گرم گرم چائے کی پیالی اس امید پر لے جاؤں کہ شاید اس کے دل کو کچھ خوشی مل جائے۔

میں جب اس کے پاس چائے لے جانے لگا تو مجھے ڈر سا لگا۔ لیکن اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بڑے شوق سے چائے پینے لگا۔

''سیپیوں میں کچھ ملا؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔ آپ نے ہمیں بے وقوف بنا دیا۔''

اس نے دکھ بھرے انداز میں اپنے سر کو ہلایا اور ایک چسکی لی۔

''صرف دو نان بھر!'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور اپنے سر کو ایک مرتبہ پھر ہلا دیا۔ اچانک اس نے میری جانب نظریں گھمائیں اور پُرجوش ہو کر سمجھانے لگا:

''اگر یہ سیپیاں تمھاری زندگی ہوں— میرا مطلب ہے ہر سیپی تمھاری زندگی کا ایک سال ہو اور باری باری تم ہر ایک کو کھولو اور ان کو خالی پاؤ، تو کیا تم اتنے ہی غم زدہ ہو گے جتنے دو نان گنوا کر؟''

وہ سارے وجود سے کپکپایا اور اس لمحے مجھے اعتبار آ گیا کہ میں کسی ایسے آدمی کے سامنے ہوں جو یقیناً پاگل ہے۔ اس کی گھنی پلکوں میں چھپی آنکھوں میں اس وقت بہت تیز اور غیر فطری چمک تھی جبکہ اس کے پھٹے پرانے لباس کی گرد سہ پہر کی دھوپ میں جگمگا رہی تھی۔ مجھے کچھ کہنے کو الفاظ نہ مل سکے۔ میں نے جب اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا تو اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ اس کا نحیف ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا مگر کپکپا رہا تھا۔ میں نے اسے کہتے سنا:

''ڈرو نہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں کچھ بتاتا ہوں۔ میری زندگی کے خوشگوار ترین لمحے یہی ہوتے ہیں جب میں اس قسم کی مایوسی کا تماشا دیکھتا ہوں۔''

کچھ پُرسکون ہو کر میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس دوران وہ افق کو یوں دیکھتا رہا جیسے میری موجودگی سے بے نیاز ہو، جیسے ابھی ابھی اس نے مجھ سے بیٹھنے کو نہ کہا ہو۔ وہ مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا:

''میں جانتا تھا تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ سیپیاں ابھی چھوٹی ہیں اور ان میں موتی کا دانہ نہیں بن سکتا۔ مگر پھر بھی میں جاننا چاہتا تھا۔''

وہ خاموش ہو گیا اور سمندر کی سمت دیکھنے لگا۔ پھر منہ ہی منہ میں جیسے خود سے ہم کلام ہوا:

''آج رات پانی جلدی اترے گا۔ مجھے اب چلنا چاہیے تاکہ سیپیاں اکٹھی کر سکوں۔ کل تم جیسے دوسرے لوگ آئیں گے۔''

حیرت میں ڈوب کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بندے کا قلعہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں تنا کھڑا تھا۔ میرے ساتھی سیپیوں کے خولوں کے ڈھیر کے پاس چائے پی رہے تھے کہ بوڑھا اترتے پانی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا اور وقفے وقفے سے جھک جھک کر سمندر کی چھوڑی ہوئی سیپیاں اٹھانے لگا۔

عربی کہانیاں: ایک مختصر تعارف

عربی ادب کا جغرافیائی دائرہ بہت وسیع ہے۔ عربی زبان ایشیا اور افریقہ کے متعدد ملکوں میں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے، اگرچہ عربی ثقافت اور ادب کے میدانوں میں مصر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عربی کے جدید مختصر فکشن کے اس انتخاب میں مصر کے علاوہ لبنان، شام، مراکش، عراق، لیبیا، یمن، سوڈان اور فلسطین کے لکھنے والوں کی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ جغرافیائی اور تہذیبی عوامل کی پیدا کردہ رنگارنگی کے علاوہ عربی ادب، اور خصوصاً عربی فکشن، پر مختلف مقامی اور عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات موجود ہیں جن میں سے بعض کی جھلک آپ کو اس انتخاب میں شامل کہانیوں میں نظر آ سکے گی۔ اردو کی طرح عربی میں بھی جدید فکشن کا ظہور مغرب کے ساتھ تہذیبی تفاعل کے نتیجے میں ہوا، اور فکشن کی مغربی اصناف نے کلاسیکی بیانیے کے اسالیب سے تقویت پا کر بڑی تعداد میں قابلِ قدر تحریروں کو جنم دیا۔

اس انتخاب کے بارے میں چند بنیادی باتوں کی وضاحت کرنا مناسب ہوگا۔ عربی کے جدید ادب سے اردو لکھنے پڑھنے والوں کا ویسا براہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکا جیسا کسی زمانے میں عربی کے کلاسیکی ادب کے ساتھ تھا۔ اب عربی تحریروں تک رسائی کے لیے عموماً انگریزی ترجموں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ اس انتخاب میں شامل کہانیوں کے ترجمے بھی، ایک کہانی کو چھوڑ کر، انگریزی ترجموں سے کیے گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں عربی فکشن کے بہت سے عمدہ انتخاب موجود ہیں، جن میں ڈینس جانسن ڈیویز کے کیے ہوئے ترجمے اور مرتب کیے ہوئے انتخاب ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی ہی چند کتابوں میں سے یہ کہانیاں منتخب کی گئی ہیں۔ اس کوشش کا مقصد اردو میں جدید عربی کہانیوں کا ایک ایسا انتخاب تیار کرنا ہے جسے کسی حد تک نمائندہ کہا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایک جلد پر مشتمل مختصر سے انتخاب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس سلسلے کا پہلا قدم سہ ماہی ''آج'' کے شمارہ ۱۳ (بہار ۱۹۹۳ء) تھا جسے عربی کہانیوں کے انتخاب کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ یہ شمارہ اب دستیاب نہیں ہے۔ موجودہ انتخاب میں ان کہانیوں کے علاوہ جو اس خصوصی شمارے میں شامل تھیں، چند اور کہانیاں بھی شامل کی گئی ہیں جو ''آج'' کے مختلف دوسرے شماروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ لیلیٰ بعلبکی

کی کہانی، جسے محمد عمر میمن نے براہ راست عربی سے، لیکن انگریزی ترجمے کو بھی پیش نظر رکھ کر، ترجمہ کیا تھا، ان کے منتخب ترجموں کے مجموعے ''گم شدہ خطوط'' میں شامل تھی اور ان کے شکریے کے ساتھ اس انتخاب میں شامل کی گئی ہے۔

اردو کے پڑھنے والوں کو عربی کہانیوں سے متعارف کرانے کی یہ کوشش جاری ہے اور اس سلسلے کی اگلی کڑی سہ ماہی ''آج'' کا ایک اور خصوصی شمارہ ہوگا جس میں عربی کہانیوں کے مزید ترجمے پیش کیے جائیں گے۔

لکھنے والوں کا تعارف

یوسف ادریس (Yusuf Idris)

مصر کے ممتاز اور معروف ادیب یوسف ادریس ۱۹۲۷ء میں اسمٰعیلیہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوے۔صوبائی دارالحکومت میں اپنی ثانوی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ۱۹۴۵ء میں طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے قاہرہ چلے گئے اور وہیں اس دہائی کے آخری برسوں میں ان کی کہانیاں ''المصری'' نامی اخبار میں شائع ہونی شروع ہوئیں۔وفد پارٹی کے حامی اس اخبار پر بعد میں جمال عبدالناصر کے حکم سے پابندی لگا دی گئی۔1951ء میں طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یوسف ادریس نے چند سال پریکٹس بھی کی، مگر ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ طب کو خیرباد کہہ کر ہمہ وقتی ادیب اور صحافی کا پیشہ اختیار کرلیا۔یوسف ادریس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد بہت سے مجموعے، ڈرامے اور ناول شائع ہوے۔انھوں نے ۱۹۹۲ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

توفیق الحکیم (Tawfik al-Hakim)

توفیق الحکیم ۱۹۰۲ء میں اسکندریہ، مصر، میں پیدا ہوے۔انھوں نے قاہرہ اور پیرس کی یونیورسٹیوں سے قانون کی تعلیم حاصل کی، اور پھر کچھ عرصے سرکاری ملازمت کرنے کے بعد خود کو مکمل طور پر تحریر کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی شناخت بنیادی طور پر ان کے ڈراموں سے وابستہ ہے اور اس میدان میں وہ عربی ادب میں ممتاز ترین مقام رکھتے ہیں۔لیکن انھوں نے کہانیاں اور ناول بھی لکھے ہیں۔

عبدالسلام العُجیلی (Abdel Salam al-Ujaili)

عبدالسلام العجیلی ۱۹۱۸ء میں شام کے مقام رقہ میں پیدا ہوے اور وہیں طبیب کے طور پر کام کرتے ہیں۔لکھنے کے علاوہ انھوں نے سیاست میں بھی حصہ لیا ہے اور کئی وزارتی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں، جن میں وزیر ثقافت کا عہدہ بھی شامل ہے۔

(Zakaria Tamer) زکریا تامر

زکریا تامر ۱۹۲۹ء میں شام کے دارالحکومت دمشق میں پیدا ہوئے۔ ان کی رسمی تعلیم بہت محدود ہے لیکن انھوں نے اپنی کہانیوں کے چار مجموعوں سے عربی ادبی دنیا میں ایک نمایاں فکشن نگار کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ان کی کہانیوں میں، جن کا اسلوب منفرد اور شفاف ہے، سیاسی خیالات کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ بچوں کے بھی بہت مقبول ادیب ہیں۔ دمشق میں بہت سے سرکاری محکموں میں ملازمت کرنے کے بعد وہ لندن چلے گئے اور وہاں کے ایک عربی اخبار میں کام کرنے لگے۔ ۱۹۸۳ء میں وہ بچوں کی کتابوں کی اشاعت کے مشیر کی حیثیت سے کویت منتقل ہوگئے۔

(Mohammed Barrada) محمد برّادا

محمد برّادا ۱۹۳۸ء میں رباط، مراکش، میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے عربی کے مضمون میں ڈگری حاصل کی اور پیرس یونیورسٹی سے جدید ادبی تنقید کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کیا۔ ان کی بہت سی تنقیدی تحریریں شائع ہوئی ہیں اور انھوں نے فرانسیسی سے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۷۹ء میں بیروت سے شائع ہوا تھا۔ آج کل وہ رباط یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں اور مراکشی ادیبوں کی انجمن کے صدر بھی ہیں۔

(Maifa' Abdul Rahman) میفع عبدالرحمٰن

میفع عبدالرحمٰن جنوبی یمن کے رہنے والے ہیں اور اپنی کہانیوں کے لیے معروف ہیں۔ وہ ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے، زراعت کے شعبے میں تعلیم پائی اور اس کے بعد ماسکو کے گورکی انسٹیٹیوٹ سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ ان کی کہانیاں سماجی اور سیاسی موضوعات کے بارے میں ہوتی ہیں اور ان میں ایک مخصوص حسِ مزاح کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

(Hanan Al Sheikh) حنان الشیخ

حنان شیخ جنوبی لبنان سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن ان کی ابتدائی زندگی زیادہ تر بیروت میں گذری۔ انھوں نے امریکن کالج فار گرلز، قاہرہ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں چوبیس سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول لکھا۔ بیروت واپس

آکر وہ عورتوں کے ایک رسالے اور ایک بڑے روزنامے کے ادبی صفحے سے وابستہ رہیں۔ شادی کے بعد حنان اپنے شوہر کے ساتھ خلیج کے علاقے میں چلی گئیں اور وہاں کئی برس رہنے کے دوران انھوں نے دوسرا ناول لکھا۔ تیسرا ناول ''زہرا کی کہانی'' بیشتر لندن میں لکھا گیا جہاں اب ان کا گھر ہے۔ ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

علیفہ رفعت (Alifa Rifaat)

علیفہ رفعت قاہرہ میں ۱۹۳۰ء کی دہائی میں پیدا ہوئیں اور اپنے بچوں کے ساتھ وہیں رہتی ہیں۔ ان کے مرحوم شوہر پولیس سے وابستہ تھے اور ان کی شادی شدہ زندگی مصر کے مختلف دیہات میں گذری۔ ان کی کہانیوں کے موضوع زیادہ تر اسی زمانے کے مشاہدوں پر مبنی ہیں۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

بہاء طاہر (Bahaa Taher)

بہا طاہر ۱۹۳۵ء میں قاہرہ کے مضافات میں جیزہ کے مقام پر پیدا ہوے۔ ان کے خاندان کا تعلق بالائی مصر (مصر العلیا) کے مقام قرناق سے تھا۔ قاہرہ یونیورسٹی سے تاریخ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ ریڈیو قاہرہ میں ثقافتی پروگرام کے رکن ہو گئے اور انھوں نے یونانی ڈراما نگاروں سے لے کر سیموئل بیکٹ تک کے بہت سے کھیل نشر کیے۔ بہا کچھ عرصے تک قاہرہ کے ممتاز ادبی جریدوں کے لیے تھیئٹر کے ناقد کے طور پر بھی لکھتے رہے ہیں، لیکن سب سے بڑھ کر انھیں ان کی مختصر کہانیوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے، گو کہ ان کا صرف ایک مجموعہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۸۱ء سے وہ جنیوا میں اقوام متحدہ کے دفتر میں عربی شعبے کے مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

یوسف شارونی (Yusuf Sharouni)

یوسف الشارونی ۱۹۲۴ء میں مصر کے ڈیلٹا میں واقع ایک گاؤں میں پیدا ہوے۔ انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور پھر کچھ عرصے کے لیے سودان میں تدریس کا کام کیا۔ آج کل قاہرہ میں فنون، ادب اور علوم معاشرتی کی کاؤنسل میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان کا تخلیقی کام زیادہ تر مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے اور انھیں اس صنف میں عربی ادبی دنیا میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ کہانیوں کے علاوہ انھوں نے تنقید بھی لکھی ہے۔

محمود دِیاب (Mahmoud Diab)

محمود دیاب ١٩٣٦ء میں اسمٰعیلیہ، مصر، میں پیدا ہوے اور قانون کے مضمون میں تعلیم حاصل کی۔ انھیں بنیادی طور پر ان کے ڈراموں کی وجہ سے شہرت حاصل ہے، لیکن انھوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

ابراهیم الکونی (Ibrahim al-Kouni)

ابراہیم الکونی ١٩٤٨ء میں لیبیا کے مقام قدامس میں پیدا ہوے۔ وہ ماسکو کے گورکی انسٹیٹیوٹ سے فارغ التحصیل ہوے اور اب وارسا میں لیبیا کے پیپلز بیورو کے سربراہ ہیں۔ ان کی کہانیوں اور مضامین کا ایک ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

نبیل جورجی (Nabil Gorgy)

نبیل جورجی ١٩٤٤ء میں قاہرہ میں پیدا ہوے، قاہرہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی اور بعد میں نیویارک میں انجینئر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اب وہ واپس آ کر قاہرہ میں رہ رہے ہیں اور لکھنے کے علاوہ اپنی آرٹ گیلری چلانے میں مشغول ہیں۔ قدیم مصری موضوعات، اساطیر اور تصوف کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہانیوں کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں۔

لیلیٰ بعلبکی (Laila Baalbakki)

لیلیٰ بعلبکی کی ولادت ١٩٣٦ء میں لبنان کے ایک تجارت پیشہ شیعہ گھرانے میں ہوئی۔ ابھی کم سن ہی تھیں کہ عام رسم و رواج کے مطابق والدین نے کسی نادیدہ مہربان کے ساتھ شادی طے کر دی، لیکن رسم و رواج کے عین خلاف لیلیٰ نے صریح طور پر اس انتخاب کو رد کر دیا۔ لیلیٰ نے بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پائی، گو عارضی طور پر انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا اور اس دوران، ایک صحافتی ایجنسی میں سیکرٹری کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ ١٩٦٠ء میں چند ماہ کے لیے لیلیٰ کا پیرس میں قیام رہا، آخرالامر انھوں نے اپنی پسند سے لبنان کے ایک عیسائی کے ساتھ شادی کر لی۔ تصنیفات: دو ناول ہیں، جن میں پہلا ''انا احیاء'' (میں زندہ ہوں) کافی مشہور ہوا۔ یہ انھوں نے کم عمری میں لکھا تھا لیکن اشاعت کے مراحل سے ١٩٥٨ء میں گذرا۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ ١٩٦٠ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک افسانوی انتخاب بھی ہے، جس کا عنوان ''سفینہ

الحنان الی القمر'' ہے، یہ سن ۱۹٦۲ء میں شائع ہوا۔ لیلیٰ بعلبکی کی تحریر بالعموم اس ٹکراؤ اور الجھن کو پیش کرتی ہے جس کا کسی ایسے معاشرے میں رونما ہونا ناگزیر ہے جو روایت شکنی سے ہوتا ہوا جدید زندگی میں اپنی کایا پلٹ کے دردزہ میں مبتلا ہو۔ چنانچہ لیلیٰ بعلبکی کی تحریریں ''آزادی نسواں''، ''مغربیت''، ''فرد کی آزادی''، اور ''روایت پرست معاشرے کے خلاف احتجاج'' جیسے معاصر مسائل پر ارتکاز کرتی ہیں۔

ادورد الخراط (Edward el-Kharrat)

ادورد الخراط ۱۹۲٦ء میں اسکندریہ، مصر، میں پیدا ہوئے اور اسکندریہ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ مختلف قسم کی ملازمتیں کرنے کے بعد وہ ۱۹۴۹ء میں افروایشیائی عوام کے اتحاد کی انجمن اور افروایشیائی ادیبوں کی انجمن سے وابستہ ہوگئے اور اس کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۴۹ء ہی میں انھوں نے اپنی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''اونچی دیواریں'' اپنے خرچ پر شائع کیا۔ اس کتاب کی فروخت تو بہت زیادہ نہ ہوئی، لیکن اس نے مصری مختصر فکشن پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کا زبان سے شغف اور پیچ دار اسلوب، جو پروست کی یاد دلاتا ہے، مترجم کے لیے بے حد مشکل کا باعث ہوتا ہے۔ خود انھوں نے بھی انگریزی اور فرانسیسی سے بہت سے ترجمے کیے ہیں۔ ان کے کئی مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔

طیب صالح (Teyeb Salih)

طیب صالح (جو اپنا نام الطیب صالح لکھنا پسند کرتے ہیں) ۱۹۲۹ء میں شمالی سوڈان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جو ان کی اکثر تحریروں کا محل وقوع ہے۔ خرطوم یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے اور وہاں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی زیادہ تر بی بی سی کی عربی سروس سے وابستہ رہ کر گذری۔ بعد میں انھوں نے قطر میں محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اب وہ پیرس میں یونیسکو سے متعلق ہیں۔ وہ عربی فکشن نگاروں میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں اور ان کی بہت سی تحریروں کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے جن میں ان کا ناول *Season of Migration to the North* بھی شامل ہے۔

محمد خضیّر (Mohammed Khudayyir)

محمد خضیر ۱۹۴۲ء میں جنوبی عراق میں بصرہ کے قریب پیدا ہوے اور وہیں رہتے اور ایک اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ اگرچہ ۱۹۸۳ء تک ان کی کہانیوں کے صرف دو مجموعے شائع ہوے تھے، لیکن ان کو عربی فکشن کے جدید لکھنے والوں میں نہایت اوریجنل سمجھا جاتا ہے۔

غسان کنفانی (Ghassan Kanafani)

غسان کنفانی ۱۹۳۶ء میں فلسطین کے مقام عکرہ میں پیدا ہوے اور ۱۹۷۲ء میں بیروت میں اپنی کار میں رکھے گئے بم کے دھماکے میں ہلاک ہوگئے۔ آزادیِ فلسطین کے پاپولر فرنٹ (PFLP) کے ترجمان کے طور پر بیروت منتقل ہونے سے پہلے انھوں نے دمشق اور کویت میں صحافی اور مدرس کے طور پر کام کیا۔ موجودہ انتخاب میں شامل ان کی کہانی کا محلِ وقوع کویت ہی ہے۔ سیاست سے اپنی گہری وابستگی کے باوجود انھوں نے فلسطین کے ادیبوں میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ان کے پانچ ناول اور کہانیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوے۔

نجیب محفوظ

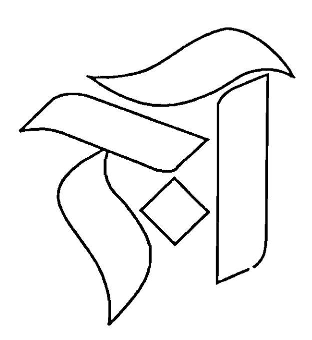
کا معروف ناول

شادیانے

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

(زیرِ طبع)

عالمی ادب کا سہ ماہی جریدہ



ترتیب: اجمل کمال